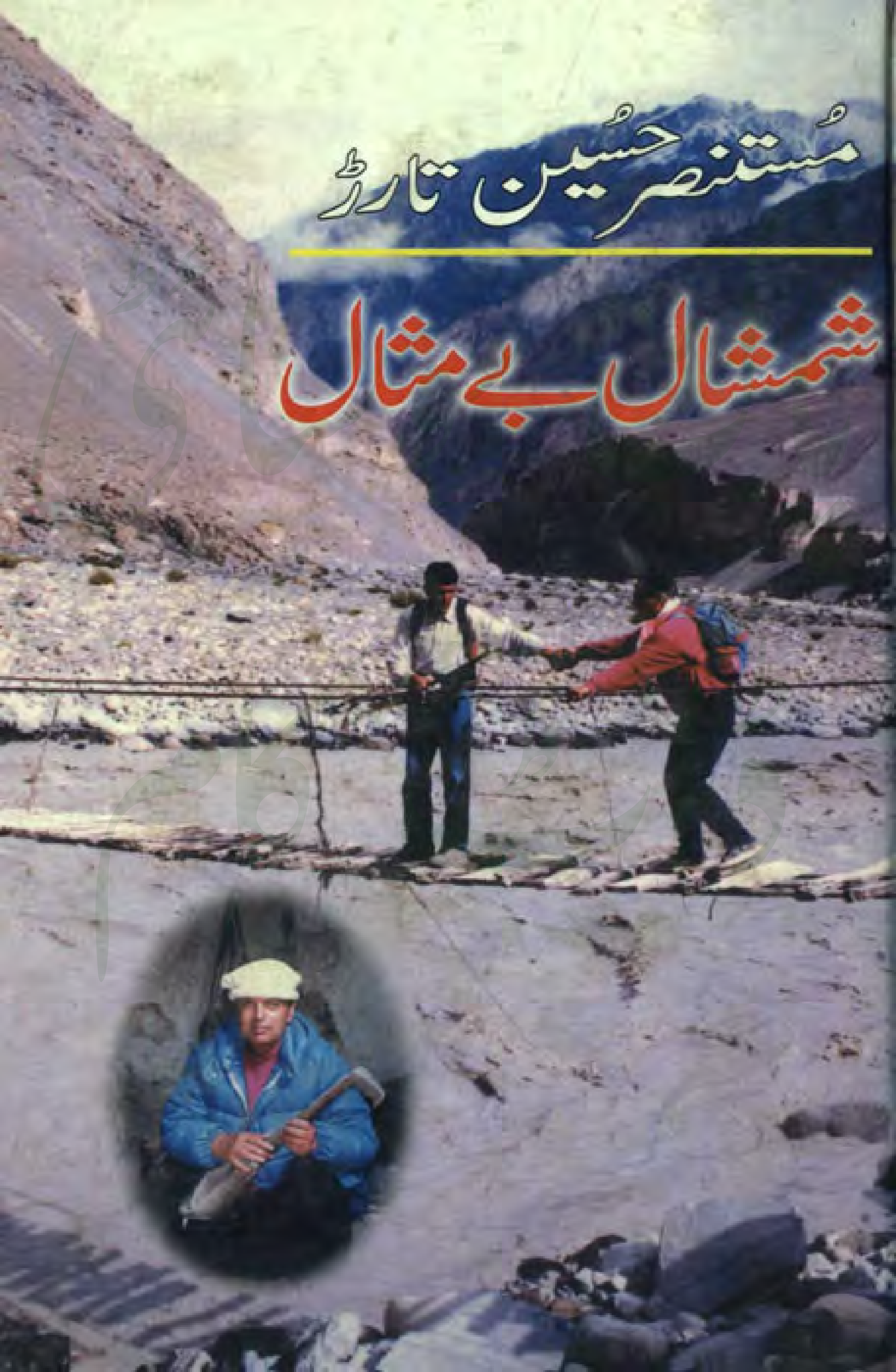

مُستنصر حسین تارڑ
شمشال بے مثال

"صاحب آپ دوبارہ آؤ تو شمشال ضرور جانا۔ یہیں پھسو سے راستہ جاتا ہے۔ صرف تین دن کا ٹریک ہے۔ ہم آپ کو لے چلے گا۔"

"آپ گئے ہو؟" سلجوق نے آنکھیں جھپکیں، وہ تھکا ہوا تھا۔

"کئی مرتبہ صاحب۔ خطرناک راستہ ہے میں لے چلوں گا، دیکھئے" وہ کونے میں جاکر ایک صندوق پر جھک گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں "نیشنل جیوگرافک" کا ایک شمارہ تھا یہی شمارہ لاہور میں میرے بک شیلف میں بھی رکھا ہوا تھا اور اس میں "ہائی روڈ ٹو ہنزہ" کے نام سے مہماتی نوکی داستان اور تصویریں تھیں۔ اس نے رسالہ کھولا "یہ دیکھئے صاحب یہ فرانسیسی صاحب ان کی بیگم اور بچہ آئے تھے۔ ادھر پھسو میں اور میں انہیں گائیڈ کے طور پر شمشال کی وادی میں لے کر گیا تھا۔ یہ دیکھئے بیگم صاحبہ کو میں دریائے شمشال پر بنے ہوئے تختوں کے راستے پر سے گزرنے میں مدد دے رہا ہوں۔ آپ نے پہچانا؟ اور یہ ادھر میرا تذکرہ بھی ہے مضمون میں......"

ہاں یہ ہُنر بیگ ہی تھا۔ تختوں کے خطرناک پُل پر کسی چینی بازی گر کی طرح ایک سفید فام خاتون کو سہارا دیتا ہوا۔ عجیب بات ہے، پچھلے برس میں نے اس شمارے میں شائع شدہ انہی پُر خطر راستوں اور دریاؤں کی تصاویر کو۔ اور خاص طور پر اس تصویر کو اُس قیدی کی طرح دیکھا تھا جو اپنی کال کوٹھڑی میں بند اونچے روشندان میں پھدکتی چڑیا کو دیکھ کر آزادی کا سانس محسوس کرتا ہے۔ اُس وقت ہُنر بیگ میرے گھر میں ایک تصویر تھا اور اِس وقت میں اُس تصویر کے گھر میں تھا۔

"آپ آنا صاحب میں آپ کو شمشال لے کر چلوں گا۔"

"اتنا خوبصورت نام میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ہونا تو چاہیے۔ شکریہ ہُنر بیگ ہم اس شام کو یاد رکھیں گے۔"

("ہنزہ داستان" 84ء)

-1	درّہ شمشال کا گلاب شہر	10
-2	گلگت دربار	21
-3	زیرو پوائنٹ اور گھاس میں گرے زرد سورج	39
-4	آخری زیرو پوائنٹ...... ہنزہ کا قدیم ترین کنواں	46
-5	ہنزہ دربار	52
-6	کارگل کہانی اور عشق آتش	56
-7	مے کدہ راکاپوشی اور عرق شہتوت کی بڑھیا	63
-8	گل مت اور ان پہاڑوں کے پیچھے شمشال ہے	69
-9	پسّو میرا پسندیدہ...... حقیقت کے پاس!	73
-10	پسّو میں پولیس...... پھر مزید پولیس	78
-11	روڈ کیمپ...... ڈوٹ!	86
-12	شمشال کا سفر آسان ہو گیا ہے......	93
-13	جہاں شیطان پتھر گراتا ہے......	100
-14	شمشال کا پہلا پُل اور ہیلو چاچا تارڑ...... ریلیکس!	104
-15	زیارت...... بلند عرش پر شاہ شمس اپنے پرچم لہراتا تھا	110
-16	ایک رنگین رام چکور میرے قدموں میں	122
-17	شکر جوئی...... میٹھے پانی کا تالاب	125
-18	مکر چاندنی میں...... سرخ بھیڑیئے 'سنو ٹائیگر اور کاسون......	130
-19	رچھ دشت اور زرد فصلیں......	140
-20	الف لیلوی پُل...... عبدل محمد پُل	146

21- گرم چشمہ کے آبی چراغ...... 148

22- یاک کی دُم پکڑ کر چڑھنے کا تجربہ...... 158

23- کیا یہی وادیٔ شمشال ہے......رجب شاہ کا گھر 161

24- ایک بے رُوح سفر......مایوسی اور اداسی 168

25- شمشال کا زرد جھماکا......سرسوں بھری وادی اور چینی شہزادیاں 174

26- میں دنیا کی تنہاترین جگہ پہنچ گیا تھا 178

27- مجنون گیسٹ ہاؤس اور ایک شبِ شمشال 181

28- خوشی کی تلاش ہی دراصل خوشی ہے 190

29- صبحِ شمشال میں......لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری...... 195

30- شمشال میں سمندری بگلا کہاں سے آگیا...... 199

31- شمشال میں مرگ 203

32- "بلبل کی صدا"......میں اپنے گاؤں کو لوٹ رہی ہوں 207

33- تمام جانور پریوں کی ملکیت ہوتے ہیں 211

34- میں شمشال میں ہوتا تو گداگر ہوتا 213

35- شمشال کا قدیم ترین گھر......رباب کا ایک تار 220

36- پامیری ہیرو یاک اور شمشال پاس کو جانے والی للّین روڈ 228

37- شمشال کا رانگلا کھیس مکمل ہوتا ہے......شبِ آخر! 233

"درّہ شمشال کا گلاب شہر"

"شاندار سورج طلوع ہو رہا ہے'
شاندار سورج آہستہ آہستہ ابھر رہا ہے......
ایک شاندار دن کا سورج
پانچ رنگوں میں......
خدا کرے کچھ نہ بدلے
خدا کرے قسمت ساتھ دے
خدا کرے کچھ نہ بدلے
خدا کرے آج ہر طرف شگوفے کھلیں۔"

(ایک قدیم تبتی نظم......"کے ٹو کہانی" میں سے)

میں دنیا کی تنہاترین جگہ سے خوشی لینے جارہا ہوں......
میں وادیٔ شمشال جارہا ہوں۔
میں وی جاناں جھوک رانجھن دی نال میرے کوئی چلّے
میرے لیے رانجھن کی جھوک...... محبوب کی بستی' کوئی تخت ہزارہ' کوئی داناباد' کوئی چناب کنارا یا شہر بھنبھور کیوں نہیں ہوتا......ہمیشہ کہیں' بلند پہاڑوں میں یہ جھوک کیوں ہوتی ہے......کبھی وادیٔ روپل میں......کبھی کنکورڈیا میں اور کبھی جھیل کرومبر یا سنولیک کے کناروں پر ہی یہ محبوب کیوں بسیرا کرتا ہے......

یہ جوگی پہاڑوں سے کیوں نہیں اترتا......یقیناً میرے چرخے کی گھوک میں وہ کوک نہیں ہے ہمیشہ مجھے ہی اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔

میرے محبوب نے...... میرے شمال نے...... کہاں کہاں بسیرے کر رکھے ہیں......

یہ کچھ خیال نہیں کرتا...... کچھ قیاس نہیں کرتا کہ میں عمر میں ڈھلتا جارہا ہوں...... مجھ میں اب سکت کم ہوتی جارہی ہے تو مجھے اتنی آزمائشوں میں نہ ڈالے۔اب تو لوگ ٹھٹھا کرتے ہیں' مزاق کرتے ہیں کہ اس سٹھیائے ہوئے شخص کو دیکھو...... ابھی تک عشق میں ہے بلندیوں کی ہوس میں ہے۔ وہ مجھ پر پتھر نہیں اٹھاتے کہ وہ جانتے ہیں کہ میں خود پتھروں اور سنگریزوں کی دنیا میں جارہا ہوں...... جہاں سنگساری کے خدشے موجود ہیں کہ وادیٔ شمشال کے راستے میں وہ مسافت بھی ہے جس پر ازل سے پتھر برستے ہیں' بلند چٹانوں میں سے دھول اڑاتے پتھر اور کنکر اترتے رہتے ہیں اور مسافروں کو سنگسار کرتے رہتے ہیں...... کہتے ہیں کہ ان چٹانوں کے اوپر شیطان رہتا ہے جو ان پتھروں کو گراتا ہے...... یہ کام شیطان کا ہی ہو گا ورنہ پہاڑوں کے اوپر کتنے پتھر ہو سکتے ہیں جو ازل سے آج تک گرتے ہی رہیں اور پھر بھی ان کا ذخیرہ ختم نہ ہو...... وہ ان چٹانوں پر گھات میں بیٹھا رہتا ہے اور شمشال کے مسافروں پر پتھر لڑھکاتا رہتا ہے...... لوگ یہ جانتے ہیں اور اسی لیے جب میں شمال کے محبوب کی خواہش میں گھر سے نکلتا ہوں تو وہ مجھ پر پتھر نہیں اٹھاتے......

کیسا سنگدل محبوب ہے کہ میری عمر کا لحاظ نہیں کرتا...... عشوہ وادا میں کمی نہیں کرتا...... مسلسل چھب دکھلاتا رہتا ہے۔

اسحاق کریم کی جیپ دریائے خنجراب کے پل کے پار ہو کر درّہ شمشال کے اندر جا چکی تھی اور شمشال نالے کے کنارے چٹانوں سے چمٹی روڈ پر بلند ہو رہی تھی......

اور وہاں...... شاہراہ ریشم کے کنارے گل مت اور پسّو کی بستیوں میں...... ایک انہونی خوبصورتیوں والی بستیوں میں آفتاب ابھر چکا تھا......

لیکن یہاں ابھی اس کے آثار نمایاں ہو رہے تھے اور وہ بھی درّے کی بلند ترین چٹانوں کی چوٹیوں پر...... جن کی رنگت بدل رہی تھی...... اور بہت نیچے جہاں ہم حرکت میں تھے ابھی سرمئی سی سویر تھی اور چٹانیں نیم تاریکی سے نمایاں ہونے کے مراحل میں تھیں......

پھر سورج کی پہلی کرنوں کے آثار درّے کی ہیبت ناک کشش والی کڑیل چٹانوں سے دھیرے

دھیرے نیچے آنے لگے...... بڑے بڑے پتھر' بولڈر اس زرد روشنی کو جذب کرتے چلے گئے اور ان کا رنگ جو پیلاہٹ لئے ہوا تھا گلابی ہونے لگا...... یہ گلابی رنگ نہایت آہستگی سے پیلی چٹانوں کے انبار میں سرایت کرتا ہو نیچے آنے لگا...... یہاں تک کہ وہ دریائے شمشال کے دوسرے کنارے تک اتر گیا......اب صرف ہماری جیپ اور ہم سائے میں تھے اور آس پاس جہاں تک درّے کی فصیلیں اٹھتی تھیں اور جہاں تک نظر جاتی تھی کرنوں نے چٹانوں میں جذب ہو کر انہیں گلابی رنگت سے بھر دیا تھا...... جیسے یہ رنگ سورج کی پہلی کرنوں کی عطا نہ تھا بلکہ ان کے اندر موجود تھا اور اب آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہا تھا......

اس منظر میں ایک ایسا روحانی سکون تھا جیسے یہ کائنات کی تخلیق کا پہلا دن ہو اور ابھی صرف بصارت اور حیرت عطا ہوئی ہو' کہ یہاں گویائی کی ضرورت نہیں تھی......

درّہ شمشال کا چٹانی گلاب کھِل گیا تھا......

تنگ درّے میں ہماری جیپ جارہی تھی اور ہمارے سامنے اُردن کے صحراؤں میں پوشیدہ پیٹرا کے رومی شہر کے قدیم گلابی کھنڈر تھے۔

درّہ شمشال کی ہر چٹان ایک اُجڑا ہوا رُومی محل تھی۔

یا کسی دیوی کا ویران معبد تھی......

جہاں خزانہ رکھا جاتا تھا وہ عمارت تھی......

ایک متمول رُومی تاجر کا شکستہ ستونوں والا عالی شان گھر تھی......

لیکن یہ سب گلاب رنگ تھے۔

کیونکہ مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ اردن کے صحراؤں میں اس تاریخی شہر کے کھنڈر صدیوں تک اوجھل رہے اور پھر کوئی گڈریا اپنی گمشدہ بھیڑ کی تلاش میں دو بہت بلند چٹانوں کے درمیان میں جو ایک تنگ سا راستہ تھا اس میں سے بمشکل گزر کر اندر گیا تو وہاں چٹانوں کی آغوش میں صدیوں سے ویران پڑا ہوا پیٹرا کا شہر تھا......اور اس گڈریئے کو یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے حقیقت ہے ایک واہمہ نہیں......اور جب اس نے باہر کی دنیا کو خبر کی تو انہیں بھی یقین نہ آیا کہ ایک اتنے بڑے شہر کے کھنڈر صدیوں تک انسانی نظر سے کیسے اوجھل رہ سکتے ہیں...... اور اب وہی دنیا لاکھ جتن کر کے اس کے کھنڈروں تک صرف اس

لیے پہنچتی ہے کہ اسے طلوعِ آفتاب کے لمحوں میں دیکھے......اور جنہوں نے یہ منظر دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ سورج کی پہلی کرنیں جب اس بے آباد رُومی شہر پر اُترتی ہیں تو اس کے ہر پتھر کو' ہر شکستہ ستون' ہر عمارت اور ہر نقش کو اور پیٹرا کی پوری درّہ نما وادی کو گلابی کر دیتی ہیں اسی لئے اسے "روز ریڈ سٹی آف پیٹرا" کہا جاتا ہے......

پیٹرا کے گلابی شہر کے سویر میں اب ہر کوئی پہنچ سکتا تھا......

لیکن یہاں درّہ شمشال میں ابھی تک ایک اور پیٹرا پوشیدہ تھا جس کی کسی کو خبر نہ تھی......

میں اور میرے ساتھی وہ گڈریئے تھے جو کوہ نوردی کی گمشدہ بھیڑ کی تلاش میں اتفاقاً ادھر آ نکلے تھے اور ہمیں بھی یقین نہیں آ رہا تھا......

کسی کو خبر نہ تھی' صرف ہمیں تھی۔

دنیا کی تنہا ترین جگہ سے خوشی تلاش کرنے کے لیے جانے والوں کو تھی۔

اور کسی کو نہ تھی......

اور ہم نے باہر کی دنیا کو خبر کرنی بھی نہیں تھی کہ انہوں نے یقین ہی نہیں کرنا تھا......

اس لیے کہ اس سویر میں درّہ شمال' پیٹرا کے کھنڈروں سے کہیں بڑھ کر پُر طلسم اور ناقابل یقین تھا......

اس کی پُر ہیبت اور بڑی شان والی بلند چٹانیں گلابی ہو رہی تھیں...... جیسے خالص پاسے کے سونے کے منجمد اہرام بلند ہو رہے ہوں۔ سونے کے یہ اہرام' یہ گلابی عبادت گاہیں' حجم اور مسافت میں اتنے عظیم تھے کہ ہمیں ہماری جیپ کو حقیر اور بے وقعت کرتے تھے......اور یہ ان کی فراخ دلی تھی کہ وہ ہمیں اپنی پوشیدہ سلطنت میں سے گزر جانے دے رہے تھے......

درّہ شمشال کا گلاب...... پتھریلا اور سنگدل...... شمشال روڈ پر رواں جیپ کے اوپر کھلتا جارہا تھا......

درّے کے چٹانی حصار سیمسن کے مندر کے ستونوں میں بدلتے تھے......

کبھی ابو سنبل کے معبد دکھائی دیتے تھے۔

یہ ہرات کی صبح میں تیمور کی ملکہ گوہر شاد کے مقبرے کے گنبد تھے...... مدرّسے کے

سر بریدہ مینار تھے جن پر روشنی ہو رہی تھی۔

شیر دریا سندھ کی سویر میں جب ایک اندھی ڈولفن پانیوں میں سے ابھرتی ہے تو اس کے لشکیلے بدن پر جب سورج کی کرنیں روشن ہوتی ہیں...... تو نیم سیاہ پانیوں میں وہ ایک سنہری جزیرہ دکھائی دیتی ہے......

یونانی دیومالا کے سمندروں میں' شاعر ہومر کی بیان کی گئی صبحوں میں......ان سب جگہوں پر جتنے بھی آفتاب ابھرے تھا وہ سارے کے سارے اس لمحے درّہ شمشال کی چٹانوں پر اتر رہے تھے......

منتظر کب سے ہیں کہ ماہتاب...... نہیں' آفتاب ابھرے......اگرچہ وہ ابھر چکا تھا لیکن نظروں سے ابھی اوجھل تھا صرف اس کے آثار تھے جو اس کی آمد کی نوید دے رہے تھے اور اس شمشال کے پیٹرا کو گلابی کر رہے تھے۔

وہ درّے کی تنگنائی میں اتر نہ سکتا تھا...... صرف اس کی کرنیں کھوج لگاتی اندر تک آتی تھیں اور ان چٹانوں سے ان دیکھے ، پہنچتا ہے۔ پھر......

پیٹرا تو ایک شہر تھا...... یہاں کئی شہر تھے......

درّہ شمال اس سویر میں ایک گلابی رنگت کا تراشا ہوا بدن تھا جو پہلی شعاعوں سے زندہ ہو رہا تھا......ایک ایسا معجزہ تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھوں کی تخلیق ہوئی تھی......اور میں اسے دیکھتا تھا اور اس پر ایمان لاتا تھا......

کوہِ طور بھی کچھ ایسے ہی منوّر ہوا ہو گا......

اور شمشال روڈ کے آس پاس رونما ہونے والے اس گلابی مُعجزے کے اندر ہماری جیپ چلتی جا رہی تھی۔

کبھی اس کے انجن کی آواز چٹانوں سے سر ٹکراتی' گونجتی درّے کے در و بام پر دستکیں دیتی دوہائی دینے لگتی......

اور کبھی یوں محسوس ہوتا کہ جیپ اس منظر کی ہیبت اور دل ربائی کے آگے سر جھکائے اپنا سانس روکے ایک بیر بہوٹی کی طرح خاموشی سے رینگتی چلی جاتی ہے......کہ جیپ کا رنگ بھی سرخ تھا......

میں اسحاق کریم کے برابر میں گنگ بیٹھا' راڈ کو تھامے اس روز ریڈ سٹی آف پیٹرا کو حیرت سے تکتا آنکھیں نہ جھپکتا تھا کہ یہ صرف پل دو پل کا کھیل تھا۔ آنکھ جھپکنے سے اس نے غائب ہو جانا تھا۔

جیپ کی پچھلی نشستوں پر ہمارے رک سیک' نیلے ڈرم اور کوہ نوردی کا سامان تھا......

بقا شیخ تھا......اس پہاڑی کھیل کا پرانا کھلاڑی......

نو آموز...... تیکھی جنگلی گھاس ایسی مونچھوں والا ڈیرہ اسماعیل خانی...... ندیم......

ایک اداس اور رومانوی شکل کا ماڈل نما شمشالی نوجوان قدرت تھا......

مہربان کا شوخ اور نخریلا بیٹا راہبر تھا۔

اور رجب شاہ تھا......

اور ہم سب شمشال جا رہے تھے......

کہا جاتا ہے کہ پچھلے زمانوں میں ہنزہ کے میر...... وہ خود جیسے بھی تھے...... مجرموں کو اپنے مخالفین کو شمشال کی سزا دیتے تھے...... ن تھا......

شمشال ایک پینل کالونی تھی......

وہاں کوئی بھی اپنی خوشی...... سے نہیں جاتا تھا......

لیکن میں وہاں' دنیا کی تنہا ترین جگہ پر اپنی خوشی...... سے جا رہا تھا......

زمانے بدل چکے تھے......

پہلے وہاں مجرموں کو بھیجا جاتا تھا......

اور یہ مجرم...... میں اپنی من مرضی سے وہاں جا رہا تھا......

کیوں؟

اس لئے کہ میں نے اپنے کو کبھی جرم سے مبرّا نہیں سمجھا...... مجھ میں ایک شدید احساس جرم ہے کہ میں اپنے وطن کی بربادیوں کا ذمہ دار ہوں...... میں نے کبھی اپنی حماقتوں کو یہود و ہنود کی سازش نہیں ٹھہرایا...... اس لئے میں مجرم تھا......

اور میں شمشال جا رہا تھا...... اپنی خواہش سے......

شمشال روڈ پر جیپ چلی جا رہی تھی......

چلی جا رہی تھی......

پھر اس درّے کے گلابی شہر میں یوں ہوا کہ شمشال روڈ معدوم ہو گئی اور جیپ ایک خلا میں سفر کرنے لگی......اس کے ٹائر گھومتے تھے لیکن وہ اپنا وزن کھو چکی تھی اور درّے میں ایک اڑن طشتری کی طرح اٹھتی چلی جاتی تھی...... پھر آہستہ آہستہ جیپ کا ڈھانچہ بھی تحلیل ہو گیا اور صرف میرا وجود باقی رہ گیا اور میں اس حالت میں بیٹھا معدوم ہو چکے راڈ کو بدستور تھامے ایک خلائی مسافر کی طرح اس گلاب درّے کی چٹانی کائنات میں نہایت آہستگی سے بے آواز سفر کرنے لگا۔

صرف میں تھا اور پیٹرا کے رومی شہر کے کھنڈر اُس سویر میں گلابی ہو رہے تھے......اور پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ میں بھی اس کے رنگ میں رنگا گیا......اور اس شہر کی شان اور خوبصورتی انکار کرتی تھی کہ کبھی میں بھی فنا ہو سکتا ہوں......

ایک شخص جو اپنے لاہور سے دور ہو کر...... جھیل سیف الملوک......دریائے سندھ اور نانگا پربت پر سے اڑان کر تا گلگت پہنچتا ہے۔ پھر وہاں سے کریم آباد۔ گل مِت کے راستے پسّو کے قصبے میں جا ٹھہرتا ہے اور جب گُل خدائی شاہراہ ریشم پر سفر کرتی درّہ خنجراب کے دیدار کو جاتی ہے یا کاشغر کا قصد کرتی ہے تو وہ اس راہ راست سے بھٹک کر یکدم نوّے درجے کے زاویے پر دائیں جانب پسّو کی نوکیلی چٹانوں کے اندر اَن دیکھی راہوں کا رخ کرتا ہے اور تب وہ ایک پہاڑوں کی اپنی تنہائی میں ایک گلابی شہر کو آنکھوں کے سامنے کھِلتا دیکھتا ہے تو وہ کیسے یقین کرے کہ فنا بھی آ سکتی ہے......اس میں اس کا تو کوئی دوش نہیں......اگر ہے تو اس کا...... جس نے اس سویر درّہ شمشال کے چٹانی حصار' فصیلیں اور قدیم شہر گلاب رنگ میں رنگے......اور اسے بھی رنگ دیا۔

لیکن جیسا کہ مجھے ڈر تھا یہ معجزہ پل دو پل کا کھیل تھا...... دھوپ اپنی زردی کو کتنی دیر برقرار رکھتی' وہ تیز ہونے لگی......اور اس کے ساتھ ہی یہ گلابی رنگتیں' اس کی شدّت کی تاب نہ لا کر رخصت ہونے لگیں...... درّے کی چٹانیں سفید ہونے لگیں......

پیٹرا کے گلابی شہر کی رنگت نچڑنے لگی اور وہ بے رنگ...... سفید ہو تا گیا......

درّہ شمشال اگرچہ اب بھی اپنی پرشکوہ بلندیوں سے ہم پر حاوی ہو رہا تھا لیکن وہ اب تیز

دھوپ میں تھا...... اس کا طلسم زائل ہو چکا تھا...... اب نہ کہیں وہ معبد تھے...... نہ شکستہ ستون اور اجڑے ہوئے شہر...... اور نہ ہی ہماری جیپ معدوم ہوتی مجھے کسی اور کائنات کا مسافر بناتی تھی...... درّہ شمشال پتھر ہو چکا تھا...... تیز دھوپ نے اس کو اپنی سفیدی سے بھر دیا تھا......

البتہ دریائے شمشال کے کنارے دوبے آباد سے جھونپڑے دکھائی دیئے جن تک سورج کی کرنیں ابھی نہیں پہنچی تھیں اور وہ ملگجے اندھیرے میں تھے......

"سونے وال ہیں صاحب...... یہ لوگ دریائے شمشال میں سے سونا نکالتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے...... سونا تلاش کرنے والے کبھی خوش نہیں ہوتے۔ کبھی خوشحال نہیں ہوتے......"

شاید وہ اس درّے میں مقیم ہونے کے باوجود اپنے آس پاس نہیں دیکھتے تھے...... دریا کے پانیوں کو چھانتے ہوئے صرف اپنی چھاننیوں پر نظر جمائے رکھتے تھے کہ کہیں ریت میں سے کوئی ذرّہ بھڑکے اور درّے کی کسی سویر کو نہیں دیکھتے تھے...... نہیں تو ایک ذرہ کیا...... ان پر اڈتی چٹانیں اس لمحے سونے کے انباروں میں بدلتی تھیں...... لیکن صرف چند لمحوں کے لیے......

بائیں جانب چٹیل پہاڑوں کے اوپر ایک اور برف سفیدی کوہِ قارون کی ابھرنے لگی......

کوہِ قارون...... ایک عجیب برفانی ڈھیر ایسی شکل کا پہاڑ تھا...... تبت کے مقدس کوہ کیلاش سے بہت ملتا جلتا...... جیسے آج تک کوئی بھی انسان اس کی قربت میں نہ پہنچا ہو...... جیسے درّہ شمشال اور ان چٹانوں سے بہت پہلے یہ وجود میں آیا ہو۔ ایک لق و دق وسعت میں، ہموار وسعت میں لاکھوں برس تک تنہا کھڑا رہا ہو اور پھر کسی جغرافیائی تغیر کی بنا پر اس کے آس پاس یہ چٹانیں ابھرنے لگیں، بلندیاں نمودار ہوئیں، دریا اور ندی نالے جاری ہوئے اور یہ ان میں روپوش ہو گیا...... اب صرف اُسے دکھائی دیتا ہے جو درّہ شمشال کے اندر جاتا ہے...... اور نام بھی عجیب تھا...... کوہِ قارون...... پتہ نہیں اس کے چٹانی اور برفانی وجود کے اندر کونسے خزانے پوشیدہ تھے کہ یہ قارون ہو گیا تھا......

"ادھر سے ہمارا دادا آیا تھا......" رجب کوہِ قارون کو دیکھتا تھا...... رجب کے چہرے کا ماس کھنچا ہوا تھا جیسے اس کی کھوپڑی پر کس دیا گیا ہو...... جیسے ایک ڈیتھ ماسک ہوتا

ہے...... ایک نقاب ہوتا ہے...... یہ تنا ہوا کھنچا ہوا ماس بلندیوں پر مشقتوں کی علامت تھا...... ایک ہائی پورٹر کی حیثیت سے وہ اتنی اونچائی پر جاتا تھا جہاں عام انسان قدم نہیں رکھ سکتا، اس کے پھیپھڑے پھٹ جاتے ہیں، دماغ میں پانی بھر جاتا ہے، اسے سانس نہیں آتا اور رجب نہ صرف وہاں تک جاتا تھا بلکہ بوجھ اٹھا کر جاتا تھا......

"آپ کے دادا کا نام کیا تھا؟"

"مامون سنگھ......"

"مامون سنگھ...... آپ کے دادا کا نام تھا؟"

"ہاں......"

"اور وہ ادھر کوہِ قارون سے آیا تھا؟"

"ہاں......"

"کب؟"

"کئی سو برس پہلے کی بات ہے...... یہ پندرہ نسلوں کے پہلے کی بات ہے...... ہمارا جو بڑا تھا...... جو پہلا شمشالی تھا، اسے ہم دادا بولتے ہیں وہ ادھر مارخون کے قصبے سے کوہِ قارون عبور کر کے شمشال میں اترا تھا...... اپنی بیوی کے ساتھ...... کہتے ہیں کہ وہ ہنزہ کی وادی چھپروت کا رہنے والا تھا...... مارخون کے قریب آ کر آباد ہوا...... ان دنوں وہاں چینی اور کرغیز ڈاکو لوگ آتے تھے اور سب کچھ لوٹ کر اور جو باقی بچتا تھا اسے جلا کر چلے جاتے تھے...... تو ایک رات انہوں نے حملہ کیا تو مامون سنگھ نے اپنے بیٹے کو ایک سٹور میں جو تنور کی مانند زمین میں ہوتا ہے چھپا دیا کہ وہ اسے اٹھا کر بھاگ نہیں سکتا تھا...... وہ اپنی جان بچا کر ادھر سے نکلا اور اس پہاڑ کو پار کر کے وادیٔ شمشال میں اترا......"

جیپ رک گئی......

آگے شمشال نالے پر کُش ترت کا پل تھا......

جیپ آہستگی سے رک رک کر اس کے پار ہوئی......

"پھر کیا ہوا رجب؟"

"وہ شمشال میں داخل ہوا تو وہاں کوئی نہ تھا...... لیکن آثار تھے کہ کسی زمانے میں وہاں

لوگ رہتے تھے...... کھیتوں کی مینڈھیں تھیں' دوچار کھنڈر تھے گھروں کے اور ان کے اندر برتن تھے پتھر کے بنے ہوئے۔ کاشتکاری کے اوزار تھے...... کپڑا بننے کی کھڈیاں تھیں...... پرانے موزے' یاک کے جوتے' جو کے توڑے' صراحیاں اور صدیوں سے بجھے ہوئے آتش دان اور سیاہ چھتیں تھیں...... یہ ان مسافروں کے ٹھکانے تھے جو کبھی پامیر سے ترکستان جایا کرتے تھے...... کھیتوں کے قریب ایک بہت بڑا پتھر تھا جسے دادا نے اٹھایا تو اس کے نیچے کچھ مٹی تھا...... اسے ہٹایا تو اندر پانی کا ایک نہر چلتا تھا...... ہمارا دادا اس وادی میں ٹھہر گیا اور کاشتکاری شروع کر دیا...... ایک روز ہمارا دادا کھیت میں کام کرتا تھا تو اس کے گھر میں اس کی بیوی خدیجہ کے پاس ایک بزرگ آیا...... اور اس کے پاس ایک بھیڑ تھا...... بزرگ نے اس کو دعا دیا اور کہا کہ تم یہ بھیڑ کا قربانی کرو تو تمہارے ہاں اولاد آئے گی...... بیوی نے یہ سنا تو فوراً گھر سے باہر نکل کر اپنے خاوند کو اس کا نام لے کر پکارا...... مامون نے جب اپنی بیوی کے ہونٹوں سے اپنا نام سنا تو بہت حیران ہوا کیونکہ ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے' وہ ایک دوسرے کے ساتھ بولتے نہیں تھے...... بیوی ناراض تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو چھوڑ کر کیوں آگیا ہے...... اس لئے کبھی اس کا نام نہیں لیتی تھی...... اس لئے مامون حیران ہوا اور سمجھ گیا کہ اگر آج بیوی نے اس کا نام پکارا ہے تو کوئی خاص بات ہے...... گھر میں آیا تو بیوی نے بزرگ کا بتایا...... لیکن کیا ہوا کہ بزرگ غائب ہو گیا اور بھیڑ البتہ موجود رہا...... پھر مامون نے وہ بھیڑ قربان کیا تو اس کی برکت سے ان کا بہت اولاد ہوا...... ہم سب شمشالی اس کا اولاد ہیں......"

"اتنی قدیم تاریخ ہے آپ کی؟"

"ہاں......" رجب نے سر ہلایا...... "پھر ہمارے دادا کے بیٹے شیر نے پولو کا میچ کھیلا"

"پولو کا کھیل اس زمانے میں بھی ہوتا تھا؟"

"ہوتا تھا...... مامون سنگھ کا بیٹا ہوا شیر...... تو اس نے چینی لوگوں کے ساتھ شمشال پامیر کے اوپر پولو کھیلا...... لیکن ایسا کھیلا کہ چینی گھوڑوں پر سوار تھے اور شیر ایک یاک پر بیٹھا تھا۔"

"یاک پر بیٹھ کر پولو کھیلا؟"

"ہاں...... سینکڑوں برس پہلے شمشال پاس میں کھیلا تھا......"

"کیسے کھیلا تھا؟"

"چاچا رجب......" اسحاق کریم نے مؤدب انداز میں گذارش کی "ذرا چپ ہو جاؤ...... آگے چڑھائی ہے...... ذرا خطرناک ہے...... روڈ خراب ہے"

اور واقعی شمشال روڈ ایک زرافے کی گردن کی طرح سیدھی ہوئی اور یوں اٹھی کہ آسمان کی نیلاہٹ کو چھونے لگی اور دریائے شمشال نیچے بہت نیچے ایک لکیر ہونے لگا اور ویرانی بڑھنے لگی

"شمشال پہنچے گا تو آپ کو بتائے گا کہ پولو کیسے کھیلا......" رجب نے سرگوشی کی۔

درّہ شمشال دھوپ کی تیزی میں سفید تھا اور سناٹے میں تھا......

چٹانوں کے گلابوں کا رنگ نچڑ چکا تھا اور صرف بے آرام کرنے والی ویرانی اور بے پناہ بلندی تھی اور ایک انجانے ڈر والی دور افتادگی تھی اور اس سے پرے کہیں دنیا کی وہ تنہا ترین جگہ تھی جہاں سے میں خوشی حاصل کرنے کے لیے جا رہا تھا...... شمشال......

"گلگت دربار"

گلگت بدل چکا تھا......

گلگت بہت بدل چکا تھا......

آج سے سترہ برس پیشتر جب میں اپنے بیٹے سلجوق کی انگلی تھامے گئی رات اس دور افتادہ اور تقریباً غیر معروف بستی میں داخل ہوا تھا تو یہ چٹانوں میں گھرا ہوا ایک جزیرہ تھی...... لیکن اب اس جزیرے تک پہنچنا اور یہاں سے نکلنا بہت آسان ہو چکا تھا...... جہاز کی کشتی اگرچہ ابھی تک پنکھوں والی تھی...... جیٹ انجن فی الحال اس کے نصیب میں نہیں تھے لیکن یہ کشتی روزانہ تین بار اسلام آباد سے آتی تھی اور جاتی تھی...... موسم کے مطابق...... اور شاہراہ ریشم کی ویرانی پرانے وقتوں کے قصے تھے' اس پر ٹریفک کا اژدہام تھا' جی ٹی روڈ کی مانند رونق تھی اور گلگت...... ایک بڑا شہر بن چکا تھا......

اس شہر کی ایک رات میں...... ایک نویں نکور راجہ ناصر آف استور کے شاندار بلکہ ضرورت سے زیادہ شاندار "ہوٹل رُوپل" کے ایک کمرے میں ایک دربار لگا تھا...... ایک انہونی اور یکتا سی محفل سجی تھی...... ایک مست ملنگ بے پرواہ اور سرخوشی میں ڈوبا ہوا ایک اجتماع تھا...... محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے...... تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے...... یہاں محبت کرنے والے کم نہ تھے اور ہم اس محفل میں تھے...... کمرہ ایک مدت سے مختصر ہو چکا تھا...... ایک صاحب جب ایک کونے میں ایک مدت کھڑے رہے تو انہوں نے تھک کر سائیڈ ٹیبل کے لیمپ کو آف کیا...... اسے اٹھا کر گود میں رکھا اور میز پر بیٹھ گئے اور بیٹھنے کے فوراً بعد اسے روشن کر دیا اور خود بھی روشن ہو گئے...... ایک اور دوست دیوار سے ٹیک لگائے

کھڑے تھے' انہوں نے باتھ روم کا دروازہ وا کیا اور وہیں ٹائلوں کے ستھرے فرش پر آلتی پالتی مار کر براجمان ہو گئے......

ہر دس پندرہ منٹ کے وقفے کے بعد دروازے پر دستک ہوتی اور کوئی شناسا' کوئی دوست چہرہ دروازے کے عقب میں سے طلوع ہوتا "آہا...... تارڑ صاحب...... ہم نے سنا کہ آپ گلگت میں ہیں...... تو آپ تو مصروف ہیں...... اچھا تو اندر آنے کی اجازت ہے......" اور اکثر وہ خوراک اور مشروبات کا ایک بنڈل اٹھائے ہوئے اندر آتے......

ڈبل بیڈ کے اوپر دو گلگتی موسیقار مہاتما بدھ کی مانند آنکھیں بند کئے گیان دھیان میں گم تھے...... ایک صاحب بانسری پر کوئی لوک گیت پیش کر رہے تھے اور ان کی پھونک میں درد اور رچاؤ تھا اور دوسرے حضرت نہایت تحمل سے سر جھکائے ایک مقامی ڈھول پر تھاپ دیتے سنگت کرتے تھے...... یہ گانے بجانے کا پروگرام کوئی ذاتی بندوبست نہ تھا...... انہوں نے کہیں سے سنا کہ میں ٹاؤن میں ہوں تو اپنے سازوں سمیت روپل ہوٹل میں پہنچ گئے کہ ہم آپ کے سامنے گلگت کے کلچر کا مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں...... چنانچہ وہ مظاہرہ کر رہے تھے اور جو سنتے تھے وہ سر دھنتے تھے......

"تارڑ صاحب......" گلگت میں میرے قدیمی دوست فضل احمد نے اپنے فراخ ماتھے سے پسینہ پونچھا...... "جناب آپ شمال میں آجاتے ہیں تو...... تو......"

فضل احمد ایک رکاوٹ والی ردھم میں بات کرتے ہیں...... سر جھٹک کر رک رک کر گفتگو کرتے ہیں "تو جناب آپ شمال میں آجاتے ہیں...... تو...... تو...... آپ یقین کریں گے...... یقین کریں گے...... کہ ہماری خوبانیاں زیادہ شیریں...... زیادہ شیریں ہو جاتی ہیں۔ چیری کا رس بڑھ جاتا ہے...... اور ہم خوش ہو جاتے ہیں...... اور...... اور...... ہم لوگ جو شہتوت کا عرق نوش کرتے ہیں تو وہ سادہ ہوتا ہے' لیکن آپ کے آنے سے اس میں بھی خمار آجاتا ہے"

فضل کو اس قسم کی توصیفی گفتگو کرنے میں کمال حاصل تھا۔

اکرام بیگ...... کمر سیدھی کئے...... بہت دیر تک نہایت متانت سے بیٹھا رہا...... اس کے والد جی ایم بیگ صاحب جو پی آئی اے کے اس فوکر طیارے کے مسافر تھے جس کا آج

تک کوئی سراغ نہیں مل سکا...... جو میرے لیے شمال کی بارش محبت کا پہلا قطرہ تھے اور وہ بھی ہمیشہ اسی انداز میں کمر سیدھی کیے بیٹھتے تھے...... تو اکرام بہت دیر تک متانت سے بیٹھا رہا اور پھر مسکرا کر...... اپنے براؤن بالوں کو سنوارتا گویا ہوا ''تارڑ صاحب...... کم اونیل آپ کو بہت یاد کرتی ہے......''

یہ صریحاً زیادتی تھی اور شرارت تھی......

بقاء شیخ جو ایک عرصے سے صرف مسکراتا چلا جاتا تھا اور اپنے سنّاٹے میں گم تھا کیونکہ اس نے اپنا وہ کارآمد کان جسے ہم اس کا انٹینا کہتے تھے ابھی تک سیدھا نہیں کیا تھا اور اس کا رخ درست نہیں کیا تھا' چونک گیا ''ہیں؟...... ''یاک سرائے'' والی کم اونیل...... لو جی ہم نے اس بی بی کو کہاں کہاں یاد نہیں کیا...... ہم تو اسے ملتان میں بھی یاد کرتے ہیں...... تو وہ تارڑ صاحب کو یاد کرتی ہے تو کہاں کرتی ہے...... امریکہ میں ہے؟''

''نہیں...... کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے خاص طور پر امریکہ سے آ گئی ہے''

''کہاں آ گئی ہے؟''

''گلگت میں......''

''کہاں ہے؟'' بقا کی مونچھیں پھڑکنے لگیں......

''اس کے ہمراہ اس کا خاوند جان ماک بھی ہے اور......''

''ہمیں اس سے کیا کہ کہاں ہے......'' بقا کی مونچھیں بجھ گئیں......

''میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ نے تارڑ صاحب کو کرومبر جھیل اور وادیٔ بروغل تک پہنچنے کے لیے جو نقشہ بنا کر دیا تھا اور درکوت گلیشیر کو پار کرنے کا جو طریقہ بتایا تھا وہ ان کے بہت کام آیا اور انہوں نے اپنی کتاب ''یاک سرائے'' میں ایک باب آپ کے بارے میں بھی لکھا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی......''

''مجھے امید ہے کہ تم نے اسے وہ باب...... ترجمہ کر کے سنا تو نہیں دیا...... بھئی میں نے حسبِ عادت اس میں تھوڑے بہت مبالغے سے کام لیا تھا......'' میں نے ہراساں ہو کر کہا۔

''آپ نے جہاں جہاں مبالغے سے کام لیا تھا وہاں وہاں تو وہ خوش ہوئی تھی...... میں نے ترجمہ کر کے سنا دیا تھا بلکہ تھوڑا بہت اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیا تھا......''

''اس کا خاوند بھی موجود تھا؟''

''نہیں...... وہ بہت احتیاط پسند خاوند ہے...... اس لئے ہم بھی احتیاط کرتے ہیں۔''

فیئری میڈو کا رحمت نبی جو اب بارلیش ہو چکا تھا جہاں کہیں بھی تھا وہاں سے اٹھا اور کہنے لگا ''ادھر کمرے میں دھواں بہت ہو گیا ہے...... میں کھڑکی کھولتا ہوں......''

اس نے بھاری پردے سرکا کر شیشے کی کھڑکی کو دھکیل کر کھول دیا...... اپنا داڑھی آلود چہرہ باہر نکالا ایک گہرا سانس لیا اور فوراً پیچھے ہٹ گیا ''کیا زہریلی ہوا ہے گلگت کی...... فیئری میڈو میں ایک سانس لو تو بندہ مارخور ہو جاتا ہے...... کھنکنے لگتا ہے......'' اور پھر بیٹھ گیا......

''ہاں تو کم اونیل نے اور کیا کہا تھا......'' میں نے اکرام سے پوچھا

رحمت نبی پھر کھڑا ہو گیا ''گلگت میں ہر کوئی کم اونیل کی بات کرتا ہے...... کوئی بھی ماریتا کی بات نہیں کرتا......''

''وہ کون ہے؟''

''تارڑ صاحب جانتے ہیں......'' وہ اداس ہو کر بولا اور پھر بیٹھ گیا......

میں نے شاید کئی صدیاں پہلے...... جن دنوں وہاں تک روڈ نہیں جاتی تھی...... فیئری میڈو کی خواہش میں رائے کوٹ پُل سے...... بولڈر برج کے پیاسے اور خوفناک راستے پر پیدل چلتے ہوئے...... مطیع الرحمٰن اور قدم خان اور مولوی رحمٰن کے ساتھ چلتے ہوئے...... دو روز کے سفر کے بعد فیئری میڈو پہنچا تھا...... تب میں نے ایک آسٹرین لڑکی ماریتا سے پوچھا تھا کہ تم یہاں کیسے پہنچ گئیں...... تمہیں کس نے بتایا کہ یہاں ہمارے شمال میں یہ فیئری میڈو ہے...... نانگا پربت کے دامن میں ایک چراگاہ ہے......

تو ماریتا نے بتایا تھا...... ''میں آسٹریا میں ایک پرائیویٹ فرم میں کام کرتی ہوں...... میں جب بھی اپنے باس کے کمرے میں جاتی تھی' وہاں اس کی کرسی کے پیچھے ایک بہت بڑی پینٹنگ دیکھتی تھی...... ایک وسیع سبزہ زار اور بلند برفیں...... میں اسے ایک عرصہ تک صرف ایک پینٹنگ سمجھتی رہی اور پھر میری سالگرہ پر میرے باس نے مجھے بتایا کہ ماریتا یہ پینٹنگ نہیں ہے...... ایک فوٹو ہے...... پاکستان کے شمال میں پوشیدہ نانگا پربت کے دامن میں...... فیئری فیڈو کی...... تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں زندگی میں ایک بار یہاں ضرور آؤں

گی...... تو میں آ گئی...... اپنے بھائی رونالڈو کے ہمراہ......"

اس نے آسٹریا واپسی پر مجھے ایک تصویری پوسٹ کارڈ بھیجا...... اور رحمت نبی کو یقیناً درجنوں کارڈ روانہ کئے...... فیری میڈو کے طلسم نے اثر کر دکھایا تھا...... اور پھر رحمت نبی آسٹریا کے پھیرے لگانے لگا...... اور ابھی تک اس کی یاد میں آہیں بھرتا تھا......

بس یہی وہ ماریتا تھی......

چونکہ ہر شخص...... اپنی اپنی ماریتا یا رکم او نیل میں گم تھا...... اور عرق میں غرق تھا اسی لئے موسیقاروں کے ثقافتی مظاہرے کو کوئی بھی دھیان سے نہیں سنتا تھا...... اس پر انہوں نے شدید احتجاج کیا" جناب آپ کیا سمجھتے ہیں کہ صرف ہنزہ وغیرہ کی ہی کوئی ثقافتی پہچان ہے...... بلتستان کا ہی کلچر ہے...... گلگت کا کوئی کلچر نہیں ہے...... ہمارا ان سب سے جدا ثقافت ہے اور لوک داستانیں ہیں آپ لوگ توجہ نہیں کر رہے......"

چنانچہ سب لوگ خاموش ہو کر بانسری اور ڈھول کی ثقافتی صدائیں سننے لگے......

"ہوٹل رویل" کے اس کمرے کا یہ اجتماع غیر قانونی نہ تھا......

سراسر قانونی اور سرکاری تھا......

کیونکہ...... گلگت میں شمالی علاقہ جات میں سیاحت کی ترویج کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو رہی تھی اور ہم معزز مندوبین تھے اور اسی لئے اس مہنگے ہوٹل میں فروکش تھے کہ حکومتی مہمان تھے...... ذاتی خرچے پر آتے تو اس کے گیٹ پر ایک آہ سرد بھر کر آگے چلے جاتے......

آج صبح اس کانفرنس کا افتتاح "گلگت سرینا" میں ہوا تھا...... جس میں پہلی تقریر دل خراش اس خاکسار کی تھی...... میں نے شمال سے پہلی شناسائی کے حوالے سے بریگیڈیئر اسلم خان کا تذکرہ کیا جو میری زراعتی دکان کسان اینڈ کمپنی میں سکردو سے آیا کرتے تھے...... جھیل کچورا کے کنارے اور رئینٹ ایئرویز کے جہاز کو ایک ہوٹل میں بدلنے کی باتیں کرتے تھے...... گلاب کے پودے خریدتے تھے اور میرے والد چودھری رحمت خان تارڑ کے ساتھ جھیل میں سنگھاڑے کاشت کرنے کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے تھے......

میر جمال خان آف ہنزہ باقاعدگی سے پھولوں کے بیج منگواتے تھے...... ماہر زراعت بلغاری

صاحب ہر برس سکردو سے چلتے تھے اور ہمارے ہاں لاہور آکر دم لیتے تھے...... آئن سٹیفن کی کتاب "دی ہارنڈ مون" نے بھی شمال کی طرف راغب کیا...... اور پھر خواجہ مہر داد اور جی ایم بیگ اس خطے سے تفصیلی ملاقات کا سبب بنے...... وہ دن اور آج کا دن...... شمال کے سوا مجھے اور کچھ دکھائی نہیں دیا......

آغا خان رُورل سپورٹ پروگرام کے بانی شعیب سلطان صرف اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے کہیں نیپال یا نیویارک سے وارد ہوئے تھے...... انہوں نے شمالی علاقوں میں ایک حیرت انگیز زراعتی اور سماجی انقلاب کی بنیاد رکھی...... ان کا موازنہ صرف حمید احمد خان کے ساتھ کیا جا سکتا ہے...... انہوں نے اپنے مقالے میں اے کے آر ایس پی کے علاوہ کچھ اس قسم کا تذکرہ بھی کیا کہ پچھلے برس ماریشس جاتے ہوئے بحیرہ عرب میں ان کی کشتی خراب ہو گئی تو انہوں نے یہ کڑا وقت "کے ٹو کہانی" کے مطالعے میں گزارا...... ثابت یہ ہوا کہ میری تحریر صرف اس صورت میں مجبوراً پڑھی جا سکتی ہے جب کسی طوفانی سمندر کے بیچ آپ کی کشتی خراب ہو جائے...... اور آپ کے پاس کرنے کو اور کچھ نہ ہو...... اسی لئے یورپ اور امریکہ وغیرہ میں مجھے بالکل نہیں پڑھا جاتا کیونکہ وہاں کسی کی کشتی خراب ہی نہیں ہوتی......

چائے کے وقفے کے دوران پورا شمال سرینا ہوٹل کے لان میں جمع تھا......

گلگت کے ڈپٹی کمشنر میاں وحید الدین اپنی ایئر فورس مونچھوں کو مسلسل تاؤ دے رہے تھے اور کانفرنس کی کامیابی پر بے حد پُر مسرت تھے......

ایک گورے چٹے وسیع تن و توش کے مالک صاحب جو میرے ساتھ بہت دیر سے محو گفتگو تھے اور میں نے مناسب جانا کہ ان سے دریافت کر لیا جائے کہ وہ کیا شغل کرتے ہیں تو انہوں نے بتایا کہ وہ شمالی علاقہ جات کے چیف سیکرٹری ہونے کا شغل کرتے ہیں......

وہاں سیاحت کے محکمے کے افسران تھے...... سیاحتی اداروں کے نمائندے تھے اور پہاڑوں' بلندیوں' کوہ نوردیوں' کوہ پیمائیوں' جنگلی حیات اور جنگلوں کے جتنے شائق تھے سب کے سب جمع تھے...... نذیر صابر تھے لیکن اشرف امان نہیں تھے البتہ ان کی ڈاکٹر بیگم ہر سو چہک رہی تھیں۔ الپائن کلب کے جنرل جنجوعہ اور کرنل منظور تھے...... عارف اسلم' شاہ

خان، خواجہ مہرداد، رانی عتیقہ، راجہ آف گل مت، میجر حسین اور بہت سے دوسرے تھے......

"تارڑ صاحب......" طاہر عمران کی بیٹھی بیٹھی آواز مجھ تک آئی...... ایک تو اس نوجوان کی آواز مجھے کم کم سنائی دیتی تھی شاید میں بھی بقا کی مانند ایک کان سے بہشتی ہو رہا تھا اور پھر وہ حسب عادت اس پسینے کو مسلسل اپنے ماتھے سے پونچھ رہا تھا جو وہاں نہ تھا "آپ بہت مصروف ہیں...... لیکن یہ رجب شاہ ہیں"

رجب شاہ کی کھنچی ہوئی جلد اور بلندیوں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے پشت پر کندھوں کا ایک پلیٹ فارم سا بناتے ہوئے بدن کو میں نے دیکھا......

لیکن میں اسے پہلی بار نہیں دیکھ رہا تھا......

جن دنوں میں ٹیلیویژن کے مارننگ شو کا میزبان تھا۔ صبح کی نشریات پیش کیا کرتا تھا ان دنوں نانگا پربت کے بارے میں ایک فلم رپورٹ ٹیلی کاسٹ کی گئی...... رپورٹ میں جن فوجی حضرات نے چوٹی پر قدم رکھا تھا ان کے انٹرویو بھی شامل تھے۔ اس میں کسی ہائی پورٹر رجب شاہ کا بھی ذکر آیا کہ وہ بھی چوٹی پر پہنچ گیا تھا لیکن اس کی کوئی تصویر کوئی انٹرویو نہ تھا...... فلم رپورٹ کے بعد میں آن ایئر گیا تو میں نے کہا کہ...... جناب وہ کیا کہتے ہیں کہ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے...... دنیا کی نویں بلند ترین اور قاتل چوٹی پر جب آپ قدم رکھتے ہیں تو چاہے آپ ایک جنرل ہوں یا ایئر مارشل یا ایک عام پورٹر...... تو آپ ایک ہو جاتے ہیں...... جانے کیوں اس رپورٹ میں جو ہم تک پہنچائی گئی ہے ایک پورٹر کو انٹرویوز میں شامل نہیں کیا گیا...... اگر اس پورٹر رجب شاہ تک میرا پیغام پہنچ جائے تو وہ یہاں اسلام آباد آئے...... وہ صبح کی نشریات میں میرا مہمان ہوگا...... کسی نہ کسی طرح میرا یہ پیغام اسلام آباد سے گلگت پہنچا اور پھر کوئی اسے شمشال تک لے گیا اور پھر ایک صبح رجب شاہ میرے سٹوڈیوز میں تھا اور آن ایئر تھا۔

تب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا......

اور اب کئی برسوں کے بعد میں اسے یہاں گلگت میں سرینا ہوٹل کے لان میں اپنے سامنے ایک نفیس سوٹ میں ملبوس دیکھ رہا تھا...... رجب شاہ جو بلاشبہ پاکستان کا سب سے بڑا کوہ پیما تھا...... جس نے پاکستان میں واقع آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ بلندی کی پانچوں چوٹیاں سر

کرلی تھیں اور جو ایورسٹ سے صرف چند سو میٹر کے فاصلے پر رہ گیا تھا......

"رجب میں تو آپ کی وادی میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا اور آپ یہاں گلگت میں اتنے سمارٹ ہو کر گھوم رہے ہیں......"

"آپ تو کانفرنس میں آئے ہیں صاحب......"

"کانفرنس تو ایک بہانہ ہے...... شمشال جانے کا"

"آپ شمشال جائیں گے؟" اس نے اتنی معصوم حیرت سے کہا جیسے میں نے اس کے ہمراہ پھر سے کے ٹو کی چوٹی پر جانے کا ارادہ کر لیا ہو......

"ہاں...... ارادہ تو ہے...... سنا ہے کہ راستہ آسان ہو گیا ہے...... ایک خاص مقام تک روڈ بھی پہنچ گئی ہے...... پھر چار پانچ گھنٹے کی مسافت کے بعد رات کرتے ہیں اور اگلے روز شام تک شمشال پہنچ جاتے ہیں...... یہ درست ہے ناں؟"

"ہاں آں...... ہاں......" اس نے ذرا جھجک کر کہا......

ہاں آں کیا؟...... راستہ آسان ہو گیا ہے ناں؟"

اس نے اپنی کھنچی ہوئی جلد پر ناخنوں سے کھجلی کی اور پھر مسکرایا اور اس مسکراہٹ کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا تھا "تارڑ صاحب آپ اگر شمشال جاتے ہو ناں...... تو میں آپ کو لے کر چلوں گا"

"لیکن راستہ......"

"بس میں آپ کو لے جاؤں گا......"

چنانچہ رجب کے ساتھ یہ طے ہو گیا کہ کانفرنس کے اختتامی اجلاس کے بعد جو کریم آباد ہنزہ میں ہوگا ہم پسو میں ملیں گے اور وہ اس دوران پورٹروں کا بندوبست کرے گا اور ہمیں شمشال لے جائے گا......

میں ابھی رجب شاہ کے ساتھ شمشال ٹرپ کی مزید تفصیلات طے کر رہا تھا کہ پولیس کے گھیرے میں آ گیا......

میر افضل خان کی گونجدار آواز نے مجھے چونکا دیا "ٹھیک ہے تارڑ صاحب...... آپ ہمیں پہچانتے ہی نہیں......"

میں میر صاحب کو کیسے بھول سکتا تھا...... کئی برس پیشتر جب میں اپنے خاندان کے ہمراہ وادیٔ چپلو پہنچا تھا تو وہاں ایس پی تھے اور انہوں نے ریسٹ ہاؤس میں ہمارے لئے ایک شاندار ضیافت کا اہتمام کیا تھا اور ہالی وڈ کی پرانی فلموں کے ہیرو روڈولف والنٹینو کی طرح نیلے بلیزر اور سرخ سکارف میں سج کر آئے تھے اور مانگ نکال کر آئے تھے...... ایک مختصر سی ملاقات پشاور کی رورل اکیڈمی میں بھی ہوئی تھی...... اب عمر نے انہیں میری طرح زیر کر لیا تھا اور چونکہ اس دوران حج کر چکے تھے اس لئے قابل فہم طور پر باریش بھی ہو چکے تھے...... انہوں نے بچوں کا پوچھا...... بیگم کے بارے میں دریافت کیا......

"اب آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"شمشال......"

"اچھا......" انہوں نے مایوسی سے سر ہلایا" وہاں تو...... میں ابھی نہیں گیا...... لیکن آپ کیا کرنے جا رہے ہیں...... ادھر گلگت میں ٹھہریں جتنی سیر کہیں گے کرا دیں گے...... آپ کے آگے پیچھے پولیس کی جیپیں ہوٹر بجاتی پھریں گی...... شمشال جا کر کیا کریں گے......"

"بس میں نے جانا ہے......"

"اچھا......" انہوں نے پھر سر ہلایا "راستہ بہت برا ہے......" اپنی پی کیپ درست کی اور پھر کہنے لگے "کب جا رہے ہیں؟"

"رجب شاہ پرسوں تک پسّو کے گاؤں میں پہنچ جائیں گے اور انتظامات مکمل کریں گے...... پھر اس سے اگلے روز انشاءاللہ......"

"تو پھر ٹھیک ہے......" وہ باقاعدہ ایس ایس پی ہو گئے جو کہ وہ تھے "وادیٔ ہنزہ کے ڈی ایس پی اقبال صاحب اور پولیس کے جوان آپ کے ساتھ جائیں گے میں ابھی ان کی ڈیوٹی لگاتا ہوں...... وہ شمشال تک آپ کے ساتھ جائیں گے اور ادھر ٹھہریں گے...... نہایت خطرناک علاقہ ہے...... آپ کی حفاظت بہت ضروری ہے۔"

محبت کی زیادتی بھی مصیبت بن جاتی ہے...... میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ میر صاحب یہ ممکن نہیں ہو گا...... شمشال کا راستہ خطرناک ہے لیکن جان اور مال کو کوئی خطرہ

نہیں۔ اگر یہ پولیس پارٹی میرے ہمراہ مارچ کرے گی تو پہلے روز ہی ہمارا راشن ختم ہو جائے گا اور مجھے کوئی فائدہ نہ ہو گا لیکن وہ نہیں مانے۔ "پولیس پارٹی اپنا لنگر ساتھ لے کر جائے گی" چنانچہ میں نے فی الحال چپ ہو جانے میں ہی عافیت جانی......

اتنی دیر میں جاپان کی معروف پروفیسر ہاروکا آگئیں جو قدیم سلک روٹ پر تحقیق کر رہی ہیں' وادیٔ اشکومن اور درّہ درکوت پر ایک ماہر کے طور پر جانی جاتی ہیں اور ان علاقوں میں بدھ مت کے جتنے آثار ہیں انہیں دریافت کر چکی ہیں...... ان کے خاوند ایک طویل عرصہ تک کابل میوزیم کے انچارج رہ چکے تھے اور وہ اس بے مثل میوزیم کی خانہ جنگی کے دوران تباہی پر نوحہ کناں رہتی تھیں...... انہوں نے ایک نہایت حیرت انگیز قصہ بیان کیا...... "مجھے یہاں کے لوگوں نے آپ کی کتاب "یاک سرائے" کے بارے میں بتایا ہے...... میں بھی اسے روٹ پر سفر کرنا چاہتی تھی اور کم از کم جھیل کرومبر تک پہنچنا چاہتی تھی...... میرے ساتھ آصف تھے۔ لیکن ہم وادیٔ سوختر آباد تک بھی نہ پہنچ سکے کیونکہ بارشیں شروع ہو گئیں...... اور پل ٹوٹ گئے...... ہم پیاکن سے واپس آگئے...... جہاں آپ کا شکاری کینجابائی رہتا تھا...... اور جب ہم واپس وادیٔ اشکومن میں آئے تو میرے سامنے ایک نہایت سجے ہوئے بدخشانی گھوڑے پر سوار ایک باریش شخص چلا آتا تھا...... اس کا بدخشانی گھوڑا مجھے اتنا خوبصورت لگا کہ میں نے اسے روک کر کہا کہ میں اس گھوڑے کی تصویر اتارنا چاہتی ہوں...... اس نے گھوڑا روک لیا اور کہنے لگا...... تم میری تصویر بھی اتارو کیونکہ میں بہت مشہور شخص ہوں...... تمہیں پتہ ہے کہ تارڑ کے سفرنامے "یاک سرائے" میں میرا ذکر ہے...... میں اس کا ہیرو ہوں اور میرا نام نگیر خان ہے......"

"نگیر خان؟" مجھے اس ہمدم دیرینہ کے نام سے ایک جھٹکا سا لگا...... جو مجھے اپنی پشت پر اٹھا کر ورگوتھ کی تینوں ندیوں کے پار لے گیا تھا۔ وادیٔ سونج میں گھوڑے دوڑاتا تھا...... جس نے میری سواری کے لیے ایک سجے ہوئے بدخشانی گھوڑے کا اہتمام کیا تھا جس کی باگ خوشحال خان تھام کر چلتا تھا...... اور جس نے ہر مرگ مقام پر مجھے سہارا دیا تھا "کیا واقعی؟"

"ہاں...... اور مجھے بہت حیرت ہوئی کہ اتنی دور دراز وادیوں میں بھی بدخشانی گھوڑوں کے سوار آپ کو جانتے ہیں......"

میں پروفیسر ہاروکا سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ نگیر خان اب کیسا ہے...... کیا کر رہا ہے...... اس کی داڑھی ابھی تک اس طرح نیم وحشی ہے جب وہ جھیل کرومبر کی قربت میں دنیا کی بلند ترین پولو گراؤنڈ میں میرے لئے اپنی پولو سٹک گھماتا تھا اور گول کرتا تھا...... اور شاید اس نے ابھی تک وہ بوٹ سنبھال کر رکھے ہوں جو میں نے درکوت کراسنگ کے بعد اتارے تھے اور اس کی خدمت میں پیش کر دیئے تھے......

چائے کے وقفے کے بعد کانفرنس کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہاں سے پھر شروع ہو گیا...... مصر کے سفیر نے ایک نہایت پر مغز اور شاعرانہ تقریر کی اور میں نے سوچا کہ ہمارے کتنے بلکہ کونسا ایک پاکستانی سفیر ہوگا جو اس نوعیت کی تقریر کرنے پر قادر ہو...... جو کیریئر ڈپلومیٹ ہیں وہ اپنی پھوں پھاں میں رہتے ہیں اور جو سیاسی سفیر ہیں وہ اپنی تعیناتی کے بعد دنیا کے نقشے کا بغور مطالعہ کرتے ہیں کہ یہ کمبخت ملک کہاں ہے جہاں ہماری تقرری کر دی گئی ہے......
اور پھر وہاں پہنچ کر دیگر "مشاغل" میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ لنچ بریک ہوئی تو ہم نے سرینا کے سبزہ زار میں ایک ایسا لنچ نگلا جس کا ذائقہ مدتوں بھلانے سے بھی نہیں بھولتا......

سبزہ زار سے ذرا ہٹ کر نشیب میں مندوبین کے لیے شمال کے مختلف علاقوں کے حوالے سے سٹال سجائے گئے تھے......

یہاں اشرف امان کے برادر سے ملاقات ہوئی جو خوبانیوں کے جیم اور چیری کے شربت سجائے بیٹھے تھے...... حیرت انگیز طور پر اشرف سے مشابہ تھے اور باتونی بھی تھے......
ایک سٹال اہل شمشال نے بھی سجا رکھا تھا جہاں مغنک مظفر اپنی دورافتادہ وادی کے بارے میں معلومات مہیا کر رہے تھے اور فلمیں دکھا رہے تھے۔ اور میں نے ان فلموں کو بہت غور سے دیکھا اور شمشال کو جانے والے جتنے بھی راستے تھے وہ ناقابل عبور لگتے تھے اور بلندیوں پر معدوم ہوتے ہوئے لگتے تھے...... اور انہیں دیکھ کر میں نے تو شمشال کو ترک کر دینے کے بارے میں سوچا لیکن...... سب لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ فلمیں پرانی ہیں...... اب تو شمشال کا سفر آسان ہو چکا ہے...... گھبرانے کی ضرورت نہیں......

یہ تو بہت بعد میں کھلا کہ شمشال تک کا سفر صرف شمشالیوں کے لیے نسبتاً آسان ہوا ہے......

ہم لاہوریوں کے لیے وہ اب بھی مرگ مسافت ہے......
لیکن تب تک میں شمشال کے جال میں آ چکا تھا......

یہ سب کچھ آج صبح ہوا تھا......

یہ کانفرنس کی گہما گہمی...... دوستوں سے ملاقاتیں اس دن کا قصہ تھیں جو گزر چکا تھا...... اور اب شام ہو چکی تھی......

روپل ہوٹل کے ایک کمرے میں ایک ایسی شام ہو چکی تھی جس میں ڈھول بجتے تھے، بانسری کی دھنیں مست ہوتی تھیں اور اس کمرے میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی...... اگر ہوتی تو ہم کسی تل کو وہاں کیوں دھرتے، کسی دوست کو کیوں نہ دھرتے......

تب دروازے پر ایک اور دستک ہوئی......

میں نے سوچا کوئی اور پارٹی ہے......

دروازہ کھولا تو کوریڈور میں ایک اکڑے ہوئے کلف لگے پارٹی ڈریس میں...... سرمہ زدہ آنکھوں اور ایک بل کھاتے ہونٹ کے ساتھ کشور ناہید کھڑی تھی اور اس کے عقب میں جیسے اس کی پناہ میں عکسی مفتی کی کھچڑی اور ثقافت شناس مسکراہٹ تھی "یہ تم نے کیا مجمع لگا رکھا ہے...... گاڈ فادر بنے ہوئے ہو شمال کے...... جہاں جاتے ہو جلسہ کرنے لگتے ہو......"

"یہ کون لوگ ہیں......"

"اندر آجائیں......"

"اندر کون کون ہے......"

"ایک ڈھول والا ہے۔ ایک بانسری نواز ہے اور...... عرق انفعال کے سوا ہر قسم کا عرق ہے...... اندر آجائیں"

"کہاں آجائیں؟...... تم فوراً باہر آجاؤ...... چیف سیکرٹری کے ڈنر پر جانا ہے......"

"مہمان ہیں...... صرف میری خاطر آئے ہیں...... میں کیسے جا سکتا ہوں"

"انہیں رخصت کرو بھئی...... چیف سیکرٹری کا ڈنر ہے...... ادب آداب بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور تم یکسر ان سے عاری ہو...... رخصت کروان کو"

کشور کا یہ خاصا ہے کہ ہر مقام پر...... ہر جگہ پر...... ہر کس و ناکس پر...... خاص طور پر

دوستوں پر...... دھونس جماتی ہے...... وہ یہ دھونس قبول کریں یا نہ کریں...... وہ جماتی ہے...... کیونکہ...... وہ کشور ہے...... وہ ہر مقام پر بتاتی ہے کہ میں کشور ہوں...... لوگ جانیں یا نہ جانیں لیکن وہ بتاتی ہے کہ...... میں کشور ہوں......

"میں اپنے دوستوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا......"

کشور نے اپنے سرمہ زدہ آنکھوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے مجھے بری طرح گھورا...... کیونکہ وہ مجھ سے تین چار ماہ چھوٹی ہے...... بقول اس کے...... اس لئے میں نے اسے ایک "چھوٹی" کے طور پر ٹریٹ کیا اور وہ ناراض ہو کر پاؤں پٹختی چلی گئی......

کل دوپہر عکسی مفتی مجھے اور کشور کو ایک ایسے ٹورسٹ ہوٹل میں لے کر گیا تھا جس کا ذکر بقول اس کے دنیا کی ہر سیاحتی کتاب میں ملتا ہے...... ایک عام سا گلگتی گھر۔ پھاٹک بند اور باہر ایک وارننگ...... اگر آپ یہاں رہائش پذیر نہیں ہیں تو اندر آنا منع ہے...... اگر اندر آنا چاہیں تو گھنٹی بجائیں...... اندر بھی ایک معمولی سی رہائش گاہ جس کے بے ترتیب لان میں ایک گیراج نما ڈھانچے کے سائے میں لمبی میزیں اور لکڑی کے بینچ تھے جن پر چینی، جاپانی، امریکی، انگریز...... سر جھکائے یا تو گائیڈ بکس اور ناولوں کے مطالعے میں محو تھے یا کچھ کھا پی رہے تھے لیکن بے حد خاموشی سے...... جزیروں کی طرح الگ تھلگ...... خوراک جو عکسی نے آرڈر کی فرائی شدہ سبزیوں، چکن اور سوپ پر مشتمل تھی اگرچہ کسی خاص قومیت کی نہ تھی لیکن انتہائی پرذائقہ تھی...... اس ٹورسٹ ہوٹل کا مالک ایک گلگتی تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اس کا یا اس کے ہوٹل کا نام کسی کتاب وغیرہ میں نہ دیا جائے ورنہ لوگ زیادہ آ جائیں گے اور اس کے پاس گنجائش کم تھی...... بقول اس کے وہ اس بات پر ایمان رکھتا تھا کہ اگر ایک غیر ملکی سیاح اس کے علاقے میں پہنچ جاتا ہے تو گویا اس پر احسان کرتا ہے اور اس احسان کا بدلہ اس طرح چکایا جا سکتا ہے کہ اسے اچھی خوراک اور ارزاں رہائش دی جائے اور رخصتی پر چومورو چائے پلائی جائے...... البتہ بعد میں کسی نے گلا کیا کہ گنجائش کے باوجود وہ پاکستانی سیاحوں کو جگہ دینے سے اجتناب کرتا ہے...... کن وجوہات کی بنا پر...... یہ میں نہیں جانتا...... ہو سکتا ہے اس کی وجوہات میں وزن ہو...... ہو سکتا ہے نہ ہو...... کم از کم وہ ہمارے ساتھ نہایت محبت سے پیش آیا اور اس شاندار لنچ کو ہمارے لاکھ اصرار کرنے کے باوجود اپنے

کھاتے میں ڈال لیا......

لنچ کے بعد ہم کارگاہ کا مہاتما بدھ دیکھنے کے لیے گئے......

وہ ابھی تک وہیں تھا، ایک بلند چٹان میں تراشا ہوا...... اس کے بھکشو رخصت ہو چکے تھے اور وہ ابھی تک وہیں تھا...... پچھلے پونے دو ہزار برس سے اس خطے میں مذاہب کی تبدیلی کا گواہ تھا...... کیا ایک اور تبدیلی بھی ممکن ہے...... کون جانے...... لیکن وہ جانتا تھا اور اسی لئے تو ابھی تک وہیں تھا......

کشور جا چکی تھی اور رویل ہوٹل کے مختصر کمرے میں محفلِ شمال جاری تھی...... اور ڈھول بج رہا تھا...... اور اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل اور مخبوط الحواس محقق لٹنر نے بھی ان علاقوں میں ڈھول بجوا کر اہل دردستان کو ان کی بلندیوں سے نیچے بلایا تھا اور پھر ان سے قصے کہانیاں سن کر تحریر کئے تھے...... میں بھی اہل شمال کے قصے کہانیاں سن رہا تھا...... اور میں نے انہی کو بیان کر کے سفرنامے لکھنے تھے۔

افسانہ نگار سعید شیخ حالت حیرانی میں تھے......

سعید شیخ پلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے کبھی اپنی عینک درست کرتے، کبھی مونچھیں سنوارتے اور مسلسل مسکراتے کہ انہوں نے اس سے پیشتر ایسی بے دریغ اور شمالی محبت سے لبریز پارٹی کبھی اٹینڈ نہیں کی تھی...... شیخ صاحب ایک ڈپٹی کمشنری بھگتا کر اب لاہور میں محکمہ جنگلات کی ڈپٹی سیکرٹری شپ کی فائلوں میں بیورو کریٹک گھوڑے دوڑاتے تھے۔ میں نے ان کو ورغلایا کہ جنابِ شیخ ان گھوڑوں کو لگام دیجئے...... انہیں تو ہر کوئی دوڑا سکتا ہے لیکن ہر کوئی شمشال نہیں جا سکتا...... اور وہ اتنے معصوم تھے کہ فوراً ورغلائے گئے اور میرے ساتھ چلے آئے...... اب وہ بھی گلگت میں تھے۔ ندیم، میرے شمالی سفرناموں کو پڑھ پڑھ کر حواس کھو بیٹھے اور ڈیرہ اسماعیل خان سے چلے ہیں تو گلگت آن کر دم لیا...... میں نے انہیں بھی بھرتی کر لیا۔ یہ شمشال کے لیے نئے رنگروٹ تھے...... قدرے مست سے لگتے تھے...... مونچھیں ایسی کہ کچھ جانگلوس سے بھی لگتے تھے...... لیکن ان کی یہ مونچھیں ٹریکنگ کے دوران نہایت کارآمد ثابت ہوئیں۔ جب بھی کسی ہولناک سے مقام پر سے گزرتے تو خوف سے ان مونچھوں کا ایک ایک بال تیر ہو جاتا...... جیسے کنڈیالا خطرے کی بو سونگھ کر اپنے کانٹے کھڑے

کر دیتا ہے...... چنانچہ ہم اس مقام سے سنبھل کر گزرتے...... وہ کوشش کر رہے تھے کہ ان کے سگریٹ کی راکھ جھڑنے نہ پائے...... شاید قالین کا خیال تھا یا کوئی اوا خیال تھا...... نہایت بھولے شخص تھے اور "ناں" ان کا تکیہ کلام تھا...... تارڑ صاحب ناں' میں ناں...... جہاز پر بیٹھا ناں تو بہت ڈر آیا ناں کہ کہیں نانگا پربت سے ٹکرا نہ جائے ناں......سُوٹا لگائیں ناں......

موسیقار شینا زبان میں کوئی لوک گیت الاپ رہے تھے جو شاید کسی حسینہ کے حُسن کی توصیف میں تھا...... پھر کسی نے ترجمہ کیا تو معلوم ہوا کہ نہیں...... کسی مارخور کے سینگوں کی تعریف ہو رہی ہے......

ڈھول کی تھاپ میں ایک گونج سی پیدا ہوئی اور پورا کمرہ دھک دھک دھمکنے لگا...... ایک دو حضرات نے کچھ نعرے سے بلند کئے اور اٹھ کر رقص کرنے لگے...... فیئری میڈو کے رحمت نبی نے جو چلاسی رقص پیش کیا اس میں ایک بہت الگ اور جدا سی ردھم تھی جیسے وہ دردستان کے قدیم زمانوں سے سفر کرتی ہوئی ہمارے کمرے میں آگئی ہو...... ایک بھرپور مردانگی والا رقص جس میں ایک کتھا کلی کے رقاص ایسی پرفیکشن تھی...... میں اہل دیامیر کو روکھے سوکھے اور فن کی نزاکتوں سے دور سمجھتا تھا لیکن وہ تو چھپے رستم نکلے...... رحمت نبی کے رقص نے ہمیں مبہوت کر دیا......

اکرام بیگ نے بھی ہنزہ کا ایک قدیم اور روایتی رقص پیش کیا اور خوب داد وصول کی...... اس دوران ان دونوں پر نوٹ نچھاور کئے گئے...... اور شمال میں داد دینے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ایک نوٹ لہراتے ہوئے اٹھیں اور اپنے دوست رقاص کے گرد ایک گھمن گھیری سی کھائیں اور پھر اس کی ٹوپی میں نوٹ اڑس دیں...... نچھاور کئے گئے نوٹ موسیقاروں کی خدمت میں پیش کر دیے گئے......

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ رقص تو زنانہ کام ہے...... اور صرف عورتوں پر سجتا ہے تو اسے اکرام اور خاص طور پر رحمت نبی کا رقص دیکھنا چاہیے...... پھر وہ یہ کہے گا کہ رقص تو صرف مردوں پر ہی سجتا ہے......

"واہ جی واہ...... بادشاہو کمال کر دتا جے......" میں نے لاہوری انداز میں رحمت نبی کو داد دی...... "میرا خیال تھا کہ چلاس کے آس پاس رہنے والے پتھر دل ہوتے ہیں اور انہیں

رقص و نغمہ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی......"

"ہم اپنے جذبات کی نمائش نہیں کرتے...... ہنزہ والوں کی طرح" اس نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا......

"رحمت نبی......" اکرام بیگ فوراً ہوشیار ہو گیا "ہم ہنزہ والوں کی زبان نہ کھلواؤ...... ورنہ ہم تارڑ صاحب کو چلاسیوں کے لطیفے سنائیں گے......"

"اکرام بیگ......" رحمت نبی نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا "لطیفے تو ہم بھی سنا سکتے ہیں لیکن ان میں کچھ پردہ نشینوں کے نام آجائیں گے اور ہنزہ والے برا مان جائیں گے۔"

"اوہو یہ تو علاقائی اور لسانی فسادات شروع ہونے کو ہیں......" میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر صلح کی درخواست کی جو بلند قہقہوں کے دوران فوراً قبول کر لی گئی "اس محفل میں کوئی ایسا لطیفہ نہیں سنایا جائے گا جس سے حاضرین میں سے کسی کی دل آزاری ہو......"

"تو پھر سائیں سکھوں کے لطیفے ہو جائیں......" بقا بہت دیر بعد کسی گوشے میں سے بولا۔

"ناں سائیں اس طرح تو تارڑ صاحب کی دل آزاری ہو گی ناں......" ندیم اپنے سگریٹ پر جھکا تو جھکتا چلا گیا......

"بہت اچھے بھئی بہت اچھے" میں ہنسنے لگا "ہونہار رنگروٹ کے چکنے چکنے پات......"

"یہاں کوئی بگروٹ کا تو نہیں" ایک صاحب نے حاضرین کو ذرا قریب ہو کر چیک کیا......

"بگروٹ؟"

"گلگت کے قریب ہے...... راکاپوشی کی سائیڈ پر نہایت خوبصورت وادی ہے تارڑ صاحب" فضل احمد بولے "وہاں کے لوگوں کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے مشہور ہیں......"

"یقیناً بگروٹیوں نے بھی گلگت والوں کے بارے میں طرح طرح کے لطیفے بنائے ہوں گے"

"یقیناً......"

"چونکہ یہاں کوئی بگروٹی موجود نہیں اس لئے ان کے لطیفے سنائے جائیں...... مثلاً......"

"مثلاً یہ کہ ایک بگروٹی پہلی بار مسجد میں گیا تو مولوی صاحب حرام اور حلال پرندوں کا مسئلہ بیان کر رہے تھے......اس دوران ایک ہوائی جہاز اوپر سے گزرا تو بگروٹی نے کہا' مولوی صاحب باقی پرندوں کو چھوڑیں......یہ فرمائیں کہ یہ پرندہ جو اُڑتا جا رہا ہے حلال ہے کہ نہیں......"

اگرچہ یہ لطیفہ مجھے کوئی بہت زیادہ لطیفہ نہ لگا لیکن مقامی پبلک ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی......یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی لطیفہ جب کسی خاص قوم سے منسوب کیا جائے تو اس قوم کی قربت میں رہنے والے اور اس کے مزاج کو سمجھنے والے ہی اس سے پوری طرح تکلیف اندوز ہو سکتے ہیں......انگریز' سکاٹ لینڈ کے باشندوں پر ہنستے ہیں اور جرمن' فرانسیسیوں کا مزاق اڑاتے ہیں......ایک مرتبہ جب میں نے اپنے قدیمی دوست سکھدیپ سنگھ کو سکھوں کے چند لطیفے یہ کہہ کر سنائے کہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک ہندو لالہ جی تھے تو وہ......صرف اس لئے کہ اس کا دل نہ دکھے تو دو چار لطیفوں کے بعد وہ تنگ آ کر بولا "اوئے چودھری مجھے بیوقوف بناتا ہے......سرداروں کے لطیفے لالوں کے نام سے سناتا ہے۔ اوئے جب تک لطیفے میں سکھ نہ آئے سواد نہیں آتا......"

"ہاں جی ایک اور ہو جائے......"

"ایک مرتبہ بگروٹیوں نے ایک گائے کو حلال کرنا تھا......اور چھری نہیں مل رہی تھی...... تو چھری کی تلاش ہوئی...... ایک بگروٹی مکان کی چھت پر گیا تو وہاں چھری مل گئی......اس نے وہیں سے پکارا کہ...... چھری تو یہاں ہے' گائے کو اوپر لے آؤ"

یہ لطیفہ واقعی ایک کلاسیک تھا اور عوام الناس نے فلک شگاف قہقہے لگائے......

ان بلند قہقہوں کے رد عمل میں موسیقار ناراض ہو گئے اور ڈھول اور بانسری کو فوراً موقوف کر دیا "تارڑ صاحب بڑے افسوس کی بات ہے کہ آپ لوگ گلگت کی ثقافت کو سنجیدگی سے نہیں لیتے......ہم لوگ اتنی دیر سے ثقافتی مظاہرہ کر رہے ہیں اور آپ سن نہیں رہے" انہوں نے اپنے ساز اٹھائے اور ہماری منت سماجت کے باوجود محفل سے واک آؤٹ کر گئے۔

"میرا خیال ہے یہ بھی بگروٹی تھے"......کسی نے کہا۔

"ناں......میں تو بگروٹی نہیں ہوں ناں......" ندیم نے ایک جھٹکے سے سگریٹ پر جھکا سر اٹھایا اور مسکرانے لگا......

رات بہت بیت چکی تھی......

کھلی کھڑکی میں سے گلگت کی چٹانیں رات کی سیاہی میں مہیب فصیلوں کی مانند بلند ہو رہی تھیں......ان کے عقب میں کہیں پہلی تاریخوں کا چاند گدلایا ہوا گم سم تھا اور اس کی بے نام روشنی سے چٹانیں اُن سیاہ دیوتاؤں کے روپ دھارتی تھیں جو انسانی خون کی قربانی کے عادی ہوتے ہیں......

اور اس لمحے مجھے شمشال کا خیال آیا......میں اسے......جس کے لیے میں گھر سے نکلا تھا......میں اس وادی کو محبت اور سرخوشی کی ایک شام میں ڈوب کر فراموش کر چکا تھا......اور میں اس لمحے سب سے الگ ہو گیا...... شمشال...... کسی افغان کارواں سرائے کی کچی گنبد دار کوٹھڑی کی تاریکی میں یکدم جل اٹھنے والا ایک دیا تھا......اور اس نے میرے بدن کی کچی مٹی کی کوٹھڑی کو روشن کر دیا......لوگ کہتے تھے کہ اس وادی کا راستہ جتنا جان لیوا ہے اس کی خوبصورتی اس پیمانے کی نہیں......اِٹس ناٹ ورتھ اِٹ......کسی نے کومنٹ کیا تھا......تو پھر میں وہاں کیوں پہنچنا چاہتا تھا......یہیں گلگت میں دوستوں کے درمیان کیوں نہ رہوں جہاں ہر شب......شب برات ہو گی......

تو میں وہاں کیوں جانا چاہتا ہوں......اس کے باوجود کہ وہاں تک کا راستہ شمال کی تمام وادیوں کی نسبت زیادہ پر خطر ہے اور صرف شمشالی ہی اس پر چل سکتے ہیں اور اس وادی میں کوئی خاص بات بھی نہیں تو پھر میں وہاں کیوں جانا چاہتا ہوں......

اس لیے کہ......وہ وہاں ہے......

جیسے کوہ پیما جارج میلوری سے پوچھا گیا تھا کہ تم ایورسٹ پر کیوں جانا چاہتے ہو تو اس نے وہ فقرہ کہا تھا جو اب ایک ضرب المثل بن چکا ہے کہ......اس لئے کہ وہ وہاں ہے......

اسی طرح......میں بھی شمشال جانا چاہتا تھا......

اس لئے کہ......وہ وہاں ہے۔

”زیرو پوائنٹ اور گھاس میں گرے زرد سورج“

”زیرو پوائنٹ......“ فضل احمد نے ہاتھ کھڑا کر کے ڈرائیور کو اپنی ٹیوٹا کوسٹر کو روکنے کا اشارہ کیا......

”زیرو پوائنٹ......“ پچھلی نشست پر براجمان سعید شیخ چونک گئے ”اسلام آباد آگیا ہے“

”نہیں......“ فضل صاحب نے اپنے اللہ کے فضل سر پر ہاتھ پھیر کر قہقہہ لگایا ”یہ ہنزہ کا زیرو پوائنٹ ہے“

ہم کوسٹر سے باہر آگئے......

گلگت سے نکل کر...... ہنزہ کی جانب شاہراہ ریشم پر سفر کرتے ہوئے ایک ایسا مقام جہاں دریائے ہنزہ...... ہم سے بہت نیچے...... ایک وسیع پھیلاؤ میں...... اور اس کے پار...... اور ایک طویل فاصلے پر اس کی وسعت پر جھانکتے اور جھکتے پہاڑ جن کی چوٹیوں پر سفید برفیلی شرارتیں تھیں اور ان کے اندر سرسبز وادیاں تھیں جو گلیشیر ندیوں سے سیراب ہو کر شوخ ہوتی تھیں اور دھند سے لپٹ لپٹ جاتی تھیں...... ایک ایسا منظر جو تاحد نظر تھا...... وسیع پھیلاؤ والا تھا اور ٹھنڈک کی صداؤں والا تھا...... اور ہم ریت کے چند ذرّے تھے جو ہنزہ روڈ پر منہ اٹھائے اسے دیکھتے تھے...... ہوا میں خنکی لاجواب تھی...... یقین نہیں آتا تھا کہ زندگی میں کوئی ایک سانس بھی ایسا نصیب ہو سکتا ہے جیسا یہاں ہر اک سانس تھا...... تازہ کھنکتا ہوا...... (ٹھنڈک ایسی جیسے لمبی جدائیوں کے بعد کسی عشق خاص کو گلے لگا لیا جائے)......

”اس مقام کو زیرو پوائنٹ کیوں کہتے ہیں؟“ سعید شیخ نے فوراً ایک بیورو کریٹک

انکوائری شروع کر دی......

”یہ میرے...... اپنے ذاتی زیرو پوائنٹ ہیں شیخ صاحب...... جہاں میں ہنزہ کے راستے میں ہمیشہ رکتا ہوں......“ فضل کے چہرے پر ہمفری بوگارٹ ایسی جنسی کشش کی حامل ٹف جھریاں تھیں جو کسی بھی خاتون کو گیلا کر سکتی تھیں......

ہمارے سامنے...... دریائے ہنزہ کے پھیلاؤ کے اوپر...... ایک غبار آلود اور سرد مزاج کا طوفان تھا...... گرد آلود سرد ہواؤں میں بلند ہوتا ہوا...... دھیرے دھیرے اس کے بہاؤ پر حرکت کرتا ہوا......

فضل صاحب نے منرل واٹر کی ایک بوتل کا ڈھکن گھما کر کھولا اور پیپر کپس کو لبریز کرتے ہوئے ہمیں تھمانے لگے ”آپ کو پیاس لگی ہو گی...... راستے میں صرف گلیشیر کا پانی ملتا ہے اس کے پینے سے گلا خراب ہوتا ہے...... یہ پانی ذرا گرم ہے...... اور اس سے ہاضمہ بھی درست رہتا ہے“ ہم اپنا ہاضمہ درست کرنے لگے......

منظر مزید پرکشش اور وسیع ہوتا گیا......

سیاحت کانفرنس کا آج دوسرا دن تھا...... ہوٹل روپل میں اختتامی اجلاس کے بعد مندوبین کو کوچز میں بھرا گیا اور کریم آباد ہنزہ کی جانب شاہراہ ریشم کے راستے روانگی ہو گئی...... فضل صاحب نے اپنا کاروبار...... اپنا گھر بار چھوڑا اور کہنے لگے ”آپ میرے ساتھ چلیں گے۔“

”آپ کو ہنزہ جانا ہے؟“

”نہیں...... لیکن آپ نے جانا ہے تو میں نے بھی جانا ہے...... اکٹھے سفر کریں گے تو لطف رہے گا“

چنانچہ اب ہم ہنزہ کے راستے میں زیرو پوائنٹ پر کھڑے تھے اور کانفرنس کے مندوبین ہاتھ ہلاتے‘ شور مچاتے اپنی کوچز میں ٹھنسے...... حیران ہوتے کہ یہ یہاں کیوں کھڑے ہیں...... ہمارے پاس سے گزر رہے تھے...... اور ہم اپنے پیپر کپس بلند کر کے انہیں چیئرز کہہ رہے تھے...... اگرچہ ان میں گلیشیر کے پانی کی نسبت گرم پانی تھا اور سادہ پانی تھا......

آج صبح خالد ندیم وارد ہو گیا...... "کے ٹو کہانی" میں تھنگل سے بیمار ہو کر واپس سکردو چلا جانے والا خالد ندیم...... "یاک سرائے" اور "سنولیک" کا ساتھی خالد ندیم جو مجھ سے کہیں بڑھ کر شمال کا اسیر ہوا...... اور اتنا ہوا کہ لاہور شہر میں حبیب بینک کی افسری ترک کر کے گلگت میں اسی بینک کی برانچ میں چاکری کر لی تھی...... گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنے بیوی بچوں کو بھی ایک چھوٹی مہران سوزوکی میں لاد کر...... اور اپنا گھریلو سامان لاد کر گلگت لے آیا تھا...... اور اب ایک ایسے مکان میں رہتا تھا جس کے صحن میں سیب' ناشپاتی اور چیری کے درخت تھے...... خوبانی کا صرف ایک درخت تھا اور بہت بلند اور بڑے گھیرے والا تھا...... اتنا اونچا تھا کہ اس پر آویزاں خوبانیوں کو ہاتھ بڑھا کر توڑا نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی اس پر چڑھ کر انہیں حاصل کیا جا سکتا تھا...... صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ آپ دعا کے انداز میں اپنے ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو جائیں اور کسی خوبانی کے گرنے کا انتظار کریں۔ شنید ہے کہ جب ذرا سی ہوا چلتی تھی تو خالد ندیم...... اس کی بیگم اور دونوں بچے اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ دعا میں بلند کرتے تھے اور لب پہ آتی ہے دعا بن کے خوبانی میری...... گنگنانے لگتے تھے...... جھونگے کے طور پر ایک برفانی نالی بھی گھر کے بیچوں بیچ بہتی تھی...... اُس سے زیادہ یہ ہماری بد قسمتی تھی کہ وہ بینک میں جُون کلوزنگ کے باعث ہمارے ہمراہ شمشال نہیں جا رہا تھا لیکن وہاں جانے کی تمام تر تیاریوں میں بھرپور حصہ لے رہا تھا...... اور ہم سے زیادہ پر جوش تھا...... وہ اور بقا کل سارا دن گلگت کے بازاروں میں اس ٹریک کے لیے خریداری کرتے رہے تھے...... معمول کی خریداری' آٹا' چاول' دالیں' سبزیاں' ٹافیاں' انرجائل' بسکٹ' ٹین بند خوراک وغیرہ...... خالد کہتا کہ بقا بھائی تھوڑی سی شکر ضرور خریدو...... وہ کہتا کہ تم تو ساتھ نہیں جا رہے تو فائدہ...... اس پر خالد روٹھ کر کہتا' لیکن میں تصور میں تو لاؤں گا ناں کہ تم میرے بغیر ابلے ہو چاولوں میں دیسی گھی لگا کر ان پر شکر چھڑک کر کھا رہے ہو......

خوراک اور دیگر ضروریات ٹریک کے تین بڑے کارٹن...... رسیوں سے بندھے ہوئے...... اب فضل صاحب کی ویگن کے پچھلے حصے میں تھے اور ہمارے ہم سفر تھے......

کل شام سرد ہوا میں جھومتے اشجار نے...... گلگت کی رات کی سیاہی میں سے ابھرتی دیو ہیکل چٹانوں نے اور بدن سے شرارت کرنے والی ٹھنڈک نے ہمیں اپنے طلسم سے بے بس کر کے باندھ لیا...... ہم ان کی قید میں تادیر رہے اور آزاد ہونے سے ڈرتے تھے...... دراصل کل شام فضل احمد کے ماموں رحیم بیگ نے مجھے اور اکرام کو گلگت سے ذرا باہر سلطان آباد میں اپنی رہائش گاہ میں مدعو کیا...... سڑک سے اوپر ایک گاؤں کی نہایت تنگ اور پتھریلی دیواروں سے بھنچی ہوئی گلیوں کے اندر ٹیوٹا کوسٹر کندھے مارتی بچتی بچاتی پتہ نہیں کس طرح گئی...... رحیم بیگ کا گھر ابھی مزید بلندی پر تھا...... اور نیچے ڈھلوان پر مہمان خانہ تھا اور اس کے آگے تہہ در تہہ شالیمار باغ کے تختوں کی مانند سبزہ زار تھے' پھلدار درختوں کے جھنڈ تھے...... کسی برفانی نہر کی آواز دور سے آتی تھی اور سرو کے بہت ہی اونچے درخت نیم سیاہ آسمان میں گم ہوتے تھے...... یہ جو ماموں جان تھے یہ تقریباً فضل کے ہم عمر تھے یعنی فضل کے نانا جان کی ثابت قدمی کے مظہر تھے...... وہ کبھی کبھی مکمل طور پر ماموں ہو جاتے اور فضل کو باقاعدہ جھڑک دیتے کہ...... بھانجے چپ رہو۔

اس پر بھانجے اپنے فارغ البال سر پر ہاتھ پھیر کر نہایت برخورداری سے اس سر کو جھکا کر کہتے...... ٹھیک ہے ماموں!

یہ بھی ایک یادگار گلگتی شام تھی......

"یہاں ہمارے ہاں گلگت کی نسبت موسم ٹھنڈک میں رچا ہوتا ہے" ماموں نے ہماری ہر قسم کی تواضع کرتے ہوئے کہا "یہ پوری پہاڑی ہماری ملکیت ہے۔ ہمارے دادا نے شاید پانچ سو روپے میں خریدی تھی تو برادری والے کہتے تھے کہ انہوں نے پتھروں کو پورے پانچ سو روپے خرچ کر کے خریدا ہے کیسے بیوقوف ہیں...... پھر یہاں سے شاہراہ ریشم چل نکلی...... اور گلگت شہر پھیلتا ہوا اس کے کناروں سے آ لگا......"

گٹھے ہوئے بدن کے رحیم بیگ...... گھنگھریالے اور گھنے سیاہ بالوں والے ماموں...... نہایت چلبلی طبع اور مہمان نواز خصلت کے تھے...... حالانکہ ٹھیکیدار تھے......

"تو پانچ سو روپے میں یہ پورا علاقہ مہنگا نہیں......" میں نے مسکراتے ہوئے کہا......

"ویسے ماموں...... ہم نے تو یہ بھی سنا تھا کہ اس علاقے کو آپ کے بزرگوں نے

جوتوں کے ایک جوڑے کے عوض حاصل کیا تھا......" اکرام بیگ جس کرسی میں بیٹھا تھا اس میں ہمیشہ ایک اور شخص کے بیٹھنے کی جگہ بچ جاتی تھی۔

"ہاں یہ بھی کہتے ہیں لیکن درست نہیں...... اگر ایسا بھی ہوتا تو بعید از قیاس نہیں...... صرف پتھروں کے لیے ان زمانوں میں ایک جوتا کون دیتا تھا جب کہ پیشتر لوگ ننگے پاؤں پھرتے تھے یا بھیڑ بکریوں کی اون کے موزے پہن کر گزارہ کرتے تھے......"

یہ گلزار جو رات کی تاریکی میں تھا اور اس میں یقیناً کہیں گل بھی تھے جن کی مہک ہوا کے دوش پر چلی آتی تھی...... تہہ در تہہ صورتوں میں نیچے شاہراہ ریشم تک پہنچتا تھا......

آسمان پر ہلکے بادل تھے اور ٹھنڈک کی آسودگی کی کتابیں ورق در ورق ہمارے بدنوں میں کھلتی تھیں...... جیسے کسی پرندے پر چپکے سے ہتھیلی رکھ دو تو اس کی پھڑپھڑاہٹ قسمت کی لکیروں میں سفر کرتی ہے اور انگلیوں کی پوروں تک جاتی ہے...... جیسے لامبی پلکیں سینے پر بند ہوتی اور کھلتی ہیں......

رحیم بیگ کا نہایت جدید وضع رکھنے والا نوجوان بیٹا...... بے حد مؤدب ہو کر ہمارے سامنے رکھی میز کو مشروبات' خوراک اور سلاد کی ڈشز سے سجاتا تھا...... وہ کراچی میں زیر تعلیم تھا اور گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گھر آیا تھا......

ایسی شامیں جو نایاب ہوتی ہیں' زندگی میں کم آتی ہیں...... ان میں ایک تو خوشگوار رفاقت کا لطف ہوتا ہے...... ماحول اور خوراک کا اثر ہوتا ہے...... لیکن یہ اتنی قیمتی ہوتی ہیں کہ انہیں ان سب چیزوں سے الگ ہو کر بھی اپنے اندر اتارنا چاہئے...... جیسے ایک پینٹنگ ہو...... خالد اقبال کی...... جیسے ایک شعر ہو غالب کا...... جیسے ایک مجسمہ ہو گندھارا عہد کا......

آپ دوستوں کے ساتھ بھی ان سے خوشی حاصل کر سکتے ہیں لیکن ان کے ساتھ تنہا بھی ہونا چاہتے ہیں...... ایسے ہی کوئی ایک شام ہوتی ہے......

تو یہ ایک ایسی ہی شام تھی...... میں کچھ لمحوں کے لیے الگ ہونا چاہتا تھا...... چنانچہ میں نے کوئی بہانہ بنایا کہ وہاں نیم تاریکی کے پار کیا ہے ذرا دیکھوں تو سہی...... اور ذرا پرے ہوا...... میں ذرا الگ ہوا...... وہاں تک گیا جہاں آوازیں مدھم ہو کر پہنچتی تھیں اور گھاس بے ترتیب تھی...... وہاں خوبانی کا ایک بہت اونچا شجر تھا...... خالد کے گھر کی طرح...... اور

س کے نیچے گھاس پر سینکڑوں پکی ہوئی خوبانیاں بکھری ہوئی تھیں...... بے شمار زرد سورج تھے سبزے کے جنگل میں اٹکے ہوئے...... زرد جگنو تھے گھاس میں پڑے ٹمٹماتے ہوئے......

ر میں نے ان میں سے ایک کو جھک کر اٹھایا' ذرا جھاڑ پونچھ کر منہ میں ڈالا تو اس کی حلاوت ازہ گرم گڑ کی طرح میرے بدن میں گھلتی گئی...... میں ایک ایسے ندیدے بچے کی طرح جو کسی غ کی دیوار چوری چھپے پھاند کر آیا ہو...... یہ پرواہ کئے بغیر کہ شاید یہ اَن دھلی خوبانیاں کھانے سے میرا پیٹ خراب بھی ہو سکتا ہے' انہیں اٹھا اٹھا کر کھانے لگا...... اور اس لمحے میں نے جھیل کرومبر کے پانیوں کو یاد کیا...... شاہ گوری کے نیل میری یادداشت میں ابھرے...... نولیک پر بادبانی کشتیاں پھر سے رواں ہوئیں...... اور میں نے اپنے گھر کو یاد کیا...... اور میں ب عجیب مستی میں تھا...... میں پوری شب اس کیفیت میں گزار سکتا تھا......

واپس آیا تو فضل کہنے لگے "تارڑ صاحب...... آپ جانتے ہیں کہ ماموں کو ہنزہ کا ترین...... یعنی نمبر وَن رقاص کہا جاتا ہے؟"

میرے لئے یہ اطلاع بہت حیرت ناک تھی کیونکہ جہاں سے میں آیا تھا وہاں اگر کوئی مانجا اپنے ماموں کے بارے میں یہ کہے کہ جناب میرے ماماجی گوجرانوالہ کے بہترین ناچنے الے ہیں تو ماماجی اسے پہلے تو متعدد جھانپڑ رسید کریں گے کہ مجھے ناچا کہتے ہو اور پھر بھانجا بن سے عاق کر دیں گے......

"واقعی؟"

"نہیں نہیں......" رحیم بیگ ذرا شرما گئے "بھانجا مزاق کرتا ہے...... یہ خود بہت اچھا ناچتا ہے...... ناچو بھانجے"

بھانجا ناچنے لگا...... لیکن ناچنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں چنانچہ فضل نے کوکا کولا ا گلاس اٹھا کر اسے ماتھے سے لگایا پھر ہنزہ کی روایت کے مطابق سب کو جھک کر سلام کیا ر پھر رقص کرنے لگا......

فضل احمد کو میں نے پہلی بار "پاک سرائے" کے زمانے میں...... جب ڈاکٹر نیامت شاہ دھی رات کو مجھے چناران سے اٹھا کر ان کی رہائش گاہ پر لے گئے تھے...... رقص کرتے دیکھا تھا...... ان کی حرکت میں ایک کمال کا تناسب' توازن اور ردھم تھی...... موسیقی کی تال پر وہ

زندگی کی ان دھڑکنوں کا حساب رکھتے تھے جو گزر جاتی ہے اور پھر نہیں آتی......اور ایک ایک دھڑکن کا حساب رکھتے تھے...... ہم سب ان کی تال کے ساتھ ایک آہستہ ردھم کے ساتھ تالیاں بجانے لگے......اور وہ گلاس کو ماتھے سے چھو کر ہمارا شکریہ ادا کرتے......

"آجائیں ماموں......" انہوں نے گلاس کو فضا میں بلند کر کے پکارا......

"آجائیں ماموں......" ہم سب نے بھی پرزور فرمائش کی......

"نہیں......" انہوں نے آمادگی کا ایک ایسا "نہیں" کہا کہ اک بار پھر کہو ذرا......اور ہم نے ایک بار نہیں کئی بار کہا کہ...... آجائیں ماموں...... آجائیں......

اور ماموں اٹھے......اور ایک ایسی عمر میں...... جسے میں زندگی اور سرخوشی کا اختتام سمجھ بیٹھا تھا...... بازو بلند کر کے...... ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے یوں رقص میں آئے کہ ہمیں یقین آگیا کہ وہ ہنزہ میں کم از کم نمبر وَن ہیں......

"تمہیں کیسا لگتا ہے جب تمہارے آبو ناچتے ہیں......" میں نے ان کے بیٹے سے پوچھا......

"بہت اچھا لگتا ہے" اس نے بڑے فخر سے جواب دیا......

ادھر ہم ذرا گنگنانے کی کوشش کریں تو ہمارے برخوردار تیوڑی چڑھا کر کہتے ہیں: ابو پلیز...... یہ کیا مراثی پُنا شروع کر دیا ہے۔

یہ ایک ایسی شام تھی جس کا میں لاہور میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسلام آباد اور کراچی میں بھی میں نے بہت ہائی ٹیک اور ہائی برو پارٹیز اٹینڈ کی ہیں، لیکن یہ شام...... ایسی شام کے لئے شرائط تھیں...... شمال کی سرد ہوا...... شاید صرف ایک جوڑا جوتوں کے عوض حاصل کی گئی ایک پہاڑی...... تہہ در تہہ اترتے گل و گلزار...... ایک برفانی نہر کے بہاؤ کی مدھم آواز...... مسرت کو گناہ نہ سمجھنے کے خوف سے آزادی...... زندگی، جیسے زندگی ہونی چاہیے کہ کیا بھروسہ دم کا یہ دنیا فانی......اور بہت ساری محبت...... اور ہاں ایک تناور شجر خوبانی کا اور اس کے نیچے گھاس میں گرے زرد سورج......

"آخری زیرو پوائنٹ...... ہنزہ کا قدیم ترین کنواں"

ہم زیرو پوائنٹ پر رکے ہوئے تھے اور کانفرنس کے مندوبین کی گاڑیاں فراٹے بھرتی وئی ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔

"چلیں تارڑ صاحب......" فضل احمد نے کہا "ابھی کچھ اور زیرو پوائنٹ بھی راستے میں ہیں۔"

کریم آباد کی جانب سفر پھر شروع ہو گیا......

"تارڑ جی......" پچھلی نشست پر براجمان سعید شیخ کا ہاتھ میرے کندھے پر آیا "میں اَج گلگت سے باہر آیا ہوں، تو ہنزہ روڈ پر سفر کرتے ہوئے میں پہلی بار ان عجیب بلندیوں اور ان پر جمی برفوں اور وسعتوں کو دیکھ رہا ہوں...... اور مجھے اب اندازہ ہوا ہے کہ اگر آپ ہر برس ادھر آنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں تو کیوں بے چین ہوتے ہیں، کیا مقام ہیں۔"

"یہ تو کوئی مقام نہیں حضرتِ شیخ...... جہاں شاہراہ کا اختتام ہو گا...... پھر پہاڑوں کے اندر جیپ روڈ کا اختتام ہو گا......اور پھر وہاں سے وادئ شمشال کا پیدل سفر شروع ہو گا...... اصل مقام تو وہ ہو گا...... اِسے تو ہر کوئی دیکھتا ہے...... اُسے صرف ہم دیکھیں گے...... وہی مقام ہو گا۔"

حضرت شیخ چپ ہو گئے۔

اس لئے کہ وہ فارغ ہو گئے تھے۔

گلگت میں قیام کے دوران انہوں نے جس کسی سے بھی یہ تذکرہ کیا کہ اس کانفرنس کے اختتام کے بعد میں تارڑ صاحب کے ہمراہ شمشال جا رہا ہوں تو اس نے ان کے کان میں

یہی سرگوشی کی کہ ...... جناب یہ آپ کس کی باتوں میں آگئے ہیں۔ تارڑ صاحب تو یہی کام کرتے ہیں۔ لوگوں کو بہکاتے ہیں کیونکہ خود بہکے ہوئے ہیں۔ یہ وادئ شمشال...... ہم خود یہاں کے رہنے والے ہیں اور آج تک وہاں نہیں گئے۔ جناب ہم بھی ادھر جانے سے گھبراتے ہیں۔ دریائے شمشال کے اوپر بھر بھرے راستے اور چٹانیں ہیں جن پر پرندے بھی نہیں اترتے تو آپ کدھر جارہے ہیں۔

چنانچہ سعید شیخ کی مونچھوں پر تھوڑی سی اوس پڑ گئی۔ وہ ذرا مدھم ہوگئے' سوچوں میں گم ہوگئے۔ کھوئے کھوئے سے رہنے لگے...... اگرچہ انہوں نے اظہار نہیں کیا لیکن مجھے محسوس ہوگیا کہ وہ شمشال کا نام آنے پر ذرا بچ کے نکل جاتے ہیں اور یہ اچھی نشانی نہیں تھی۔

پہلی وارننگ بقانے دی "یہ آپ کے شیخ صاحب شمشال نہیں جائیں گے......"

"کیوں؟"

"ہر ایک سے معلومات حاصل کرتے ہیں شمشال کے راستے کی اور پھر دیر تک سر ہلاتے رہتے ہیں۔" میں نے ان سے براہ راست پوچھ لیا "شیخ جی کوئی مسئلہ ہے؟"

"مسئلہ تو کوئی نہیں" وہ کہنے لگے "لیکن میں کچھ علیل ہوں اور سیکرٹری صاحب سے صرف ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا تو مسئلہ تو کوئی نہیں لیکن......"

"شیخ صاحب ویرانوں اور کوہستانی بلندیوں میں بھٹکنے کے لئے نہ تو عمر کی قید ہے اور نہ صحت کی...... ایک گورا ایک ٹانگ سے کنکورڈیا چلا گیا تھا...... صرف ذہنی طور پر انسان کو تیار ہونا چاہیے۔ چھٹی کی ذمہ داری میری...... صحت آپ کی بہتر ہوگی تو روانہ ہوں گے...... لیکن صرف اس صورت میں اگر آپ دل و جان سے جانا چاہتے ہیں اور اگر آپ ذہنی طور پر ہی تیار نہیں ہو رہے تو پلیز بے شک نہ جائیے...... مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔"

"ہاں! میرا خیال ہے کہ......" وہ گردن پر کھجلی کرتے ہوئے بولے "ہاں......"

چنانچہ سعید شیخ ہمارے لیے بھگت گئے تھے۔ فارغ ہوگئے تھے...... شمشال نہیں جارہے تھے' ہمارے ہمراہ کریم آباد تک جارہے تھے اور وہاں کانفرنس کا آخری اجلاس اٹینڈ کر کے گلگت کے راستے لاہور کی راہ لے رہے تھے اور مجھے ان سے کوئی گلہ نہ تھا...... میں انہیں اب بھی

بہکا سکتا تھا' ورغلا سکتا تھا لیکن اگر وہ ہمت ہار گئے تھے تو انہیں ساتھ لے جانا مناسب نہ تھا...... دانش مندی نہ تھی اور یہ دانش مندی ہمارے بہت کام آئی...... بعد میں شمشال کے راستوں پر اٹکے ہوئے...... شاید شیخ صاحب نے اپنے لیے اور ہمارے لئے بھی...... بہتر فیصلہ کیا تھا۔

"رکو......" فضل احمد نے پھر اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

شاہراہ ریشم کے بلند پہاڑوں سے غل مت کے چشمے بہتے ہوئے نیچے آرہے تھے۔ چٹانوں اور جھاڑیوں میں اترتے' ٹھنڈے ٹھار اور برفیلے پانی۔

"ایک اور زیرو پوائنٹ......" فضل صاحب نے اعلان کیا۔

میں سڑک کے کنارے حفاظتی دیوار پر چڑھ کر ذرا اوپر گیا اور جھک کر پانی پینے لگا تو فضل نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ "نہیں تارڑ صاحب! یہ پانی بہت ٹھنڈا ہے۔ اس میں گرم پانی ملا کر پئیں ورنہ گلا خراب ہو جائے گا۔"

میرا چونکہ پیشہ ہی بولنا تھا اس لئے میں اپنا گلا خراب کرنے کا خطرہ کیسے مول لے سکتا تھا' فوراً مان گیا۔

ہمیں ان برفانی چشموں کی قربت میں رکا ہوا دیکھ کر کانفرنس کے آفیشل ڈاکٹر صاحبان جو دیگر مندوبین کا پیچھا کر رہے تھے رک گئے...... وہ بھی اپنا گلا خراب نہیں کرنا چاہتے تھے کہ خود ڈاکٹر تھے اس لئے انہوں نے بھی منرل واٹر کو چشمے کے پانی کے ساتھ ملا کر اپنے آپ کو سیراب کیا اور خوش ہوگئے...... اور جب بہت ہی خوش ہوگئے تو اپنے ہتھیار نکال کر کہنے لگے "تارڑ صاحب لائیے آپ کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہیں......"

"لیکن مجھے تو کوئی حاجت نہیں...... ہر شام ایک گولی پھانک لیتا ہوں اور نارمل رہتا ہوں۔"

"آپ کو بے شک حاجت نہیں لیکن ہم کانفرنس کے آفیشل ڈاکٹر ہیں اور آپ ایک معزز مندوب ہیں' ہم آپ کا بلڈ پریشر چیک نہیں کریں گے تو اور کس کا کریں گے......"

چنانچہ انہوں نے نہایت جدید ترین آلات سے غل مت کے چشموں کے کنارے تقریباً زبردستی میرا بلڈ پریشر چیک کیا اور اسے تسلی بخش قرار دیا۔

اس دوران اکرام غل مت کی دکانوں تک اترا اور وہاں سے کوئی نان نما خوراک اٹھائے واپس آگیا۔

"یہ کیا ہے؟" فضل صاحب چوکنے ہو گئے۔

"یہ تارڑ صاحب کے لئے ہے۔ مقامی ڈش ہے...... چھپ شورو...... آٹے کے اندر گوشت کو دم پخت کیا جاتا ہے...... ہم اسے ہُنزہ پیزا بھی کہتے ہیں۔"

"تارڑ صاحب سنولیک سے واپسی پر ہیسپر گاؤں میں دنیا کا بہترین چھپ شورو کھا چکے ہیں۔ دیسی مرغی کے گوشت کا...... اور یہ خوراک نگر والوں کی ہے ہنزہ کی کیسے ہو گئی......"

"جیسے نگر کی راکاپوشی ہو گئی ویسے ہو گئی......" وہ مسکرانے لگا۔

فضل صاحب نے اس چھپ شورو کو چھوا "ٹھنڈا ہے' گوشت کسی مناسب جانور کا نہیں لگتا...... بالکل نہ کھائیں' پیٹ خراب ہو جائے گا۔"

فضل صاحب ہمارا کتنا خیال رکھتے تھے...... ہمارے ہاضمے کا خیال رکھتے تھے...... گلے کا خیال رکھتے تھے...... اور اب پیٹ کا خیال رکھتے تھے۔

"لیکن میں ان گوشت بھری روٹیوں کا کیا کروں؟" اکرام نے دوہائی دی......

"انہیں مندوبین کو کھلا دیتے ہیں" میں نے کہا......

مندوبین کا ایک اور کوسٹر ہمارے قریب پہنچ کر آہستہ ہوا تو میں نے ہاتھ آگے کر کے اسے روکا اور اس میں بیٹھے بہت پرجوش ہوتے مندوبین میں اسے بانٹ دیا کہ ان علاقوں کی خصوصی اور روایتی خواک ہے کھائیں گے تو یاد کریں گے...... مجھے یقین ہے کہ بعد میں انہوں نے یاد کیا ہو گا......

اس زیرو پوائنٹ سے بھی کوچ ہو گیا......

ماہِ جون میں ان علاقوں میں آنے کا ایک بہت بڑا نقصان تھا...... ابھی خوبانیاں کچّی تھیں...... گلگت میں وہ پک چکی تھیں کیونکہ وہاں موسم یہاں کی نسبت گرم تھا لیکن یہاں کوئی اکا دکا درخت ایسا تھا جس کے پھل زرد ہوئے تھے...... اسی لئے گھروں کی چھتوں پر خوبانیاں زرد قالینوں کی طرح بچھی سوکھتی نہ تھیں...... سوہنی سوہنی بچیاں ہاتھوں میں خوبانیوں کی تھالیاں تھامے سڑک کے کنارے سیّاحوں کی منتظر نہ تھیں...... البتہ چیری پک چکی تھی......

اگلا پڑاؤ راکاپوشی پوائنٹ تھا......

لیکن یہ ہمارا زیرو پوائنٹ نہ تھا......

یہاں ٹریفک جیم تھا اس لئے ہمیں رکنا پڑا......

ایک جم غفیر تھا...... کانفرنس کے کل مندوبین یہاں رکے ہوئے تھے...... درجنوں ویگنیں کوسٹر اور سیاحوں کی جیپیں پُل پر کھڑی تھیں اور پارکنگ کے لئے کوئی جگہ نہ تھی......

راکاپوشی...... جس کے اولین پجاریوں میں سے میں تھا...... جس کے برفانی معبد کے سامنے میں پچھلے اٹھارہ برس سے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتا آیا تھا...... اور ان دنوں میں تنہا راکاپوشی پرست تھا...... یہاں اور کوئی نہ ہوتا تھا...... صرف ایک پل تھا اور بلندی پر برفوں کی ایک اٹڈی ہوئی کائنات تھی جس میں سے ایک پرشور...... سفید نالہ اترتا تھا اور اس دیدہ زیب پُل کے نیچے سے گزرتا ہوا اوجھل ہوتا تھا اور دریائے ہنزہ میں شامل ہو جاتا تھا...... لگتا تھا کہ راکاپوشی کے سفید معبد سے صحیفے اتریں گے......

اور اب......

پُل کے دونوں کناروں پر پانیوں کی قربت میں ہوٹل اور ریستوران تھے...... ہینڈی کرافٹ کی دوکانیں تھیں...... چیری کے کریٹ تھے...... آئس کریم اور مشروبات تھے...... رنگ برنگے سَن شیڈ تھے اور ان کے نیچے آہنی کرسیوں پر ایک دنیا تھی...... ایک ہجوم تھا...... جو چائے پی رہا تھا...... چیریاں کھا رہا تھا' تصویریں اتروا رہا تھا اور غُل کر رہا تھا۔ راکاپوشی کے نالے کی آواز پسپا ہو گئی تھی اور لوگوں کا شور آگے آ گیا تھا...... راکاپوشی ماند پڑ چکی تھی۔

میں کئی برس پہلے یہیں پر...... پل کے قریب اپنی نیلی سوزوکی پارک کر کے اپنے بال بچوں کے ہمراہ راکاپوشی کے دامن میں پہنچنے کے لئے بہت دیر چلا تھا اور پھر ناکام لوٹ آیا تھا۔ وہ ان دنوں ایک دیوی تھی...... اب نہیں رہی تھی...... ایک داشتہ ہو گئی تھی...... ہر کسی کی...... ویسے یہ کتنی خود غرضی ہے کہ جب راکاپوشی صرف میرے لئے تھی تو ایک دیوی تھی...... ایک برفانی اور مقدس معبد تھی...... اور جب اس کے گرد ہجوم ہوا تو وہ ایک بازاری شے ہو گئی......

ہاں یہ واقعی خود غرضی تھی...... ملکیت کا غرور تھا...... لیکن اس کے باوجود وہ میری نظروں میں سستی اور عام ہو گئی...... کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ بازار میں شغل میلے کے لئے آئے ہوئے گاہک تماشا دیکھنے آتے ہیں اس کی پرستش کرنے نہیں...... اور میں اس کا پجاری تھا......

ہر کوئی اس کی تصویریں اتار رہا تھا...... وہ بھی جو اس کے نام تک سے آشنا نہ تھے اور وہ

بھی جو اپنے سامنے آنے والی ہر شے کی تصویر اتارتے ہیں......

مجھے اب اس کے ساتھ تنہا ملاقات کرنے کے لئے اس کے بیس کیمپ تک جانا ہوگا......اور میں کبھی نہ کبھی جاؤں گا......تب ملاقاتیں ہوں گی اور باتیں ہوں گی۔

ریاست نگر سے ہم دریائے ہنزہ کے پار ہوئے تو وادیٔ ہنزہ کا آغاز ہو گیا...... شام اترنے والی تھی اور ٹھنڈک بڑھتی جاتی تھی۔

آخری زیرو پوائنٹ شہتوت اور خوبانی کے ایک باغ کے سائے میں تھا......

وہاں ایک پوشیدہ سا کنواں تھا......زیادہ گہرا نہیں...... لیکن شاہراہ ریشم کے کناروں پر ایک قدیم کنواں......اس سے طرح طرح کی روایات وابستہ تھیں......میں اتنی بار ادھر آیا تھا لیکن اس کے وجود سے لاعلم رہا......

"ابھی پچیس تیس سال پہلے ادھر کے لوگ بہت مشکل میں تھے......اوپر دریا کے اوپر آپ نے وہ پرانا روڈ دیکھا ہوگا کہ کیسا تھا...... تو لوگ پیدل سفر کرتے تھے۔ گلگت سے ہنزہ...... اور اس مسافت میں کہیں بھی پینے کے پانی کا ایک قطرہ نہ تھا...... تو ان زمانوں میں یہ کنواں یہاں موجود تھا......اور مسافر اس کی آس میں چلتے رہتے تھے کہ وہاں پانی آئے گا......ان کے لئے یہ ایک جنت تھا۔اور یہاں کہاوت تھی کہ اس کنویں کی حفاظت پر پریاں مامور ہیں۔"

میں نے آگے ہو کر کنویں میں جھانکا......اب بھی پانی تھا اور آسانی سے ہاتھ بڑھا کر پیا جا سکتا تھا"اس کا پانی پی کر دیکھتے ہیں۔"

"نہیں......"فضل صاحب نے روک دیا"یہ پانی اب قابل نہیں رہا...... پرانا ہو گیا ہے......آپ منرل واٹر پئیں......وہ شفاف اور پُر شفا ہے۔"

ڈاکٹر صاحبان بھی چلے آتے تھے...... ہمیں دیکھ کر نہایت پُرمسرت ہوئے اور پھر رک گئے......منرل واٹر سے پیاس بجھانے کے بعد انہوں نے پھر میرا بلڈ پریشر چیک کیا اور اسے مزید تسلی بخش قرار دیا......

یہ قدیم کنواں آخری زیرو پوائنٹ تھا......

"ہنزہ دربار"

دربار ہوٹل میرے لئے ایک عجوبہ تھا......

کریم آباد تو میرے لئے......کچے راستوں، ریت بھری پگڈنڈیوں، بربر قل ایسی برفانی نہروں، کھڑکیوں میں سے جھانکتے متجسس پرکشش چہروں، اُلتر کی برفوں، بھُس بھرے مارخوروں اور عشپ پرندوں کی ایک گمنام کوہستانی بستی تھی۔ ہنزہ اِن، ہل ٹاپ اور ٹورسٹ اِن قسم کی درمیانے درجے کی قیام گاہوں کا ایک مقام تھا......شام اترتی تھی تو ہُو کا عالم طاری ہو جاتا تھا...... گنیش سے کوئی سیاح ہانپتا ہوا اوپر پہنچتا تھا تو پورے قصبے کو خبر ہو جاتی تھی...... ہنزہ ویو ہوٹل......سرینا ہوٹل اور خاص طور پر دربار ہوٹل تو اس کے سان گمان میں نہ تھے۔ لیکن......سب گمان گم ہوئے اور یہ مہنگے اور جدید ہوٹل وجود میں آگئے......

دربار ہوٹل......ایک مرتبہ کا ذکر ہے میر...... میر غضنفر اور ان کی اب بھی رانی عتیقہ کا ہوٹل تھا...... میر غضنفر کو میں نے آج سے پینتیس برس پیشتر ایک نیو ایئر پارٹی میں لاہور کے فلیٹیز ہوٹل میں دیکھا تھا......وہ ان دنوں شاید انجینئرنگ یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے اور ایک میوزک بینڈ میں نہایت کمال کے ڈرمر تھے......ان کے ڈرمز کی بیٹ پر ہم نے نئے سال کو خوش آمدید کہا تھا اور ان پر نوٹ نچھاور کئے تھے......عتیقہ لاہور کی رہنے والی ہیں اور اسلام آباد کی معروف اور پسندیدہ شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے...... میں صرف ایک روز پیشتر ان سے ملا تھا جب وہ عکسی مفتی کو تلاش کرتی ہوٹل رویل میں میرے کمرے میں تشریف لائی تھیں......اور وہ یقیناً ایک پراثر موجودگی کی مالک خاتون تھیں......

دربار ہوٹل کا لاؤنج...... اعلیٰ ہوٹلوں کی طرح بے روح اور شاندار نہ تھا...... بلکہ اس

میں وادیٔ ہنزہ کا مزاج رچا بسا تھا...... اس کی چھت ان وادیوں کے گھروں ایسے روشندان لئے ہوئے تھی...... لکڑی کا کام نہایت مہارت والا اور پُرکشش تھا...... پرانی بندوقیں تھیں...... کشیدہ کاری کے نمونے تھے...... مارکوپولو شیپ کے پُرشکوہ سینگ تھے اور پتھر کے برتن تھے...... جو بہت بعد میں رجب شاہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وادیٔ شمشال سے لائے گئے تھے......

دیواروں پر قدیم اور پھیکی پڑتی میر جمال خان کی تصویریں تھیں...... دنیا کی جانی پہچانی شخصیات کو جھک کر خوش آمدید کہتے ہوئے اور ان میں ایوب خان بھی تھے اور آغا خان بھی......

آج کانفرنس کے مندوبین کے لئے یہاں ایک گرینڈ ڈنر کا بندوبست تھا۔

یہاں اردو اور دیگر مقامی زبانیں ٹیبو تھیں اور ہر کوئی انگریزی بولتا تھا...... جیسی بھی بولتا تھا...... دربار ہوٹل کے ڈنر میں ہڑبونگ مچی تھی......

اس کی وسیع چھت سے...... کریم آباد...... بلتت کا چھ سو برس قدیم قلعہ ایک الوہی منور حالت میں...... نواں نکور دکھائی دے رہا تھا...... اسے لاکھوں ڈالر کے خرچے سے ازسرنو تعمیر کیا گیا تھا لیکن اس کی قدامت اور روایت کی پابندی کرتے ہوئے...... وہ لاہور کی کامران کی بارہ دری کی مانند دوبارہ تعمیر کے بعد کسی صنعتی نمائش کی پویلین نہیں لگ رہا تھا...... اگرچہ اس کے درودیوار کو شمشال سے لائے ہوئے ظروف اور تلواروں سے سجایا گیا تھا اور اسے اب بھی دیکھنے سے...... کہ میں اسے درجنوں بار دیکھ چکا تھا...... یقین نہیں آتا تھا کہ اس کا وجود اُلتر کے برفانی منظر میں سے ابھرتا ہوا موجود ہے...... کہ نہیں ہے...... میں نے نوح کے پہاڑ آرارات کے دامن میں ڈوگ بایزید کا حصار دیکھا تھا۔ کنگ لڈوگ کے فیئری ٹیل کاسل کو بلیک فارسٹ میں دیکھا تھا...... ڈنمارک کے قصبے ہیلسنور میں "ٹوبی آر ناٹ ٹوبی" ہیملٹ کے قلعے کی ان فصیلوں کو دیکھا تھا جن پر اس کے مقتول باپ کی روح گھومتی تھی...... لیکن جو جادو اور ڈرامائی برفانی پس منظر کریم آباد فورٹ کا تھا...... وہ روئے زمین پر اور کہیں نہ تھا......

لیکن ایک دنیا بھر میں یکتا قلعے کے منظر سے پیٹ تو نہیں بھرتا......

دربار ہوٹل کے ڈنر میں ہڑبونگ مچی تھی۔

میں دعوتوں میں کئی بار بھوکا رہا ہوں لیکن دھکم پیل کر کے...... اپنی پلیٹ سے لوگوں کی کمر میں کچوکے دیتا کبھی خوراک حاصل نہیں کر سکا...... اگرچہ یہاں خوراک وافر تھی لیکن لوگوں کی بھوک اس سے کہیں زیادہ تھی......

میں بھوکا تو تھا لیکن میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنے چہرے کو مسکراہٹ سے عاری نہیں کیا ورنہ میرے بے چارگی سب پر عیاں ہو جاتی اور لوگ مجھ پر ترس کھا کر اپنی پلیٹوں میں سے ایک ایک بوٹی اٹھا کر مجھے پیش کر دیتے کہ بھوکے کو کھلانا ثواب کا کام ہے......

نہایت عوامی انداز میں...... سیڑھیوں پر براجمان شمالی علاقوں کے وزیر جنرل عبدالمجید ملک تھے اور چند چاول اور سلاد کے دو تین پتے نوش فرما رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا تو وہ میرے خالی ہاتھ دیکھ کر کہنے لگے "آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟"

میری مسکراہٹ ابھی تک میری ناتوانی پر حاوی تھی "وہ جی...... بس جی...... وہ"

انہوں نے اپنے متعدد اہلکاروں میں سے کسی ایک کو پکارا "بھئی تارڑ صاحب کے لئے کھانا لاؤ......"

وہ اہلکار بھاگ دوڑ کرنے کے بعد ذرا ہانپتے ہوئے میرے پاس آئے اور سرگوشی میں بولے "جناب کھانا کچن سے چلتا ہے تو میزوں تک پہنچنے سے پہلے ہی لوٹ لیا جاتا ہے...... میں کہاں سے لاؤں......"

رانی عتیقہ بھی ہر سو مسکراہٹیں بکھیر رہی تھیں "آپ نے تکلف تو نہیں کیا...... سلاد کیسی تھی...... ہمیں امید ہے آپ کو فرنچ کسٹرڈ پسند آیا ہو گا......"

بعد میں کھلا کہ کانفرنس کے مندوبین کی تعداد سے دوگنے بندوں کے طعام کا انتظام کیا گیا تھا لیکن کل اہل ہنزہ خود بخود مدعو ہو گئے......

میرا قیام نیچے گنیش کے قریب پی ٹی ڈی سی کے موٹل میں تھا اور نہایت آرامدہ تھا...... میں سوچ رہا تھا کہ کہیں سے لفٹ حاصل کر کے نیچے پہنچوں اور ہوٹل کے کچن کی تلاشی لوں شاید کچھ مل جائے......

اتنی دیر میں فضل احمد، جو شام سے غائب تھے جانے کہاں سے نمودار ہو گئے۔

"آپ...... میرے ساتھ چلیں......"

"کہاں چلیں؟"

"بس کہیں چلیں۔"

"میں نے تو ابھی کھانا نہیں کھایا......"

"وہ بھی کھلا دیں گے۔"

وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے نیچے کریم آباد میں لے گئے...... بازار بند ہو چکے تھے اور گھروں کے روشندان تاریک تھے......

"لیکن آج رات میر صاحب کے پیلس کے لان میں ایک زبردست ہنزائی کلچرل شو ہے......" میں نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

"وہاں بھی جائیں گے......"

"کارگل کہانی اور عشقِ آتش"

کریم آباد کے معروف ہل ٹاپ ہوٹل کے لان میں سفید آہنی کرسیوں پر پہلو بدلتے کچھ لوگ تھے جو ہماری آمد کے منتظر تھے......ان میں گروپ کیپٹن شاہ خان بھی تھے......

بریگیڈیئر اسلم، کرنل حسن خان اور کرنل احسان علی کے ہمراہ گروپ کیپٹن شاہ خان شمال کے ان ہیروز میں سے ہیں جنہوں نے ڈوگرہ راج کے خلاف اکتوبر 48ء میں علم بغاوت بلند کیا اور ایک بے مثال جدوجہد کے بعد ان علاقوں کو راجہ کے تسلط سے آزاد کرانے اور پھر انہیں پاکستان میں شامل کروانے میں کامیاب ہو گئے...... شمال کے اکثر لوگ کہتے ہیں کہ آپ لوگ تو بیٹھے بٹھائے پاکستان میں شامل ہو گئے، لیکن ہم نے اس کے لئے مسلح جدوجہد کی، قربانیاں دیں اور تب جا کر اپنے آپ کو پاکستان کا ایک حصہ بنایا اور اس کے باوجود آج آپ پاکستانی ہیں اور ہم نہیں ہیں......اور واقعی یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ شمال کے عوام کو ابھی تک ان کے آئینی حقوق نہیں دیئے گئے...... بھلے اس میں کچھ ناگزیر سیاسی مصلحتیں ہیں لیکن اگر ان لوگوں میں پاکستان کے حوالے سے ایک محرومی اور ناآسودگی کا احساس ہے تو انہیں موردِالزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا...... یہ وہی دن تھے جب میں رات کی تنہائی میں ہل ٹاپ کے لان میں شاہ خان صاحب کے سامنے بیٹھا تھا جب انہی علاقوں کی بلتی سرحدوں پر کارگل کا معرکہ جاری تھا...... اور وہاں شہید ہونے والے بیشتر نوجوانوں کا تعلق بھی انہی علاقوں سے تھا......

شاہ خان شمال میں ایک لیجنڈری حیثیت رکھتے ہیں...... میں ان کے نام سے اور کام سے واقف تھا لیکن آج شب یہ ہماری پہلی ملاقات تھی...... وہ ایک ڈارک گرے سوٹ اور

پولکاڈرٹ ٹائی میں ملبوس تھے' گھنے شیشوں کی عینک کے عقب سے آپ پر نظر رکھتے تھے اور اس عمر میں بھی سپر فٹ تھے......

کرنل حسن خان...... ہیرو آف ٹائیگر فورس کہلائے......

بریگیڈیئر اسلم کو "پاشا" کہا جاتا تھا......

کرنل احسان علی...... ہیرو آف آئی بیکس فورس کے نام سے جانے جاتے ہیں اور گروپ کیپٹن شاہ خان کو ہیرو آف اسکیمو فورس کا خطاب دیا گیا......

آزادی کی اس جدوجہد میں ریاست نگر' ہنزہ اور بلتستان کے لوگ برابر کے شریک تھے...... شاہ خان کا کہنا ہے کہ ایک زمانے میں اہل ہنزہ بلند پہاڑوں پر چڑھنے کی مشقت کرتے تھے اپنے ہاتھ پاؤں برفانی پانیوں میں پہروں ڈبوئے رکھتے تھے تاکہ سلک روڈ پر گزرنے والے کشمیر سے یارقند جانے والے کاروانوں کو لوٹ سکیں...... شاہ خان کے گروپ کو اسکیمو فورس اس لئے کہا گیا کہ وہ موسم سرما کے دوران دیوسائی میدان پر پڑی ہوئی کئی فٹ گہری برفوں میں راستے بناتے وادئ کارگل' دراس اور زوجی لاء پر ٹوٹ پڑے اور دشمن کو زیر کر لیا...... شاہ خان کو زوجی لاء درے پر پاکستانی پرچم لہرانے کے کارنامے پر ستارۂ جرأت اور ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا......

کارگل سے چونکہ سکردو۔ لیہہ اور سرینگر کو راستے جاتے تھے اس لئے اس وادی کو دشمن سے نکالنا بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ سُورو اور واکا دریاؤں کے سنگم پر واقع' بلند اور بے آباد پہاڑوں کے درمیان کارگل کا قصبہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے۔ دراس بھی اسی خطے میں ہے اور ساڑھے گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر درہ زوجی لاء ہے جو سرینگر جانے والی روڈ کی شہ رگ ہے...... درے کے دامن میں کشمیر کا شہر سونامرگ ہے اور ایک سو تیس میل کے فاصلے پر سرینگر ہے...... زوجی لاء کے معرکے میں جمعدار رستم خان کو بھی ستارۂ جرأت سے نوازا گیا۔ لیفٹیننٹ بابر خان اپنے جوانوں کے ساتھ لداخ کے صدر مقام لیہہ سے چند میل کے فاصلے پر نموّ کے مقام پر پہنچ گئے اور انہوں نے لیہہ کے گرد پہاڑیوں پر قبضہ کر کے اس شہر کو اپنے گھیرے میں لے لیا...... لیہہ میں محصور دشمن کی فوج کو اب صرف ہوائی جہازوں کی مدد سے خوراک اور اسلحہ پہنچایا جا سکتا تھا...... جنگ کی صورت میں نمایاں تبدیلی اس لمحے ظہور

پذیر ہوئی جب ہندوستان اپنے دفاع کے لئے درجنوں ٹینک ان علاقوں میں لے آیا...... ان بے مثال معرکوں کی تفصیل ہمیں پروفیسر دانی کی کتاب "ہسٹری آف ناردرن ایریاز آف پاکستان" میں ملتی ہے جہاں سے میں نے بھی استفادہ کیا ہے...... ایک اور حیرت ناک واقعہ یہ ہے کہ مجاہدین کا ایک گروپ جسے "قدم پارٹی" کا نام دیا گیا...... وائرلیس سسٹم کے نہ ہونے کی وجہ سے کارگل میں سیز فائر ہو جانے کے حکومتی فیصلے سے لاعلم رہا اور یہ لوگ اس کے بعد بھی چھ ماہ تک ان علاقوں میں برسرپیکار رہے...... یہ وہ علاقے ہیں جن کے جنوب میں کانگڑا' شمال میں کارگل' مشرق میں تبت کا تہاسا اور مغرب میں کشٹ واڑ واقع ہیں...... یہ وادئ زنسکار ہے جو اپنی خوبصورتی میں بے مثل ہے...... چھ ماہ کے بعد جب پدم پر قابض نائب صوبیدار محمد علی چاروں جانب سے دشمنوں میں گھر گئے تو موصوف کو علم ہوا کہ سیز فائر ہو چکی ہے...... چنانچہ پاکستانی حکام نے ہندوستانیوں سے رابطہ کیا جس کے نتیجے میں محمد علی اور ان کے ساتھیوں کو پدم سے نکال لیا گیا......

کریم آباد رات کے سیاہ پہرے میں روپوش تھا اور صرف قدیم قلعہ تھا جو اس کی تاریکی سے بلند ہو کر روشن ہو رہا تھا اور یہاں سے ہل ٹاپ کے لان سے خوبانی کے درختوں کی شاخوں میں سے کبھی کبھی دکھائی دے جاتا تھا......

ویٹر سلاد کا ایک بہت بڑا باؤل ہمارے سامنے رکھ گیا......

"بہت بہادر لوگ ہیں جو کارگل کی بلندیوں پر جا بیٹھے ہیں...... ناممکن کام تھا......

ہندوستان بہت مشکل میں ہے...... وہ دن کے وقت بالکل حرکت نہیں کر سکتے...... رات کو لائٹس کے بغیر اپنے ٹروپس کو سپلائی پہنچاتے ہیں...... لیکن یہ بہادر لوگ ہیں' سینکڑوں بھاری توپوں کی گولہ باری اور ایئرفورس کی بمباری کے باوجود ڈٹے ہوئے ہیں......"

"ہو گا کیا؟"

"ہندوستان اس صورتحال میں زندہ نہیں رہ سکتا...... وہ سخت شکنجے میں ہے بلکہ پچھلے باون برس میں وہ اتنی مصیبت میں نہیں جکڑا گیا...... وہ ہر صورت اس سے نکلنے کی کوشش کرے گا اور کچھ بھی کر سکتا ہے...... جو اوپر گئے ہیں وہ کچھ نہ کچھ سوچ کر ہی اوپر گئے ہوں

گے...... آپ کو ٹماٹر بہت پسند ہیں تارڑ صاحب؟" انہوں نے یکدم کہا......

"نہیں تو......" شاہ خان کارگل سے کدھر نکل گئے ہیں میں نے سوچا...... ویسے اس لمحے میں ایک اور ٹماٹر ہڑپ کرنے کو تھا...... "جی ہاں...... صحت کے لئے بہت مفید ہیں" میں انہیں یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے ٹماٹر ڈنر کر رہا تھا......

کہا جاتا ہے کہ برطانوی کوہ پیما جارج میلوری 1928ء میں ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچ گیا تھا اور واپسی پر...... نیچے اترتے ہوئے ہلاک ہو گیا تھا...... پچھلے دنوں ایک مہم نے اس کی لاش بھی تلاش کرلی تھی...... کسی رپورٹر نے ایورسٹ کے فاتح ایڈمنڈ ہلیری سے پوچھا کہ جناب اگر یہ ثابت ہو گیا کہ میلوری دنیا کا پہلا شخص تھا جو ایورسٹ پر پہنچا تو پھر آپ کا ردعمل کیا ہو گا...... اس پر ہلیری نے کہا' کسی بھی چوٹی پر پہنچنا بے حد اہم ہوتا ہے لیکن چوٹی پر پہنچ کر زندہ واپس آنا اس سے زیادہ اہم ہوتا ہے...... میں زندہ واپس آ گیا تھا...... میلوری نہیں آیا...... کارگل کی صورتحال بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی...... وہاں پہنچنا بے حد اہم تھا لیکن اس کے بعد......

شمال سے واپسی پر معلوم ہوا کہ اس کے بعد...... کامیابی سے کیسے واپس آنا ہے اس کے بارے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی...... جان پر کھیل جانے والے سیاست کا کھیل کھیلنے والوں سے اکثر ہار جاتے ہیں......

"آپ نے اتنی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے شمال کی تاریخ کا ایک باب ہیں تو ایسی زندگی کو تحریر میں تو لانا چاہیے......"

"پہلے تو مصروفیت رہی لیکن اب میں نے "گلگت سکاؤٹس" کے نام سے ایک خودنوشت تحریر کی ہے...... جب کتاب مکمل ہوئی تو میں نے ڈاکٹر دانی سے مشورہ کیا کہ اب کیا کروں تو انہوں نے لاہور کے ایک ناشر سے بات کی...... وہ چھاپ رہے ہیں......"

ویٹر سلاد کا ایک اور بہت بڑا پیالہ لے کر آیا اور خالی ہو چکے پیالے کو اٹھا کر اس کی جگہ اسے رکھ دیا......

اس پیالے میں بھی بہت سارے ٹماٹر تھے جنہیں میں نے پُراشتیاق نظروں سے دیکھا......

ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی...... ہم نے کرسیاں کھینچ کر خوبانی کے درختوں کے نیچے کرلیں...... تھوڑی دیر بعد ان کی ٹہنیاں بھی بھیگ کر ٹپ ٹپ نچڑنے لگیں...... سردی بڑھ گئی...... اور ہم ٹھٹھرنے لگے...... شاہ زمان اپنے نفیس گرے سوٹ اور پولکاڈاٹ ٹائی میں اسی طرح سجے بنے بیٹھے رہے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو...... انہیں سردی بھی نہیں لگ رہی تھی...... بھلا جو سب سے بڑا اسکیمو رہا ہو اسے سردی کیسے لگ سکتی ہے...... شاہ خان نے کہا تھا کہ کارگل کے درہ ذوجی لاء جہاں انہوں نے پاکستانی پرچم لہرایا تھا...... وہاں سے سرینگر کو راستہ جاتا ہے......

اور کچھ روز بعد ہمارے لیڈروں نے ہمیں بتایا کہ کارگل سے سرینگر کو کوئی روڈ نہیں جاتی! کیا جغرافیہ تبدیل ہو گیا تھا؟......

جب ہم رات گئے واپس جا رہے تھے تو سنسان اور تاریک بازار میں...... ڈھلوان پر اترتی جیپ کو ایک نوجوان نے رکنے کا اشارہ کیا...... "کیا آپ کے ساتھ تارڑ صاحب ہیں؟"

"ہیں......" ڈرائیور نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

نوجوان نے جیپ کے اندر جھانکا "جناب ہم جانتے تھے کہ آپ ہل ٹاپ میں ہیں اور میں یہاں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا" وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آپ پلیز میرے ساتھ آئیں...... آپ کو تو ہم شمال کا باسی سمجھتے ہیں...... اس وقت ٹاپ آف دی ورلڈ ہوٹل کی چھت پر...... یعنی ٹاپ پر جو محفل سجی ہے اس میں صرف آپ کی کمی ہے...... آ جائیں۔"

"بہت دیر ہو چکی ہے......" فضل احمد کہنے لگے۔

"ہم بھی بہت دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔"

ٹاپ آف دی ورلڈ ہوٹل کی چھت پر بھیگتی اور سرد رات میں ایک محفل جمی تھی...... یاک کے دبیز نمدوں پر نصف درجن کے قریب مقامی موسیقار جانے کون کون سے ساز بجا رہے تھے اور ان کے سامنے ہنزہ کے باسی اور کچھ سیاح نوجوان تالیوں سے سنگت کر رہے تھے......

مجھے معلوم نہیں کہ موسیقی کی یہ بزم کس نوعیت کی تھی لیکن یہ معلوم ہے کہ میرے وارد ہونے کے بعد وہ میری نوعیت کی ہو گئی...... میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اہل ہنزہ زندگی کرنا جانتے ہیں' انہوں نے اسے قید نہیں کر رکھا...... اپنے آپ کو قید نہیں رکھا...... وہ

زندگی کو راکاپوشی کے بوسے دیتے ہیں...... برفیلے چشموں میں اس کا بدن نکھارتے ہیں اور اسے پہنتے ہیں ایسے کہ وہ اور زندگی ایک ہو جاتے ہیں...... ادھر ہم اپنے احساس جرم میں قید اس سے اجتناب کرتے رہتے ہیں...... اس کی ہوس میں مرے جاتے ہیں لیکن اس کا ہاتھ تھام کر اسے گلے نہیں لگاتے...... گریز کرتے رہتے ہیں۔

موسیقار جو کچھ بھی بجا رہے تھے ان کے ساز اُلتر گلیشیر سے براہ راست ہمارے بدنوں پر اثر کرنے والی سرد ہواؤں‘ بلتت کے قلعے کے قدیم در و دیوار اور اہل ہنزہ کے سرخ و سفید چہروں اور گھروں کے اندر جو عشق خاص کی حدّت دہکتی تھی‘ ان سے ہم آہنگ ہو رہے تھے......

میں جب سے شمال میں آیا تھا...... محبت کے ایک بگولے کی زد میں بے اختیار گردش کرتا تھا۔ مولانا روم کے درویشوں کی طرح گھومتا چلا جاتا تھا اور صبح‘ شام یارات کے پیمانے ختم ہو چکے تھے......

میں نے کل پچھلے پہر کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے بعد اس بگولے سے نکل جانا تھا اور دنیا کی تنہا ترین جگہ پر جانے کے لئے پسّو پہنچنا تھا‘ اور وہاں‘ رجب شاہ کا انتظار کرنا تھا......

لیکن ابھی میں اس بگولے کی زد میں تھا...... بے اختیار تھا اور شمال کی شب میں یہ نامانوس موسیقی مجھے اس چھت سے اوپر آسمانوں تک لے جاتی تھی...... عشق آتش کی طرح جو آسمانوں تک جاتی ہے‘ انسان کو مست گداگر بناتی ہے......

کوئی ایک نوجوان تالیاں بجاتا اٹھتا اور موسیقاروں کے سامنے رقص کرنے لگتا اور وہ اپنی لے تیز کر دیتے......

پھر کچھ اور لوگ بھی بازو اٹھائے اس دھن کی زد میں آگئے......

فضل احمد بھی رہ نہ سکے......

اور پھر ہمارے ان انجانے میزبانوں نے مجھے بھی اپنے دائرے میں شامل کر لیا......

لیکن میں رقص نہیں کر سکتا تھا...... اس لئے نہیں کہ میرے وجود میں توازن نہیں تھا بلکہ اس لئے کہ میں بندھا ہوا تھا...... قید تھا...... اپنے روّیوں کی جھجک میں تھا...... البتہ فضل میری "پرفارمنس" سے بہت راضی ہو رہے تھے اور نوٹ لہرا لہرا کر میری چترالی ٹوپی میں

اڑستے جاتے تھے...... موسیقاروں پر بھی نوٹ نچھاور کئے جا رہے تھے......

گلگت کی طرح ہنزہ بھی تبدیلی کی زد میں تھا...... ہنزہ اب قراقرم کی بلندیوں میں ایک گمشدہ سلطنت نہیں تھا۔ سینکڑوں برسوں سے جو تنہائی تھی وہ چند برسوں میں دور ہو گئی تھی...... یہ ایک خواب نہیں رہا تھا۔ کڑی دھوپ میں سب کو دکھائی دیتا تھا...... ویسے مجھے اس کا قدیم روپ بھی پسند تھا اور موجودہ چہرہ بھی پرکشش لگتا تھا...... یہ کیسے ممکن تھا کہ لاہور اور اسلام آباد تو بدل جائیں اور ہنزہ جوں کا توں رہے......

البتہ جو شے نہیں بدلی تھی وہ اس کے باشندوں کی بیباک خوشدلی اور زندگی کے جام سے آخری قطرہ تک پی جانے کی خواہش تھی۔

سامنے بلتت کے قلعے کو جو روشنیاں منور کرتی تھیں‘ وہ مدھم ہونے لگیں اور راکاپوشی کی برفوں کی لو بڑھتی گئی...... یہاں تک کہ وہ وادیٔ ہنزہ کے خدوخال کو ظاہر کرنے لگی......

مجھے کل کریم آباد سے پسّو جانا تھا لیکن ابھی اس رات...... میں عشق آتش کی طرح آسمانوں تک جاتا تھا۔

"مے کدہ راکاپوشی اور عرق شہتوت کی بڑھیا"

وہ بڑھیا بے حد ضعیف تھی......

وہ راکاپوشی کے عین سامنے ایک چھوٹے سے گھر میں اس کی برفوں پر اتنی دیر سے نظریں جمائے ہوئے تھی...... شاید اسی برس...... شاید نوے برس' وہ اس کی سفید برفوں کو تکتی رہی تھی اور اس کے بال اسی طور سفید ہوئے ہوں گے لیکن اب سفیدی کی بجائے ان میں بے رنگ مردنی تھی۔

اس کے تقریباً متحرک سر پر ایک میلی کچیلی روایتی ٹوپی تھی اور اس میں سے لٹکتی اس کی مینڈھیاں جھرّیوں بھری گردن پر مردہ آرزوؤں کی طرح پڑی تھیں...... یہ مینڈھیاں جانے کتنے برس پہلے گوندھی گئی تھیں......

اس کے استقبال میں گرم جوشی نہ تھی...... جیسے ایک بھیڑ گھر میں آجائے اسے دیکھتے ہیں وہ ایسے ہمیں دیکھتی تھی......

گھر کے برآمدے میں ایک تخت پوش پر اس کا تقریباً لاچار خاوند بے نور سی آنکھیں جھپکتا ہمیں پہچاننے کی سعی کرتا تھا......

فضل احمد میری خصوصی فرمائش پر مجھے اس بڑھیا کے گھر میں لائے تھے جو راکاپوشی کے سفید انبار کے عین سامنے ہر بھرے کھیتوں اور شہتوت کے درختوں میں پوشیدہ تھا۔ آج کریم آباد میں کانفرنس کا اختتامی سیشن تھا...... حسب معمول کمیٹیاں تشکیل دی گئیں...... سفارشات مرتب کی گئیں اور جذباتی تقریریں کی گئیں...... میں دربار ہوٹل کے کانفرنس ہال میں جھانک کر تھوڑی دیر کے لئے اپنی شکل دکھاتا کہ میں ایک معزز مندوب تھا

اور پھر باہر آجاتا...... مجھ میں ایک بے چینی تھی...... آج تمام مندوبین نے پچھلے پہر کوسٹرز میں سوار ہو کر گلگت واپس چلے جانا تھا...... لیکن میں نے اپنے دو ساتھیوں' بقا اور ندیم کے ہمراہ بالکل مخالف سمت میں درہ خنجراب کی سمت میں...... پسّو کے قصبے کی جانب کوچ کرنا تھا......

"فضل...... آپ نے کہا تھا کہ وہ بڑھیا آپ کے آبائی قصبے ہندی کے اوپر پہاڑوں میں مقیم ہے...... کیا ہم وہاں جا سکتے ہیں......"

"آپ وہاں جا کر کیا کریں گے......" فضل اپنے پورے بدن کو ایک دھچکا سا دے کر مسکرائے......

"مجھے اس قسم کے نایاب لوگوں سے ملنے کا شوق ہے......"

"اور کانفرنس؟"

"مجھے یقین ہے کہ میری غیر موجودگی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا اور دیگر مندوبین نہایت ذوق و شوق سے اسے کامیابی سے ہمکنار کر دیں گے...... چلیں فضل صاحب......"

ہم کریم آباد سے واپس ہندی کے قصبے تک گئے اور پھر شاہراہ ریشم سے الگ ہو کر ایک ایسی کچی سڑک پر سفر اختیار کیا جو بلند ہوتی چلی جاتی تھی اور لحہ بہ لحہ دریائے ہنزہ کے پار نگر ریاست میں براجمان راکاپوشی کے روبرو ہوتی چلی جاتی تھی...... کبھی دھوپ میں تپتی ویرانی آتی اور کبھی کچھ کھیت اور درخت......

ایک بے آباد اور بلند ٹیلے پر کچھ شکستہ دیواریں اور کھنڈر تھے......

"یہ ایک زمانے میں میر آف ہنزہ کا مہمان خانہ تھا جو اب اجڑ چکا ہے...... وہ اپنے مہمانوں کو یہاں لاتے اور چاندنی راتوں میں راکاپوشی کا دیدار کرواتے تھے...... یہ ان کی ملکیت ہے......"

ایک مختصر سی آبادی آئی جہاں خوبانی اور شہتوت کے درختوں میں سکول کی پیلی وردیوں میں ملبوس بے شمار بچے کچھ سجے ہوئے تھے' کچھ ٹہنیوں پر بیٹھے تھے اور کچھ لٹک رہے تھے اور آدھی چھٹی کے وقت براہ راست خوبانیوں اور شہتوتوں کا لنچ کر رہے تھے۔

راستے میں کبھی دھول اڑنے لگتی اور کبھی ریت آجاتی......

ہماری ویگن گزرتی تو ایک غبار اٹھتا اور راکاپوشی کے آگے دھول کا باریک پردہ تان دیتا...... صاف چھپتے بھی نہیں اور سامنے آتے بھی نہیں......

ایک مقام پر ڈرائیور نے ویگن روک دی......

"آئیں تارڑ صاحب......"

ہم کھیتوں کی منڈیروں پر چلتے ہوئے...... کچھ کھنڈر نما آماجگاہوں کی قربت میں سے گزرتے اور جیسے سیدھے راکاپوشی کی برفوں کی جانب چلتے چلتے ایک پتھریلے مکان کی دیوار میں نصب نیم وا دروازے کی چوکھٹ پر جا رُکے...... اور اس کے مکین فضل کی آواز سے واقف تھے...... ہم اندر چلے گئے......

وہ بڑھیا بے حد ضعیف تھی...... روایتی ٹوپی میں سے لٹکتی بوڑھی مینڈھیاں' جھریوں بھری گردن پر مردہ آرزوؤں کی طرح...... اس کے استقبال میں گرمجوشی نہ تھی......

تخت پوش...... گھر کے برآمدے میں...... ایک خاص زاویے سے لگتا تھا کہ یہ تخت پوش راکاپوشی کی برفوں کے اندر بچھا ہے......

تخت پوش پر بڑھیا کا لاچار خاوند بے نور سی آنکھیں جھپکتا ہمیں پہچاننے کی سعی کرتا تھا......

اس نے آنکھوں کے اوپر جھریوں بھرے لرزتے ہاتھ سے چھجا بناتے ہوئے ہمیں غور سے دیکھا اور کچھ کہا......

"ماموں......" فضل نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا......

بوڑھا "ماموں......" کا لفظ سن کر کھل اٹھا......

کچے صحن میں...... درختوں کے سائے میں بڑے بڑے تسلوں میں شہتوت بھرے تھے...... ان کے عقب میں ایک نیم تاریک سی کوٹھڑی تھی جس میں پلاسٹک کے جیری کین نظر آرہے تھے...... "یہ بڑھیا اس وادی میں سب سے بہترین عرق کشید کرتی ہے،" فضل مسکرائے "چونکہ بے حد ایماندار ہے اس لئے اس کے کام میں برکت بہت ہے......"

"اس کام میں بھی برکت ہوتی ہے؟"

"کام کوئی بھی ہو ایمانداری سے کیا جائے تو برکت ہوتی ہے...... ادھر آس پاس اس کی

بہت زمین ہے...... بے حد برکت ہے۔"

بوڑھا تخت پوش پر بیٹھا تھا اور خوش تھا کہ فضل نے اسے "ماموں" کہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ اس کے پس منظر میں راکاپوشی ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی مانند نیلے آسمان پر چسپاں تھی...... "فضل...... تم دو گھنٹے ٹھہرو گے؟"

"نہیں نہیں ماموں...... یہ مہمان ہیں...... میں تم سے ملاقات کے لئے لے آیا...... ابھی جانا ہے......"

"مہمان؟...... کدھر سے آیا ہے؟"

"لاہور سے......"

"وہ...... کدھر ہے؟"

"گلگت سے آگے ہے...... دور ہے......"

"تو تم نے ابھی کیوں جانا ہے......"

"میں نے نہیں...... مہمان نے جانا ہے......"

"کہاں جانا ہے؟"

"انہوں نے شمشال جانا ہے۔"

"کیوں جانا ہے؟"

"بس ماموں...... جانا ہے ناں"

بوڑھا پہلی بار مسکرایا...... اس کے دانت ابھی سلامت تھے مجھ سے بہتر حالت میں تھے...... اور سر ہلایا...... یا شاید خود نہیں ہلایا...... خود بخود ہلتا تھا "پاگل لوگ شمشال جاتے ہیں۔"

"یہ پاگل ہے ماموں......" فضل نے سر جھٹک کر میری جانب ایک "آپ تو سمجھتے ہوناں" کی شرارت آمیز نظر ڈالی......

"اسے کہو کہ ادھر ٹھہر جائے...... عرق پئے اور راکاپوشی کے سائے میں سو جائے...... اسے اور کیا چاہیے...... شمشال نہ جائے۔"

"پاگل ہے ماموں...... نہیں مانے گا۔"

"فضل تم دو گھنٹے ٹھہرو گے؟" اس نے پھر پوچھا...... شاید وہ اس کے پوتے پوتیاں تھے یا پڑپوتے...... پڑپوتیاں تھے...... خوش شکل بچے تھے...... وہ کھیتوں میں سے...... کچے کمروں میں سے جھانک جھانک کر ہمیں دیکھتے تھے اور وہ بڑھیا انہیں بار بار ڈانٹتی تھی اور انہیں عرق کے کنستر اٹھانے کو کہتی تھی۔

"نہیں نہیں ماموں...... میں نہیں ٹھہر سکتا......"

"تم ٹھہرو تو میں ایک بھیڑ ذبح کرتا ہوں مہمان کے لئے...... اسے پکانے میں دو گھنٹے تو لگیں گے...... تم ہمیشہ جلدی میں ہوتے ہو...... آج ٹھہر جاؤ...... بھیڑ ذبح کرتا ہوں۔"

"نہیں ماموں......"

میرے بس میں ہوتا تو میں سب کچھ تیاگ کر یہیں ٹھہر جاتا لیکن فضل "نہیں ماموں" کہہ چکا تھا...... ورنہ اس نامانوس اور کچے گھر میں...... راکاپوشی کی سفیدی کے سامنے کچھ وقت بسر کرنا اور ایک عدد بھیڑ تناول کرنا بہت جدا اور نہ بھولنے والا تجربہ ہوتا......

بڑھیا کی کوئی پڑپوتی وغیرہ چائے اور بسکٹ لے آئی......

بوڑھا ہمیں بھیڑ کی آفر کرنے کے بعد کچھ لاتعلق سا ہو گیا...... ہماری آمد سے پیشتر جس خواب میں تھا...... جس بھی خیال میں گم تھا...... وہیں واپس چلا گیا......

"اماں جی...... آپ کیسے جان جاتی ہیں کہ شہتوت کا عرق اب تیار ہو گیا ہے...... کچا نہیں...... پک گیا ہے...... اور اس میں خمار آ گیا ہے؟" میں نے ایک صحافیانہ سوال پوچھا اور فضل کے توسط سے پوچھا کہ مائی صاحبہ اردو سے ناواقف تھیں......

فضل نے ترجمہ کیا اور پھر بڑی اماں...... بلکہ بہت ہی بڑی اماں کا جواب تحمل سے سنا اور پھر میری طرف دیکھا "خالہ کہتی ہیں کہ ستر برس ہو گئے ہیں مجھے عرق چکھتے ہوئے...... تو مجھے نہیں معلوم ہو گا...... تو اور کس کو معلوم ہو گا......"

شمال کی بلندیوں پر...... ان میں پوشیدہ...... لاہور یا کراچی میں بیٹھے ہوئے نہ سمجھ میں آنے والے...... نہ قیاس میں آنے والے...... جن بے مثال اور داستانوی کرداروں سے میری ملاقات ہوئی تھی...... یہ بوڑھی اماں ان میں سپریم تھیں...... اور میرے ہنزہ ٹرپ کی حاصل تھیں...... سیاحت کانفرنس کے تمام تر مندوبین...... شمال کے سیانے بیانے اور دانشور

ایک طرف...... ہوٹل روپل اور دربار ہوٹل کے شاہانہ نظارے ایک طرف...... اور یہ اماں جان' ایک طرف! میں ان کے بارے میں صرف چند سطریں لکھ سکتا تھا...... لیکن اس مائی جی کے بارے میں ایک ناول لکھ سکتا تھا...... نارمل اور شریف کرداروں میں کوئی دلکشی نہیں ہوتی' تخلیقی امکانات نہیں ہوتے...... جن لوگوں کے راستے معاشرے کے لگے بندھے اصولوں سے الگ ہوتے ہیں صرف وہی بڑی تخلیقات کا سبب بنتے ہیں......

یہ بڑھیا...... ہمارے رہن سہن کے کڑے اصولوں سے الگ تھلگ...... ان قراقرمی بلندیوں پر ان سے بے خبر...... ایک اپنی...... ہمارے لئے ایک گنہگار...... ایک اپنی قدیم روایت کی پیروی کرتی تھی۔ ایک قدرتی عمل کی نگہبانی کرتی تھی...... اور اسے اسی طرح سرانجام دیتی تھی...... کسی بھی احساس جرم کے بغیر...... جیسے ہم سکنجبین بناتے ہیں...... جیسے ہم عرق گلاب یا عرق گاؤزبان بناتے ہیں...... ویسے وہ شہتوت کا عرق بناتی تھی......

بوڑھا اپنے تخت پوش پر اونگھتا...... بیدار ہوا...... ہمیں دیکھ کر ذرا حیران ہوا "فضل تم ابھی تک یہاں ہو......"

"ہاں ماموں......"

"تم اگر دو گھنٹے ٹھہر جاؤ تو میں بھیڑ ذبح کروں گا...... مہمان کے لئے......"

"نہیں ماموں...... ہمیں جانا ہے......"

"شمشال صرف پاگل لوگ جاتے ہیں......" اس نے کہا اور پھر سے اونگھنے لگا......

''گل مت اور ان پہاڑوں کے پیچھے شمشال ہے''

''ان پہاڑوں کے پیچھے شمشال ہے......'' ڈرائیور رحمان نے ونڈسکرین پر نوکیلے ہوتے' ابھرتے جیسے تمام بچے نوکیلے تکون نما پہاڑ اپنی ڈرائنگ کی کاپیوں میں بناتے ہیں...... ایسے ہی پہاڑ تھے جن کی جانب رحمان نے اشارہ کر کے کہا کہ ان کے پیچھے شمشال ہے......

میں انہیں درجنوں بار دیکھ چکا تھا......

اور ہر بار انہیں دیکھ کر حیران ہوتا تھا......

یہ پسّو کونز تھیں......

جیسے اللہ میاں نے ابھی پہاڑ تخلیق نہیں کئے تھے تو اُنہوں نے بچوں سے کہا کہ تم ذرا اپنی ڈرائنگ کی کاپی میں پہاڑ بنا کر دکھاؤ کہ وہ تمہارے ذہن میں کیسے آتے ہیں...... اور پھر انہیں ویسا ہی بنا دیا جیسا کہ بچوں نے بنایا تھا...... نوکیلے اور تکون نما......

دنیا بھر میں اپنی اس نوکیلی بلندی اور شباہت میں یکتا...... پسّو کونز......

اور ان کے پیچھے کہیں شمشال تھا......

اور جونہی ڈرائیور نے اشارہ کر کے کہا تھا کہ ان کے پیچھے شمشال ہے تو مجھ میں اس وادی کی دورافتادگی اور تنہائی در آئی......

پسّو کونز اتنی سربلند اور ناقابل عبور تھیں کہ ان کے پیچھے کوئی بھی وادی کیسے ہو سکتی تھی...... لیکن شمشال...... تھی!

ہمیں گل مت سے نکلے ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے...... اور سورج بلند ہو رہا تھا۔ دریائے خنجراب کا پاٹ وسیع ہو رہا تھا اور اس کے پار پسّو کونز کی ڈھلوانوں پر ایک خوش نظر بستی

تھی...... اور اس کے چولہوں سے دھواں اٹھتا تھا...... اور ہم پسّو کے قصبے کی جانب شاہراہ ریشم کی جان پہچان میں...... کہ ہم درجنوں بار ان راستوں پر آ چکے تھے...... سفر کرتے ہوئے۔

ہمیں گل مت سے نکلے ہوئے اب سولہ منٹ ہو چکے تھے......

لیکن ہم گل مت میں کیا کر رہے تھے؟

میں اور فضل احمد جب اس بلندی سے نیچے آئے...... جہاں اس بڑھیا کا گھر تھا اور اس کا خاوند ہمیں دو گھنٹے ٹھہرنے کو کہتا تھا...... ایک بھیڑ ذبح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا...... اور واپس شاہراہ ریشم پر آئے اور پھر کریم آباد پہنچے تو دربار ہوٹل میں سیاحتی کانفرنس آخری دموں پر تھی......

لابی میں...... مارکوپولو شیپ کے سینگوں...... قدیم توڑے دار بندوقوں اور پتھروں کے ظروف کی قربت میں ایک دھنس جانے والے صوفے میں ڈھیر گل مت کے راجہ صاحب سے ملاقات ہو گئی......

وہ نہایت معصوم...... بچہ طبیعت کے...... سوئے سوئے سے راجہ صاحب تھے...... مخاطب کی طرف نہیں دیکھتے تھے...... جانے کہاں دیکھتے تھے......

''آپ نے آج پسّو جانا ہے تارڑ صاحب......'' انہوں نے ایک لاپرواہ خوابیدہ انداز میں دریافت کیا......

''جی جناب......''

''راستے میں ہمارا گل مت ہے۔''

''میں جانتا ہوں سر...... اور میں وہاں اپنے خاندان کے ہمراہ ''مارکوپولو ان'' میں قیام کر چکا ہوں......''

''کر چکے ہیں؟'' وہ چونک گئے ''یہ کب کی بات ہے؟''

''بہت برسوں کی بات ہے......''

''تو مجھے کیوں نہیں بتایا......'' وہ ناراض ہو گئے ''وہ میرا ہوٹل ہے...... مجھے کیوں نہیں بتایا۔''

''آپ کے داماد' ڈاکٹر نیامت شاہ میرے پرانے دوستوں میں سے ہیں...... ان کو بتایا تھا۔''

''آپ نیامت کو جانتے ہیں؟'' وہ خوش ہو گئے ''تو پھر آپ سیدھے پسّو نہیں جائیں گے...... آج رات گل مت میں بسر کریں گے...... یہاں کونسے ہوٹل میں ہیں؟''

"نیچے...... پی ٹی ڈی سی موٹل میں......"

"میں ادھر سے آپ کو اٹھالوں گا...... میرے ساتھ چلیں گے...... کتنے بجے؟...... پانچ بجے؟"

"میرے ہمراہ دو ساتھی بھی ہیں اور شمشال جانے کے لئے کچھ سامان بھی ہے۔"

"بہت سامان ہے؟" وہ قدرے فکر مند ہو گئے۔

"بہت تو نہیں...... لیکن کافی ہے...... اگر آپ کو کوئی پرابلم ہے تو ہم بہ نفس نفیس خود بخود آج شام تک گل مِت پہنچ جائیں گے۔"

"نائیں...... ہم راجہ ہیں' ہمیں کوئی پرابلم نہیں...... ہم آپ کو اٹھالیں گے......" انہوں نے سوئے ہوئے آنکھیں ذرا کھولیں اور پھر بند کر لیں۔

پچھلے پہر کانفرنس کا اختتام ہوا...... اور میلہ اجڑ گیا...... وہ جو میلہ دیکھنے آئے تھے اب گھروں کو لوٹنا چاہتے تھے...... مندوبین سے بھری ہوئی ویگنیں اور کوسٹر کریم آباد سے اتر کر شاہراہ ریشم پر آتے تھے اور میرے ہوٹل کے صحن کے سامنے سے گزرتے ہوئے گلگت کی جانب رواں ہوتے تھے...... کچھ لوگ کھڑکیوں میں سے ہاتھ نکال کر مجھے خدا حافظ کہتے تھے اور میں نہایت بے چین ہوتا تھا...... میں میلے میں گم ہو جانے والے بچے کی طرح تنہا کھڑا تھا...... وہ وطن کو جاتے تھے اور میں ان سے مخالف سمت میں پسّو جا رہا تھا......

سعید شیخ یہیں پر مجھ سے جدا ہوئے......

"سوری تارڑ صاحب......"

"نائیں...... ہم راجہ ہیں' ہمیں کوئی پرابلم نہیں......" میں ہنسا لیکن ان سے بچھڑنے پر کچھ دل گرفتہ بھی ہوا۔ آج سویرے ایک عرق کشید کرنے والی نوّے برس کی بڑھیا اپنے خاوند کی جانب دیکھتی تھی اور وہ کہتا تھا کہ شمشال کو جانے والے پاگل لوگ ہوتے ہیں...... یہ بہتر ہوا کہ آپ ذی ہوش نکلے...... لاہور پہنچ کر میرے گھر فون کر دیجئے گا کہ میں کریم آباد سے آگے نکل گیا ہوں...... میں کانفرنس کی گہما گہمی میں گھر والوں سے رابطہ نہیں کر سکا......"

سعید شیخ مجھ سے جدا ہوئے تو مجھے قلق ہوا...... وہ اگر میرے ساتھ چلتے تو وہ بھی آزاد ہو جاتے اور انہیں بہت سی کہانیاں ملتیں......

راجہ صاحب آف گل مِت اور ان کے کراؤن پرنس حسین...... وہ بھی قدرے سوئے سوئے اور پر سکون تھے مجھے اٹھانے کے لئے پورے پانچ بجے ہوٹل پہنچ گئے...... "آئیں تارڑ صاحب...... اوہو سامان تو بہت ہے......"

ہم گنیش کا پل پار کر کے دریائے ہنزہ کے دوسری جانب چلے گئے...... ہنزہ کی مقدس چٹانوں پر یہاں سے گزرنے والے...... ہزاروں برس پیشتر گزرنے والے مسافروں اور بھکشوؤں کے آٹوگراف تھے...... مارخور تھے...... شکار کے منظر تھے اور شکلیں تھیں اور ان کے اوپر دریا کے پار اَلتت کا قلعہ ایک ناقابل یقین بلندی پر معلق تھا......

یہ ایک عجیب حقیقت تھی کہ گلگت سے کریم آباد تک پہاڑی منظر کسی حد تک تہذیب یافتہ اور پر کشش ہیں لیکن کریم آباد سے آگے یکدم ایک خاموش ویرانی شروع ہو جاتی ہے......

یوں بھی شام ہو رہی تھی......

ہم گل مِت پہنچ گئے......

"مارکوپولو ان" گل مِت کا اولین ہوٹل ہے...... شاہراہ سے ذرا اوپر گاؤں کی قربت میں...... اس کے کمرے سے بے حد گھریلو' نیچی چھتوں والے اور کوزی تھے...... کمبل صاف ستھرے اور بستر کی چادریں سفید اور بے نشان تھیں...... سائیڈ ٹیبل پر ایک طشتری میں خوبانیوں کے بادام اور کشمش تھی......

بستروں کے اوپر مستطیل چوکھٹوں والے روشندانوں میں سے انگور کی بیلیں نظر آتی تھیں اور ان کی شاخوں پر سبز اور باریک دانوں والے کچے خوشے تھے جن کے پکنے میں ابھی دیر تھی...... کچے سیب تھے...... اور یہ ان روشندانوں کے آگے پردہ کرتے تھے...... میں نے اس کمرے میں ہوٹل روپل کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ پر سکون محسوس کیا اور پر عافیت۔

ڈنر پر راجہ حسین بھی موجود تھے اور یہ ایک پر تکلف طعام تھا اور وہ نیم خوابیدہ آنکھوں سے ہمیں تکتے تھے اور کہتے تھے...... "آپ ہنزہ کے بادام کھائیں...... کچھ خوبانیاں نوش کریں......"

اور اب ہم راجہ صاحب کی ویگن میں صبح سویرے گل مت سے پسّو کی جانب سفر کرتے تھے...... اور ڈرائیور رحمان نے کہا تھا...... "ان پہاڑوں کے پیچھے شمشال ہے......"

”پسوّ میرا پسندیدہ...... حقیقت کے پاس“

شاہراہ ریشم نے کچھ بل کھائے...... ”بورت لیک“ کا بورڈ گزر گیا...... ایک اور موڑ آیا......اور میں سامنے نظریں جمائے منتظر ہوا کہ ابھی کسی ایک موڑ کے بعد دنیا کا ایک عظیم ترین منظر مجھ پر کھلے گا...... پسو گلیشیر اور اس پر سایہ فگن برفانی چوٹیاں نگاہوں کو بھر دیں گی...... کوئی بھی جگہ خالی نہیں بچے گی...... گلیشیر اوپر سے بہتا ہوا آئے گا ہمارے قدم لینے کے لئے اور روڈ کے قریب آکر رک جائے گا......اور یہیں سے ہم یکدم نیچے اتریں گے اور دائیں جانب پسو کا گاؤں نظر آنے لگے گا......

میں جب اپنی نیلی سوزوکی پر آیا تھا تو ادھر رک گیا تھا...... سچی بات ہے پہلی بار اس منظر کو بچھا دیکھا تھا تو دم بھی رک گیا تھا......

اور میں جب اپنی سفید خیبر LOC 332 پر یہاں پہنچا تھا...... تب بھی رک گیا تھا......

لیکن آج نہیں رک سکتا تھا کیونکہ میں پرائی سواری پر تھا......

پاکستان کے ڈاک کے ایک ٹکٹ پر یہی منظر نقش ہے...... ہم اس میں سے گزرنے لگے اور پسو کے پھیلاؤ میں اترتے گئے......

پھر روڈ ہموار ہوئی تو گلیشیر کے اختتام پر رکا ہوا ایک پتھریلا مکان دکھائی دیا......

چند درخت اور ایک چاردیواری نظر آئی......

یہ عظیم کا ”شیسپر ویو ہوٹل“ تھا...... جہاں میں پہلی بار ٹھہرا تھا......

ہم اس کی قربت میں سے گزر گئے...... صحن میں ایک نیلا ٹینٹ اور چند غیر ملکی دکھائی دیئے...... ہم پسو گلیشیر میں سے اترتی ہوئی ندی کے اس پل پر سے بھی گزر گئے جہاں ہمیشہ

ہوا تیز ہو جاتی تھی اور صابر قاضی کہتا تھا کہ تم نے اس پل پر رکنے کی منت مانی ہوئی ہے کیونکہ میں ہمیشہ رک جاتا تھا اور میرا لباس تیز ہوا سے تھر تھرانے لگتا تھا...... یہ ہوا اس جھیل سے آتی تھی جسے ماسٹر حقیقت اور پسو چند باسیوں نے ”تارڑ لیک“ کا نام دیا تھا...... ماسٹر حقیقت رخصت ہوئے تو تارڑ لیک بھی رخصت ہو گئی......

ہم پسو کے مرکز میں آئے جہاں دائیں جانب گاؤں دریا تک اترتا تھا اور بائیں ہاتھ پر چٹانیں بلند ہوتی تھیں جن کے سائے میں ایک دوکان اور ”پسو اِن“ کی آماجگاہ تھی...... لیکن ہم رکے نہیں...... آگے چلے گئے...... نیچے اترے تو ”بتورہ اِن“ سڑک کے کنارے تھا لیکن ہم اس سے بھی آگے بڑھ گئے...... جہاں سڑک کے دونوں جانب ہموار علاقے تھے...... پھر خاصے فاصلے پر ”پسو ٹورسٹ لاج“ بتورہ گلیشیر کے دامن میں...... ایک ویرانی میں دکھائی دیا......نویں نکور عمارت لیکن دھوپ میں اور تنہائی میں...... گاؤں سے دور...... لیکن خنجراب سے پلٹنے والے مسافروں کے لئے نہایت موزوں......

لیکن ہم اپنی پرانی آماجگاہیں چھوڑ کر اس ویرانے میں کیوں آ گئے تھے......

صرف سید جان کی وجہ سے......

”رویل ہوٹل“ میں سید جان چیف شیف تھا اور اکثر اپنی خوراک تیار کرنے کی اہلیت کو مجھ پر آزماتا تھا اور پرذائقہ پکوان صرف میرے لئے تیار کرتا تھا...... جب اسے میری شمشال مہم کا علم ہوا تو اس نے اپنے برادر اکرام کو خصوصی طور پر پسو سے گلگت طلب کر لیا کہ آؤ اور تارڑ کی معاونت کرو...... اکرام نے اس مہم کے لئے ضروری سامان...... چولہے 'کراکری' پریشر ککر' ڈرم وغیرہ مہیا کرنے کا ذمہ لے لیا......

”پسو ٹورسٹ لاج“ ان دنوں اسی کی نگرانی میں تھا اس لئے ہم یہاں تک آ پہنچے تھے......

پی ٹی ایل...... پسو سے دور ایک ریتلے ویرانے میں وائلڈ ویسٹ کی ایک بار کی مانند تھا جہاں ہر قسم کی سہولت میسر تھی...... ہنزہ کی ثقافت سے سجاوٹ شدہ اور ہر وقت موسیقی شدہ کہ وہاں ہمہ وقت ایک ناتمام کیفیت کی ایک ہی موڈ کی موسیقی مسلسل سنائی دیتی رہتی تھی......

یہ ریتلی ویرانی میں ایک دوسرے سے الگ الگ کمروں کا ہوٹل تھا...... وہاں صرف ہم تھے...... یا ایک دو غیر ملکی تھے جو رات بسر کرنے کے بعد گلگت کی طرف کوچ کر

تھے......کارگل میں جنگ جاری تھی اور غیر ملکی سیاح قابل فہم طور پر ان علاقوں سے گریز کرتے تھے......

ابھی سویر تھی......اور ہم یہاں پہنچ گئے تھے......

اب ہمارا منصب صرف انتظار کرنا تھا......کہ کب رجب شاہ آئے اور شمشال مہم کی منصوبہ بندی شروع ہو......بڑے بڑے کارٹن' ڈرم اور تھیلے ہمارے کمرے میں ٹھنسے پڑے تھے......ابھی صبح کا آغاز تھا......

ہم گلمِت سے پراٹھوں اور دیسی انڈوں کا بھرپور ناشتہ کر کے نکلے تھے......تو اب ہم کیا کریں......

اسحاق کریم کو ہماری آمد کی خبر ہو چکی تھی......

وہ شمشالی تھا اور شمشال روڈ پر اپنی جیپ وہاں تک لے جاتا تھا جہاں تک روڈ جاتی تھی......اس کے ساتھ ہم نے معاملات طے کئے کہ کل سویر آپ ہمیں وہاں تک لے جائیں گے جہاں تک روڈ جاتی ہے لیکن فی الحال آپ ہمیں پسوّ گاؤں میں ڈراپ کر دیں کہ یہاں سے وہاں تک فاصلہ بہت ہے اور دھوپ میں تیزی آرہی ہے......

پسوّ پہنچ کر "پسوّان" کی قدیمی رہائش گاہ کے مالک غلام محمد سے ملاقات ہوئی......"اِن" کے مختصر باغیچے میں مختصر درختوں پر چیریوں کی سرخ بہار تھی......اور کون ہے جو ایک شاخ میں پروئی سرخ چیری کو دیکھے اور اس کی جانب ہاتھ نہ بڑھائے......نہایت رس بھری اور پرذائقہ......

غلام محمد' ماسٹر حقیقت کے نزدیکی رشتے دار تھے "قبرستان کدھر ہے؟" میں نے ان سے پوچھا......

انہوں نے ایک نوجوان کو ساتھ کر دیا "وہ اوپر......پسوّ اِن پر جھکی ہوئی چٹان کے عین اوپر......ذرا آگے جائیں تو وہاں ایک راستہ بلند ہوتا ہے......"

اوپر ہوا تیز تھی......

اوپر جہاں سے پسوّ کا گاؤں پھیلتا ہوا پورے منظر پر حاوی ہوتا تھا اور پسوّ کونز عین مقابل میں سجی ہوئی نیلے آسمان میں بلند ہوتی تھیں وہاں چٹانوں پر ایک ہموار جگہ تھی اور جہاں

پتھریلی زمین میں سے احتجاج کرتے ہاتھوں کی مانند درجنوں کتبے بلند ہو رہے تھے......

قبرستان کے سرے پر ایک بجھتی ہوئی عبارت والا کتبہ تھا "ماسٹر محمد حقیقت......واخی زبان کے موجد......" اور کتبے پر واخی رسم الخط میں کچھ کندہ تھا......واخی کو ایک تحریری زبان بنانے میں ماسٹر حقیقت نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا......

میں نے تیز ہواؤں اور دھوپ میں......پسوّ میں اپنے سب سے قدیمی دوست کے لئے دعائے مغفرت کی......میں اس کی قبر دیکھتا تھا اور اسے یاد کرتا تھا اور ان زمانوں کو یاد کرتا تھا جب وہ ایک شب "شیسپر ویو ہوٹل" میں پہلی بار مجھ سے ملنے آئے تھے......جب انہوں نے درہ خنجراب سے واپسی پر ہمارا راستہ روک لیا تھا کہ تارڑ صاحب آپ کھانا کھا کر آگے جائیں گے اور ہمارے لئے ایک بکرا ذبح کیا تھا......تب ان کی بہت ضعیف اور لاچار والدہ حیات تھیں۔ والد صحت مند تھے اور وہ خوش تھے کہ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ماسٹر حقیقت کو اولاد نرینہ سے نوازا ہے......ان کے گھر کے باغ میں بکرا ذبح کیا گیا تھا اور ہم......میں اور میرا خاندان اور قاضی اور اس کے بال بچے برآمدے میں غالیچوں پر بیٹھے ان کی محبت اور مہمان نوازی سے شرمندہ ہوتے تھے۔

اب وہ اس جہان میں نہیں تھے......

ماسٹر حقیقت......جو ایک یاک فارم بنانے کے خواب دیکھتے تھے......ٹریکنگ پر ایک کتاب کے مصنف تھے......پسوّ کی جھیل کو ہمیشہ تارڑ لیک لکھتے اور بولتے تھے......واخی زبان اور کلچر کے داعی تھے......اور میرے دوست تھے......اس چٹانی بلندی میں دفن تھے......وہ نہیں جانتے تھے' یا شاید جانتے تھے کہ ان کا ایک دوست لاہور سے ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے آیا ہے اور ان کی بے مثل دوستی کو یاد کرتا ہے......

جیسے احمد داؤد کے جانے سے میرے لئے اسلام آباد ویران ہو گیا تھا......ایسے ماسٹر حقیقت کے رخصت ہونے سے پسوّ میں وہ کشش نہ رہی تھی......

دوپہر کا کھانا ہم نے "پسوّان" میں کھایا اور غلام محمد صاحب نے ہمیں کھلایا......

وہاں سے ہم آگے چلے گئے......پُل کے پار......شیسپر ویو ہوٹل تک مارچ کرتے چلے گئے اور عظیم سے ملاقات کی......ایک کرٹسی کال کی......اس نے سلجوق کا پوچھا اپنے بیٹے کے

بارے میں بتایا اور پھر کارگل جنگ کے بارے میں باتیں کرنے لگا...... "صاحب پچھلے باون برس میں ہم نے اس سے بڑی کامیابی حاصل نہیں کی...... ادھر ہائٹ پر چند سو لوگ بیٹھے ہیں اور ہندوستان کی ایئر فورس ہے' توپ خانہ ہے...... فوج ہے لیکن وہ لوگ بہادر لوگ ہیں...... بیٹھے ہیں...... تو حکومت اب وہاں ٹھہر جائے تو ٹھیک ہے...... قربانی کا فائدہ ہے...... نہ ٹھہرے تو پھر کیا فائدہ ہے...... بس جان ضائع ہو گیا......"

میں نے اُس کمرے کو ایک نظر دیکھا جس میں میں پہلی بار ٹھہرا تھا...... اُور میں اِس برآمدے میں بیٹھا تھا جہاں ماسٹر حقیقت میرے سامنے آبیٹھے تھے...... اور پھر ان کمروں کو دیکھا جن میں دوسری بار قیام کیا تھا اور یہیں سلجوق بہت بیمار ہو گیا تھا اور ماسٹر حقیقت ہمیں غل کن میں ڈاکٹر نیامت شاہ کے پاس لے گئے تھے......

ہم واپس ہوئے...... پسّو تک آئے...... بتورہ اِن تک اترتے گئے...... پیدل چلتے چلتے بے حال اور نڈھال ہو گئے...... تارکول کی سڑک پر ٹھپ ٹھپ کرتے چلتے گئے...... لیکن پی ٹی ایل بہت ہی دور تھا...... اور دھوپ بہت ہی تیز تھی...... ہم بہت بیزار ہوئے...... ٹھیک ہے شمشال کے راستوں پر چلتے ہوتے تو کوئی بات بھی تھی لیکن کسی ہوٹل تک پہنچنے کے لئے یوں چلنا تو کوئی بات نہ تھی...... لیکن اتنی دور پہنچنے کے بعد ہمیں اپنے کمرے میں ایک بے مثال آرام ملا...... ایک گہرا اطمینان ملا...... ہم تھکے ہوئے اور مرجھائے ہوئے بستروں پر بچھے سلیپنگ بیگز پر اوندھے ہو گئے...... سو گئے...... باقاعدہ مر گئے......

"پسّو میں پولیس...... پھر مزید پولیس"

اور جب بہت دیر تک سوئے رہے...... مرے رہے...... تو دستک ہوئی۔

تادیر دستک ہوتی رہی......

مرے ہوئے اتنی آسانی سے تو بیدار نہیں ہوتے لیکن بالآخر ہونا پڑا۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا...... تو باہر ایک آنکھوں کو چندھیا دینے والی ریتلی خشک ہوا بگولوں کی صورت میں اٹھتی تھی اور ایک ویٹر نما لڑکا کھڑا تھا......

"صاحب...... آپ کو پولیس لینے آیا ہے......"

"پولیس......" میں نے حلق میں جمع تھوک نگل کر کہا "پولیس؟"

آپ بے شک ساری عمر ایک غار میں بیٹھ کر یادِالٰہی میں غرق رہیں...... عبادت کرتے رہیں لیکن اس کے باوجود آپ کی غار پر اگر دستک دے کر کوئی اعلان کرے کہ پولیس...... تو بھی آپ کے ہاتھوں کے متعدد طوطے اڑ جائیں گے اور آپ پریشان ضرور ہوں گے کہ یااللہ خیر...... "کہاں ہے پولیس؟"

"ادھر ہوٹل میں بیٹھا ہے۔"

ادھر ہوٹل کے ڈائننگ روم میں ایک مقامی شکل کا نوجوان جو چہرے مہرے سے سراسر پولیس تھا مجھے دیکھ کر نہایت مؤدب ہو گیا "جی آپ کا نام تارڑ صاحب ہے؟"

"جی فرمایئے۔"

"سر میں پولیس کا اہلکار ہوں اور آپ کے ساتھ شمشال جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"ایس ایس پی گلگت میر افضل خان کا حکم آیا ہے......"

مجھے میر صاحب پر بڑا غصہ آیا کہ خواہ مخواہ ترا نکال دیا تھا...... میں نے اس نوجوان کو سمجھایا وہ نہیں سمجھا تو پھر سمجھایا اور پھر بھی نہیں سمجھا تو پھر سمجھایا کہ برادر مجھے شمشال کے راستے میں کوئی خطرہ درپیش نہیں آپ تکلیف نہ کریں' مجھے آپ کی ضرورت نہیں لیکن حکم حاکم تھا' وہ سر ہلاتا چلا جاتا تھا کہ صاحب ہمارا ڈیوٹی لگ گیا ہے......

"میر صاحب نے آپ کو حکم دیا ہے؟"

"نہیں صاحب...... وہ تو بہت بڑا افسر ہے...... ہمارا تو بس ڈیوٹی لگایا گیا ہے......"

"اچھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا" میں نے تادیر دانشمندی سے سر ہلایا "میر صاحب سے تو ابھی ابھی فون پر میری بات ہوئی ہے تو میں نے ان کو بتایا تھا کہ مجھے پولیس کی ضرورت نہیں تو انہوں نے کہا ٹھیک ہے جو بھی آئے اسے واپس بھیج دو...... آپ واپس جاؤ ایس ایس پی صاحب کا حکم ہے......"

"صاحب......" آخر پلسیا تھا جان گیا کہ پارٹی کچھ گڑبڑ کر رہی ہے اس لئے تھوڑا سا تامل کیا اور پھر کہنے لگا "صاحب...... ہمیں لکھ کر آرڈر کر دو۔"

میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر آرڈر کر دیا کہ یہ نوجوان ڈیوٹی پر حاضر ہوا تھا اسے فارغ کیا جاتا ہے...... میں نے نوجوان کو یہ آرڈر تھمایا تو وہ کھل اٹھا...... میں نے محسوس کر لیا تھا کہ شمشال جانے کے خیال سے اس کا چہرہ پہلے اترا ہوا تھا...... اس نے مجھے بخوشی ایک سلوٹ مارا اور چلا گیا......

کمرے میں واپس آ کر ابھی سلیپنگ بیگ پر دراز ہو کر ایک انگڑائی سی لینے کو ہی تھا کہ پھر دستک ہوئی......

باہر پھر وہی ویٹر نما لڑکا تھا "صاحب اور پولیس آ گیا ہے۔"

میں پھر پاؤں پٹختا ہوٹل کے ڈائننگ روم میں پہنچا تو وہاں واقعی اور پولیس تھا اور کافی پولیس تھا۔ ایک باریش اور سمارٹ ڈی ایس پی صاحب نے کیپ اتار کر میری جانب ہاتھ بڑھا دیا "میرا نام اقبال ہے...... علی آباد ہنزہ کے تھانے کا انچارج ہوں...... میر صاحب کا حکم ہے کہ تارڑ صاحب کو پولیس کی حفاظت میں شمشال پہنچایا جائے۔"

ان کے ہمراہ دو باوردی سپاہی بھی تھے۔

اب مجھے میر صاحب پر غصہ نہیں...... پیار آیا...... کہ کیسا پرخلوص اور محبت بھرا ہوا شخص ہے کہ میرے لئے اتنا فکرمند ہے...... بہرحال میں نے اقبال صاحب سے بھی بڑی تفصیل سے عرض کیا کہ...... یہ میر صاحب کی محبت کا اظہار ہے لیکن مجھے قطعی طور پر پولیس پارٹی کی ضرورت نہیں...... شمشال تو صرف پاگل لوگ جاتے ہیں اور ڈاکو وغیرہ اتنے پاگل نہیں ہوتے کہ شاہراہ ریشم کو چھوڑ کر شمشال کے راستوں پر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر کسی چٹان سے لٹک رہے ہوں اور میرا انتظار کریں کہ میں کب وہاں سے گزروں اور وہ میرا لوٹا...... آلو اور سوکھی ہوئی سبزیاں' پنیر اور مچھلی کے ڈبے' چاول اور دالیں...... اور چند بوسیدہ ٹی شرٹیں لوٹ کر فرار ہو جائیں...... اور فرار ہوتے ہوتے بے شک دریائے شمشال میں جا گریں۔ اقبال صاحب نے بھی کبھی شمشال کا رخ نہیں کیا تھا اور وہ بھی کچھ واضح نہیں تھے اس کی لوکیشن کے بارے میں...... ویسے انہوں نے بار بار اصرار کیا کہ چلئے شمشال کی وادی تک نہ سہی ہم آپ کو وہاں تک چھوڑ آتے ہیں جہاں تک جیپ جاتی ہے لیکن میں نے بھی بار بار انہیں یقین دہانی کروائی کہ پلیز...... آپ زحمت نہ کریں میں گلگت واپسی پر میر صاحب سے بات کر لوں گا......

وہ بڑی ہی مشکل سے مانے......

ویسے اقبال صاحب ایک نہایت بردبار اور خوشگوار شخص تھے اور مجھے ان سے ملاقات کر کے خوشی ہوئی......

میں انہیں فارغ کر کے پھر کمرے میں آیا تو ندیم نے ایک جمائی سی لی' ایک آنکھ کھولی اور مونچھ کے ایک بال کو لبوں سے ہٹا کر سیدھا کیا اور خمار آلود آواز میں کہنے لگا "تارڑ صاحب کدھر گئے تھے؟"

"پولیس آئی تھی......"

"ہیں......" وہ چھلانگ مار کر اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں آنکھیں کھول دیں...... مونچھوں کے سب بال مکمل تیر ہو گئے "پولیس آ گئی ہے سائیں......"

"دوسری بار آئی ہے......"

"پہلے بھی آئی تھی...... سائیں اب کیا کریں۔"

بقاء سیانا تھا وہ اپنے کمبل میں پوشیدہ بولا "اوئے سویارہ جانگلوس...... فکر نہ کر...... تارڑ صاحب کی یاریاں ہیں ان علاقوں میں...... پولیس والے بھی جاننے والے ہوں گے......"

"کیوں تارڑ صاحب......" ندیم جانے کیوں پریشان ہو رہا تھا...... بعد میں معلوم ہوا کہ کیوں پریشان ہو رہا تھا......

"بقا درست کہتا ہے...... سو جاؤ۔"

"کوئی خطرہ تو نہیں سائیں!"

"نہیں۔"

اس کی تھوڑی سی تسلی ہوئی اس لیے مونچھوں کے تھوڑے سے بال اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹے......

"رجب نہیں آیا سائیں؟"

"نہیں آیا...... تم سو جاؤ۔"

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔

ندیم جو ایک سست انگڑائی کو مکمل کرنے کے مراحل طے کرنے کو تھا پھر پھدک کر بیٹھ گیا "تارڑ صاحب......"

مجھے یقین تھا کہ اب کی بار دروازے کے بارے میر صاحب بہ نفسِ نفیس کھڑے ہوں گے لیکن وہاں...... رجب شاہ تھا...... اپنے کھنچے ہوئے چہرے، جھکی ہوئی کمر اور اس پر بنے پلیٹ فارم کے ساتھ...... پاکستان کا سب سے کامیاب کوہ پیما...... اور ہمارا گائیڈ رجب شاہ کھڑا تھا...... ایک نیلی جین اور چیک شرٹ اور کنپٹیوں پر سفید ہوتے بالوں کے ساتھ مسکراتا ہوا......

اسے دیکھ کر...... کہیں ایک جنگل کو نپلوں کا پھوٹنا...... اور ہر کونپل جو پھوٹتی تھی پیار سے سرگوشی کرتی تھی، شمشال...... شمشال......

اسے دیکھ کر...... دل کو بہت ڈھارس ہوئی کہ اب ہم واقعی شمشال جائیں گے......

"اسحاق ڈرائیور سے آپ کی بات ہو گئی ہے...... میں بھی پسّو میں اس سے مل کر آیا

ہوں...... وہ صبح ساڑھے چھ بجے آ جائے گا...... اور ہمیں دوت کے آگے روڈ کیمپ تک لے جائے گا...... میں نے شمشال پیغام بھیج دیا ہے پورٹروں کے لئے...... وہ بھی کل روڈ کیمپ پہنچ جائیں گے...... ابھی سارا سامان پیک کریں گے......"

"سامان تو پیک ہے رجب سائیں" بقا بولا......

"نہیں جناب...... اسے ضرورت کے مطابق دوبارہ پیک کریں گے......"

سارے کارٹن اور تھیلے وغیرہ کھول کر رجب نے ہر شے کی فہرست بنائی اور پھر اسے حساب کتاب سے پیک کیا کہ کب کس شے کی ضرورت ہو گی...... ٹن اوپنر کہاں ہے اور کارن فلیکس کا ڈبہ کدھر ہے...... کسی بھی مہم کے لئے سامان کی پیکنگ بھی ایک مکمل آرٹ فارم ہے...... اگر آپ نے اسے آرگنائز نہیں کیا تو ایک نیل کٹر تلاش کرنے کے لئے یا پھٹی ہوئی جین سینے کے لئے سوئی دھاگا ڈھونڈنے کے لئے کسی گلیشیر یا کیمپنگ سائٹ میں آپ کے تمام کارٹن اور ڈرم بکھرے ہوں گے اور انہیں سمیٹنے میں آپ پاگل ہو جائیں گے......

اکرام کی مہیا کردہ کراکری اور اشیائے باورچی خانہ کی چیکنگ ہوئی تو ایک مگ کم تھا...... کانٹے نہیں تھے...... اور سٹوو میں جلانے کے لئے مٹی کا تیل نہیں تھا......

معلوم ہوا کہ مٹی کا تیل کہیں بھی نہیں ہے...... پسّو کے پورے گاؤں میں نہیں ہے......

"آپ فکر نہ کرو...... میں پسّو کے کسی لڑکے کو ادھر سوست روانہ کرتا ہوں وہ رات تک ادھر سے تیل لے کر آئے گا۔"

"چین کے سرحدی قصبے سوست سے ادھر کہیں سے بھی تیل نہیں ملے گا......"

"نہیں......"

"ایک بڑا پلاسٹک کا ڈرم چاہیے...... تاکہ خوراک محفوظ ہو...... بارش میں خراب نہ ہو...... میں ابھی ہنر بیگ کے پاس جاتا ہوں...... وہاں سے لاتا ہوں۔"

"آپ ہنر بیگ کو جانتے ہیں رجب؟" میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"میرا عزیز ہے صاحب...... نزدیکی عزیز ہے......"

"وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے شمشال کے وجود کے بارے میں آگاہ کیا تھا...... بہت

برس پہلے...... جب اس نے مجھے اور میرے بیٹے سلجوق کو پسّو میں اپنے گھر بلایا تھا...... اور میں نے پہلی بار شمشال کا نام اس کے منہ سے سنا تھا......"

"اس نے بتایا تھا صاحب...... اور گلگت میں کانفرنس میں وہ بھی آیا تھا اور آپ کے ساتھ ملاقات کیا تھا......"

"ہاں...... میں نے اسے بتایا تھا کہ ہنر بیگ بے شمار برس پہلے تم نے جو ایک دور افتادہ نام میرے ذہن میں کاشت کر دیا تھا اب اس کی کٹائی کا موسم آگیا ہے اور میں بالآخر وہاں جا رہا ہوں...... تو وہ کہنے لگا...... صاحب میں نے وعدہ تو کیا تھا کہ آپ کو شمشال لے کر جاؤں گا لیکن...... کچھ مجبوریاں ہیں صاحب...... گھر کا اور اولاد کا کچھ مسئلہ ہے...... پتہ نہیں اس کا کیا مسئلہ ہے......"

"اس کا جوان بیٹا فوت ہو گیا ہے......" رجب کے ہونٹ ذرا سے پھڑپھڑائے اور پھر اس نے انہیں سختی سے دانتوں پر بھینچ لیا "اپنے گھر کی دیوار بنا رہا تھا تو پتھر اس پر گر گئے...... مر گیا...... وہ کہہ رہا تھا کہ تارڑ صاحب سے معذرت کرنا کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا...... میں نے بہت برس پہلے ان سے وعدہ کیا تھا کہ میں انہیں شمشال لے جاؤں گا لیکن...... میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا......"

ہنر بیگ کے لئے یہ پوری دنیا تنہا ترین جگہ ہو گئی تھی......

جواں بیٹے کی مرگ باپ کو اندھا کر دیتی ہے...... اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا......

کمرے کے باہر...... ریتلی ہوا میں ٹھنڈک جذب ہونے لگی...... شام ہو رہی تھی اور بتورہ گلیشیر سے آنے والی تیز ہوا اور تیز ہوتی تھی اور دروازے پر دستکیں دیتی تھی...... تو خنکی بڑھتی چلی جاتی تھی...... سردی ہو گئی...... ہوا بہت شور کرتی تھی......

رجب شاہ گاؤں واپس جا چکا تھا......

باہر ہوا شوکتی اور شور مچاتی تھی......

ہم تینوں اپنے اپنے بستروں پر سمٹے بیٹھے تھے......

سفر کی رات کی اداسی کا آغاز ہو گیا تھا...... سامان کے کارٹن اور ہمارے رک سیک...... ان پر بندھے خیمے...... ٹمٹماتے بلب...... ہوا کی شُوکر...... جیسے ناگ شُوکتے ہوں...... اور ہم

تینوں چپ...... لمبی چپ اور باہر رات اور دستکیں دیتی تیز ہوا...... اور اداسی...... اور اداسی کی تہوں میں سے کیا نکلتا ہے...... کیا سفر کی رات میں چپ ہر مسافر کا دل بیٹھتا ہے...... وہ ڈر جاتا ہے...... اپنے آپ میں دبک جاتا ہے...... اور سب کچھ چھوڑ چھوڑ کر گھر لوٹ جانا چاہتا ہے...... چاہتا ہے کہ اگلی صبح تک کچھ ہو جائے اور ایسا ہو جائے کہ یہ سفر ملتوی ہو جائے...... وہ اس سفر پر نہ جائے...... اس سفر پر جس کی منصوبہ بندی کرتے کرتے اس کی عمر بیت گئی ہے......

میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہوتا ہے......

ہم شاید ساری رات یونہی اپنے بستروں پر سمٹے بیٹھے رہے...... یا اونگھ گئے...... یا کبھی سو بھی گئے...... میں بار بار اٹھ کر گھڑی پر نظر ڈالتا تھا......

یونہی رات گزری......

ابھی تاریکی تھی جب میں نے اپنے آپ کو سلیپنگ بیگ کی آغوش میں سے نکالا...... ڈولتا ہوا باتھ روم میں گیا...... اور آئینے میں اپنی عجیب سی ہونق سی شکل دیکھی...... پپوٹے سوجے ہوئے...... آنکھیں سرخ...... ماس ڈھیلا اور بے رُوح...... صبح سویرے اس قسم کی شکل دیکھنے والے کیا شمشال جاتے ہیں...... میں نے اہتمام سے شیو بنائی...... تیار ہوا...... میرے ساتھی ابھی نیند میں تھے...... میں کمرے سے باہر آکر برآمدے میں جا بیٹھا...... وہ اداسی ابھی تک دامن گیر تھی...... میرا پلو جھٹک جھٹک کر کہتی تھی کہ ہوش میں آؤ کہاں جا رہے ہو......

پورے ساڑھے چھ بجے...... پسّو گاؤں کی جانب سے...... ابھی نیم تاریکی تھی...... اس میں دو ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں اور دیر تک میری جانب سفر کرتی رہیں...... اور پھر وہ میری آنکھوں کو چندھیانے لگیں جب اسحاق کی جیپ لاج کے گیٹ میں سے اندر آئی اور لنگریزوں پر ٹائر گھسیٹتی رک گئی......

اس پر سامان لوڈ کیا گیا...... باندھا گیا...... اور جیپ سٹارٹ ہوئی...... شاہراہ ریشم پر واپس آنے کے لئے بیک ہوئی تو حسب روایت بقانے بلند آواز میں سفر کی عافیت کی دعا اپنے کتابچے میں سے پڑھی...... ہم نے اسے سنا اور آمین کہا......

جیپ پی ٹی ایل میں سے باہر آ کر کچھ دیر شاہراہ ریشم پر چلی......
ذرا بلند ہوئی...... جہاں سے پسّو کی وادی کا پورا میدان نظروں کے سامنے ابھی نیم اندھیرے میں سجھائی دیتا تھا۔

پھر ہمیں "بتورہ پل" نظر آیا......ایک آہنی گزر گاہ...... جس کے نیچے سے بتورہ گلیشیر کا برفانی قہر گزرتا تھا......اور کبھی اپنے زور اور برفوں کی قوت سے اس پل کو بھی روند کر مسمار کر دیتا تھا......اور میں ہمیشہ اس پل پر رکتا تھا اور اوپر اس سیاہ حجم کو ایک نظر دیکھتا تھا جس میں سے یہ برفانی قہر جنم لیتا تھا...... تبورہ گلیشیر کو ایک نظر دیکھتا تھا......

لیکن آج اس نیم تاریک حجم میں...... ہم اس پل تک نہ گئے...... اس سے ادھر...... ذرا ادھر......شاہراہ سے الگ ہو گئے...... دائیں طرف دریا کے شور کی جانب اترنے لگے......

جیپ دریائے خنجراب کی قربت میں ہوتی گئی اور اس کا بے پایاں غل بڑھتا گیا......

یہاں کان میں کوئی اور آواز نہ پڑتی تھی......

پھر اس دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ کچے راستے پر جیپ جیسے خاموش ہو گئی ہو......اس کا انجن تھم گیا ہو...... خاموشی سے چلتی گئی کیونکہ اس کی آواز پانیوں کی گرج میں دب گئی تھی......اور دفن ہو گئی تھی۔

دریائے خنجراب پر ایک معلق پل تھا......

ہم نے اس طویل پُل کو پار کیا اور دوسرے کنارے پر چلے گئے...... پسّو کونز کی چٹانوں کے دامن میں چلے گئے......

تھوڑی دیر بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں چٹانوں کے اندر سے شمشال دریا بہتا ہوا......

دریائے خنجراب میں شامل ہوتا تھا اور اپنے آپ کو اس میں گم کرتا تھا......

ہم بائیں جانب...... جدھر سے یہ دریا بہتا ہوا نیچے آتا تھا...... مڑ گئے......

اور اندر چلے گئے......

شمشال کی گھاٹی میں داخل ہو گئے......

"روڈ کیمپ......ڈوٹ!"

میں دنیا کی تنہاترین جگہ سے خوشی لینے جا رہا ہوں......

میں وادیٔ شمشال جا رہا ہوں......

میں وی جاناں جھوک رانجھن دی......

میں نے درہ شمشال کو روز ریڈ سٹی آف پیٹرا میں بدلتے دیکھا تھا......

ایک عظیم چٹانی گلاب کو کھلتے دیکھا تھا......

سونے کے منجمد اہرام...... معبد اور محل...... گلابی ہوتے دیکھے تھے......

درّہ شمشال کی چٹانیں میری نظروں کے سامنے سنہری ہو گئی تھیں......

ادھر کوہ قارون سے ہمارا دادا آیا تھا......

شوگردان کا پل آیا...... ہم دریا کے دوسری جانب چلے گئے......

شمشال کے درّے کو اب دھوپ سفید کرتی تھی...... پیٹرا کا گلابی شہر ایک معجزے کی طرح نمودار ہوا تھا اور دیکھتے دیکھتے تحلیل ہو گیا تھا...... اب وہاں شاندار حجم والی چٹانیں تھیں......ایک اونچے سنگھاسن پر براجمان جمال والی چٹانیں جو آسمان کو زیادہ جگہ نہیں دیتی تھیں...... میں نے زندگی بھر کبھی بھی ایسی صبح کا نظارہ نہیں کیا تھا‘ ایسے درّے سے نہیں گزرا تھا جو دنیا کا ہر منظر بھلا دے......اپنے گلابی حسن سے زنجیروں میں باندھ دے اور پھر دھوپ تیز ہونے سے یہ زنجیریں برف کی طرح پگھل جائیں...... سب کچھ خیال ہو جائے...... دریا کے پار ایک موڑ اٹھتا تھا اور ڈھلوان پر دو ویران سی مستطیل کوٹھڑیاں تھیں اور ان کے آگے چند نومولود سفیدے کے بوٹے بے چارے سے اور ناتواں سے ہوا کے زور کی تاب نہ لاتے

ہوئے مسلسل کمر تک جھکے ہوئے تھے...... دوہرے ہو رہے تھے...... "یہ ڈوٹ ہے صاحب...... پہلے روڈ صرف ادھر تک آتا تھا......اب ذرا آگے کیمپ تک جاتا ہے......

"ان کوٹھڑیوں میں کون رہتا ہے؟"

"یہ شمشال والوں کے کمرے ہیں...... ادھر سونے کا کھانے پینے کا بندوبست ہوتا ہے...... شمشال کے مسافر ادھر رات کرتے ہیں اور پھر آگے جاتے ہیں...... شمشال کے راستے میں رات کرنے کے لئے ہم نے خود یہ کمرے بنائے ہیں...... ہمارا ریسٹ ہاؤس ہے صاحب......"

جیپ ان کوٹھڑیوں اور کورنش بجالاتے سفیدے کے ناتواں بوٹوں کی قربت میں سے ہو کر بلند ہو گئی......

ڈوٹ سے ذرا آگے گئے تو ہمارے راستے میں لُپ غر نالہ آیا اور یہ طوفانی پانی لُپ غر چوٹی میں سے جنم لے کر نیچے آرہے تھے...... جان موک نے مجھے گلگت میں بتایا تھا کہ اگر تم شمشال سے آگے تین روز کا سفر کر کے شمشال پاس نہیں جاسکتے اور بلند چراگاہیں نہیں دیکھ سکتے تو ڈوٹ سے ایک راستہ لُپ غر پیک کے دامن تک جاتا ہے جہاں شمشال والوں کی ایک نہایت الگ تھلگ چراگاہ ہے اور وہاں وہی قدیم چراگاہی ماحول ہوگا جو شمشال پاس میں ملتا ہے...... لیکن ابھی تو منزل شمشال تھی......

پھر ہم دی کٹ نامی برفانی نالے کے قریب ہوئے جو مومل گلیشیر سے نیچے آرہا تھا اور اس پر مومل پیک بلند ہو رہی تھی...... مومل پیک کے برابر میں کہیں ٹریور پیک تھی جو روڈ سے نظر نہیں آتی تھی...... میں نے بہت عرصے پہلے "ٹریور" نامی ایک کوہ پیمائی سفر نامہ پڑھا تھا جو شاید اسی پیک کے بارے میں تھا...... میری یادداشت ساتھ نہیں دے رہی......

کوہِ قارون...... جدھر سے شمشالیوں کا دادا آیا تھا ان چوٹیوں سے مخالف سمت میں بلند ہوتا تھا...... اور یہ پہاڑ بہت بلند تھا لیکن ہم اس روڈ پر جیسے زینہ بہ زینہ بلند ہوتے اس کی قربت میں ہوتے گئے...... اور اسی تناسب سے شمشال کا نالہ یا دریا نیچے رہتا گیا...... نیچے ہوتا گیا...... یہاں تک کہ وہ اتنی گہرائی میں چلا گیا کہ ہم اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے تھے...... اس کی دوری ہمیں بے آرام کرتی تھی......

جیپ ایک دھچکے کے ساتھ رک گئی۔

"روڈ کیمپ آگیا ہے سر...... اتریں گے" رجب ایک غزال کی طرح کود کر جیپ سے اتر گیا۔

"روڈ یہاں ختم ہوتا ہے۔"

اور میں نے دیکھا کہ روڈ یہاں اتنی تنگ ہے کہ صرف ایک جیپ کی بھی بمشکل متحمل ہوتی ہے اور اگر آپ جیپ سے اترتے ہیں تو اس کا راڈ تھام کر اتریئے کیونکہ اترنے کے بعد روڈ پر صرف دو قدموں کی گنجائش ہے اور کنارا ہے...... جہاں سے گہرائی، لڑھکتی اور گرتی چلی جاتی ہے۔ نیچے شمشال نالے کے بے آواز وجود کی جانب...... جو نظر نہیں آرہا......

جیپ کا انجن خاموش ہوا تو روڈ تعمیر کرنے والے کارکنوں کے برمے جو چٹانوں میں چھید کر رہے تھے کانوں میں بھی چھید کرنے لگے...... چٹانوں میں سے روڈ کا وجود نکالا جا رہا تھا جیسے مائیکل انجلو فالتو پتھر تراش کر چٹان میں سے پوشیدہ مجسمہ نکالتا تھا...... چند قدم آگے متعدد مزدور اپنے مُنہ سر ڈاکوؤں کی مانند لپیٹے چٹانوں میں سے اڑتی دھول اور کنکریوں میں روپوش تھے...... یہ ایک شدید مشقت والا کام تھا جو صرف ہمت والے ہی کر سکتے تھے......

"آپ چلیں تارڑ صاحب...... میں سامان کا بندوبست کرتا ہوں...... اوپر چڑھ جائیں وہاں شمشال والوں کا دوکان ہے اس میں جاکر چائے پئیں...... روڈ پر تو دھول سے دم نکلتا ہے...... آپ چلیں۔"

یہ روڈ کیمپ بہت اونچائی پر معلق تھا...... درہ شمشال یہاں اتنا تنگ اور اتنا بلند ہوتا تھا کہ روڈ پر چلتے ہوئے انسان ہر لحظہ گرتا ہوا محسوس کرتا تھا...... ہر سو دھول کے غبار تھے...... اور ان میں سے گزرتے ہوئے سانس نہیں آتا تھا...... گرمی میں بھی شدت آرہی تھی......

جہاں روڈ کا اختتام ہوتا تھا وہاں سے ایک شدید چڑھائی اوپر اس کوٹھڑی کی جانب جارہی تھی جسے رجب نے دوکان کہا تھا اور اس پر چڑھنا بھی اک عذاب تھا۔

اور اوپر سے...... کچھ لوگ اترتے تھے...... چند مرد دو خواتین اور دو بچے اپنے چہرے ڈھانکے منہ سر لپیٹے احتیاط برتتے کبھی پھسلتے کبھی سنبھلتے کہ اترائی بھی تو شدید تھی...... دھول سے بچتے نیچے اترتے تھے۔

"یہ شمشال کے لوگ ہیں سر...... ادھر دوکان میں بیٹھے کسی جیپ کا انتظار کرتے

تھے......اب اسحاق کے ساتھ پسو جائیں گے......"

ڈوٹ کا یہ روڈ کیمپ ایک ایسے ہیبت ناک اور بلند مقام پر اٹکا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ بھی بھول چکا ہوگا کہ میں نے اسے بنایا ہے...... بنایا ہے تو کیوں بنایا ہے اور یہ بن کیسے گیا......

ایک بے آرام خوف بدن میں اترتا تھا......

میں بمشکل اس کوٹھڑی...... اس دوکان تک پہنچا جہاں سے شمشال خاندان برآمد ہو کر نیچے گیا تھا...... دوکان کے بند دروازے کے باہر دھول میں اٹے درجنوں نیلے ڈرم پڑے تھے...... یہ شمشال والوں کے ڈریسنگ روم اور سٹور تھے...... .

وہ اپنی وادی سے پیدل سفر کرتے ہوئے یہاں تک...... اس عارضی روڈ کیمپ تک پہنچتے تھے اور پھر اپنے اپنے ڈرموں کے ڈھکنوں سے لٹکتے قفل کھول کر ان میں سے اپنے لئے مناسب لباس نکال کر پہنتے تھے...... اپنا فالتو سامان ان میں سٹور کر کے نیچے گلگت کی دنیا میں چلے جاتے تھے...... جب واپس آتے تھے تو اس دنیا سے لائی ہوئی سوغاتیں جتنی اٹھا سکتے تھے کندھوں پر بوجھ کر کے اپنی وادی میں لے جاتے تھے اور جو کچھ نہیں لے جا سکتے تھے وہ ان ڈرموں میں محفوظ کر دیتے تھے تاکہ کوئی عزیز رشتے دار اگر خالی ہاتھ آ رہا ہو تو وہ لے جائے یا چند روز ٹھہر کر وہ واپس آکر انہیں اٹھا کر لے جائیں...... ان سوغاتوں میں...... خوراک' صابن' چائے' ملبوسات کے علاوہ غسل خانے کے لئے کموڈ یا چینی ڈنر سیٹ بھی ہو سکتے تھے......

رجب شاہ نے بھی اپنے پرائیویٹ ڈرم کا ڈھکنا اٹھایا اور ٹورازم کانفرنس کے دوران زیب تن کئے جانے والا سوٹ اور بوٹ اس میں احتیاط سے رکھے اور اپنا پیدل چلنے والا لباس نکال لیا...... ایک جین' ٹی شرٹ' جوگرز اور ایک چھوٹا سا رک سیک......

میں اس کوٹھڑی یا دوکان کا بند دروازہ دھکیل کر اندر چلا گیا......

اندر ایک نیم تاریک سا ماحول تھا...... میں باہر کی تیز دھوپ سے یکدم کسی شام میں آگیا...... پتھروں سے تعمیر شدہ ایک عارضی سی آماجگاہ...... اور ان پتھروں میں جہاں کہیں سوراخ تھے وہاں سے دھوپ کی کوئی کرن دھول سے آلودہ...... ذروں میں تیرتی اندر آتی تھی...... ایک جانب کچھ گدے اور رضائیاں...... پرانے کیلنڈر...... ایک لالٹین...... بسکٹوں

کے ڈبے...... آٹے کی ایک بوری...... تھوڑی سی چینی اور ایک روشن چولہا جس پر ایک کیتلی چڑھی تھی اور ایک نوجوان آنکھیں جھپکتا اس میں جھانکتا تھا اور چائے بنا رہا تھا......

میں نے اندھیرے کی وجہ سے ایک آدھ ٹھوکر کھائی اور مخدوش حالت اور صفائی کے ان گدّوں پر دراز ہو گیا......

کسی نے اٹھ کر دروازے کو سختی سے بند کر دیا تاکہ دھول اندر نہ آئے......

اگرچہ وہاں ہر شے پر دھول پہلے سے ہی بہت تھی......

"چائے پئیں گے صاحب......" اس نوجوان نے پوچھا......

"ایک پیالی کے کتنے پیسے......" میں نے یونہی پوچھا......

"پیسے؟" وہ نوجوان بہت ہنسا "ادھر تو پیسہ نہیں ہے صاحب...... ادھر تو جو مسافر آتا ہے ہم اس کو چائے پلاتا ہے...... شمشال والوں کا دوکان ہے......"

"یہ چائے مشترکہ فنڈ سے چلتی ہے تارڑ صاحب......" قدرت کہنے لگا "جو بھی شمشال سے نیچے آتا ہے یا اوپر جاتا ہے تو ادھر ٹھہر کر چائے پیتا ہے...... اس کا کوئی پیسہ نہیں ہے۔"

میں نے چائے کے دو گھونٹ بھرے...... ان میں گرمی اور تازگی تھی اور بہت سارا دھواں اور کچھ دھول تھی......

میں اس روڈ کیمپ سے نکلنا چاہتا تھا...... یہاں میں بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا......

میں نے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد اٹھ کر دروازہ کھولا اور نیچے جھانکا...... نیچے ڈھلوان کے دامن میں...... دھول اور روڈ بلڈنگ کے شور میں اور کڑی دھوپ میں دریائے شمشال جہاں بہت گہرائی میں خاموش نظر آتا تھا اس کنارے پر رجب شاہ ہمارے سامان کو ایک دستی ترازو سے تول کر پورٹروں میں تقسیم کر رہا تھا اور وہ اس سامان کو اپنے کندھوں پر اٹھا رہے تھے......

گیارہ بجنے والے تھے......

میں نے دروازہ بند کیا اور پھر سے گدّوں پر لیٹ گیا......

تھوڑی دیر بعد رجب بھی اندر آگیا "اب چلیں گے صاحب...... چار پورٹر کا بوجھ ہوا ہے...... لیکن ایک پورٹر آٹھ کلو وزن زیادہ اٹھائے گا تو اس کو کچھ رقم فالتو دے گا......"

"ٹھیک ہے رجب...... اختیار آپ کے پاس ہے...... ابھی تھوڑی دیر آرام نہ کر لیں؟"

"نہیں صاحب...... چلے گا۔"

"آج رات کہاں کرے گا رجب؟"

"پہلے تو زیارت آئے گا تین چار گھنٹوں کے سفر کے بعد...... ادھر رات کرنے کے لئے کمرہ ہے...... اگر آپ میں ہمت ہوا تو آگے...... شکر جوئی تک بھی چلے گا......"

میں نے بھی یہی سنا تھا کہ...... روڈ کیمپ کے بعد تین چار گھنٹے کی مسافت پر زیارت ہے اور پھر اگلے روز پورا دن سفر کریں تو شام کو شمشال...... اس سے زیادہ آسان ٹریک اور کیا ہو سکتا تھا......

میں نے اپنا مختصر رک سیک اٹھایا اور دوکان کی نیم تاریکی میں سے نکل کر تیز دھوپ اور دھول میں آ گیا...... اس ٹریک میں میرے پاس میرا محبوب کیمرہ اشائی پینٹیکس نہ تھا...... وہ نیپال جاتے ہوئے پی آئی اے کی کسی اہلکار نے چوری کر لیا تھا...... میں اس بار اپنا ویڈیو کیمرہ بھی ساتھ نہیں لایا تھا کہ اس کا بوجھ اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا...... میں نے اس سفر کو صرف اپنی آنکھ سے دیکھنا تھا...... اور اس کے باوجود میرے رک سیک کا وزن چھ سات کلو کے قریب ہو گیا تھا...... اور ہاتھ میں واکنگ سٹک تھی......

میں اپنی اوریجنل واکنگ سٹک...... جس نے مجھے کنکورڈیا اور سنولیک میں سہارا دیا تھا...... ہوٹل روپل میں کہیں بھول آیا تھا...... اور یہ واکنگ سٹک میرے لئے اجنبی تھی...... کسی درخت کی ٹہنی تھی...... اس کی چھال کھرچ کر اس پر کچھ بیل بوٹے بنائے گئے تھے اور یہ اس لئے معتبر تھی کہ بقول اکرام یہ متعدد غیر ملکی خواتین کے استعمال میں رہ چکی تھی اور بے حد چارمنگ تھی......

پورٹروں کو رجب نے اشارہ کیا اور وہ ایک ایک کر کے چلنے لگے......

قربان محمد...... عطا کریم...... دوکاندار مہمان بیگ اور رجب کے ہمراہ کے ٹو کی چوٹی پر پہنچنے والے مہربان کا کھلنڈرا اور پیاری شکل کا بیٹا راہبر......

میں نے دوکان کے باہر کھڑے ہو کر پہلی بار دائیں جانب دیکھا...... اور سر اٹھا کر دیکھا تو

اوپر دیکھنے سے گردن میں بل آنے کو تھا...... عجیب نامعقول اور نہ سمجھ میں آنے والی ایک چٹانی بلندی تھی...... شمشال نالے کے عین اوپر آسمانوں تک چٹانیں استرے کی دھار کی طرح تیکھی اٹھتی ہی چلی جاتی تھی...... ان میں کہیں بُھر بھری بلندیاں بھی تھیں اور ان کے وجود پر...... چٹانوں اور بلندیوں کے تیکھے آسمان بدن پر ایک آڑی ترچھی لکیر بل کھاتی ہوئی عرشوں کی قربت میں پہنچتی تھی اور گم ہوتی تھی...... یہ کوہ نوردی کی وہ عشق آتش تھی جو آسمانوں تک جاتی تھی...... یہ کچھ کچھ پرانی متروک شدہ ہنزہ روڈ کی طرح تھی...... ظاہر ہے یہ بھی کوئی متروک شدہ راستہ تھا جو ہمارا نہ تھا...... شمشال کا راستہ تو آسان ہو چکا تھا...... اور ہمیں آج نیچے اتر کر شمشال نالے کے کنارے کنارے آرام سے چلنا تھا اور زیارت پہنچنا تھا......

"یہ شمشال کا پرانا راستہ ہے......؟" میں نے رجب سے پوچھا......

"نہیں صاحب...... یہی شمشال کا راستہ ہے۔"

میں بالکل سچ کہوں گا اور دین ایمان سے سچ کہوں گا کہ اگر میں اس نام نہاد چٹانی راستے کی کوئی ایک تصویر بھی دیکھ لیتا تو لاہور میں بیٹھے ہوئے...... اپنی سٹڈی میں بیٹھے ہوئے میں شمشال کو اپنے سفری منصوبوں میں سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دیتا......

"لیکن رجب......"

"آئیں صاحب......" اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا......

"یہ تو...... راستہ کہاں ہے...... ایک لکیر ہے...... ایک سیاہ رسن ہے جو چٹانوں سے چمٹا ہوا ہے...... اس پر چلنا ممکن ہے؟"

"آئیں صاحب......" اس نے پھر کہا...... "یہ اتنا مشکل نہیں جتنا یہاں سے دکھائی دیتا ہے......" "ہم لوگ آتے جاتے رہتے ہیں......"

"لیکن ہم لوگ تو نہیں آتے جاتے رہتے......"

"اگر ہم لوگ آ گئے ہیں تو پھر...... آتے جاتے رہتے" وہ ہنس دیا اور اپنا ہاتھ جھٹک کر بولا "آ جاؤ صاحب......"

”شمشال کا سفر آسان ہو گیا ہے......“

میں نے آج تک کسی بھی ٹریک کے دوران...... پہلے دن...... اور پہلے قدم پر اپنے کسی پورٹر یا گائڈ کا ہاتھ نہیں تھاما...... سہارا نہیں لیا...... لیکن میرے سامنے جو کچھ تھا...... جو کچھ مجھے نظر آرہا تھا وہ تو ایک دھوکا تھا اور میں اس دھوکے پر سہارے کے بغیر نہیں چل سکتا تھا......

ایک پگڈنڈی سی تھی...... چٹانوں کے ساتھ زبردستی چمٹی ہوئی اور خود بھی خوفزدہ کہ میں کسی بلندی پر چمٹی ہوئی ہوں اور کہیں نیچے نہ گر جاؤں......

میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا...... صریحاً ناانصافی ہوئی تھی...... میں نے سنولیک کے بعد صدق دل سے توبہ کرلی تھی...... اس کے بعد دیوسائی کو صرف اس لئے چنا تھا کہ بس پیدل سفر ہے اور ہموار میدان ہے...... اس میں برجی لاء کا برفباری کا تڑکا یونہی انجانے میں لگ گیا تھا...... لیکن میں نے شمشال کا ارادہ صرف اور صرف اس لئے باندھا تھا کہ ہر شخص نے مجھے گارنٹی دی تھی کہ جناب اب تو شمشال تک کا سفر بے حد آسان ہو گیا ہے...... میں نے غور کیا تو یہ کھلا کہ یہ شخص کبھی شمشال نہیں گئے تھے اور سنی سنائی بات کرتے تھے...... یا یہ خود شمشالی تھے اور ان کے لئے آسانی کے سٹینڈرڈ باہر کی دنیا سے ذرا مختلف تھے......

شمشال کا راستہ یقیناً آسان ہو گیا تھا...... لیکن...... صرف شمشالیوں کے لئے!

ٹریک کے پہلے دن...... پہلے قدم پر ہی خوف کے ہزار پائے نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا...... میرے پوروں میں سے ڈر کا پسینہ پھوٹنے لگا......

میں نے رجب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا اور پہلا قدم اٹھایا......

پہلے قدم سے ہی چڑھائی اور خطرناکی شروع ہوگئی......

کہیں وہ پگڈنڈی غائب ہو جاتی...... کہیں نظر آتی تو آسمان پر نظر آتی...... اور نیچے شمشال نالہ کہیں نظر نہ آتا......

میں چند قدم چلتا اور ایک ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح ہاتھ بلند کر دیتا اور رجب مجھے تھام لیتا...... اور میں گہرائی میں گرنے سے بچ جاتا...... ”صاحب آپ نیچے نہ دیکھو...... جہاں میرا پاؤں پڑتا ہے صرف وہاں دیکھو اور اپنا پاؤں وہاں رکھتے ہوئے چلتے آؤ۔“

میں نے اپنے آپ کو ایک مرتبہ پھر بہت برا بھلا کہا...... بہت کوسا...... کہ تم ایسی جگہوں پر کرنے کیا آتے ہو...... لیکن میرا کچھ قصور نہ تھا...... میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا......

تقریباً آدھ گھنٹے کی مسافت کے بعد غیر متوقع طور پر ہم ایک نسبتاً ہموار جگہ پر پہنچ گئے...... یہاں سے شمشال کا نالہ بالکل دکھائی نہ دیتا تھا لیکن اس کی پرواہ کون کرتا تھا...... ہم ایک ہموار جگہ پر تھے اور یہاں سے نیچے گر نہیں سکتے تھے...... یہاں بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے اور ان کے درمیان میں اہل شمال کے قدموں سے ایک راستہ کہیں بنا ہوا تھا اور کہیں نہیں بنا ہوا تھا...... رجب ان میں سے ایک پتھر کی اوٹ میں گیا اور وہاں سے ایک واکنگ سٹک نکال لایا ”جب نیچے جاتا ہوں تو ادھر چھوڑ کر جاتا ہوں...... یہ ڈرم میں سٹور نہیں ہو سکتی...... اور جب واپس اوپر آتا ہوں تو ادھر سے لے لیتا ہوں۔“

پتھروں کے درمیان یہ راستہ ذرا دیر کے لئے ایسا ہوا کہ اس پر آسانی سے چلا جا سکتا تھا اور پھر وہ دیر فوراً ختم ہوئی اور راستہ ایسا ہوا کہ اس پر چلنا تو کجا رینگنا بھی ممکن نہ لگتا تھا......

شمشال نالہ اس راستے کے کہیں نیچے...... جانے کتنے ہزار میٹر نیچے کہیں تھا یا نہیں تھا...... اور اس ترچھی استرا بلندی تیکھی چٹانوں اونچائی پر اگر کہیں کوئی راستہ تھا تو میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا...... میں تو صرف سر جھکائے رجب کے بوٹوں کو دیکھتا تھا...... اس کا قدم جو مقام خالی کرتا تھا اس پر اپنا جوگر جمانے کی کوشش کرتا تھا اور بار بار پھسلتا تھا......

ٹریک کے پہلے دن...... اولین لمحوں میں کبھی میری اتنی دل آزاری نہیں ہوئی تھی۔ سنولیک کے دوران بھی وہ مقام کبھی کبھی آتے تھے جن پر سے گزرنے سے دنیا سے گزر جانے کا خدشہ قوی ہوتا تھا...... لیکن یہاں...... تو محبوب کے بدن کی طرح ہر مقام ایسا تھا کہ

ایسا اور کہاں اور کیا مقام ہو گا......

یہ راستہ یکدم مزید تیکھا ہو کر آسمان ہو جاتا......

اور اس پر رجب کے بوٹ بھی کھسکتے لیکن وہ میرا ہاتھ تھامے گھسیٹتا ہوا مجھے اوپر لے جاتا......

جیسے برگمین کی فلم "دی سیونتھ سیل" میں موت اپنے شکار کردہ لوگوں کو ہاتھ پکڑے گھسیٹتی ہوئی آسمانوں پر لے جاتی ہے......

لیکن رجب کا ہاتھ موت نہیں...... زندگی تھا......

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر میں یہاں رجب کے بغیر تنہا آنکلتا تو روڈ کیمپ سے ہی واپس ہو جاتا...... رجب میں خاصیت یہ تھی کہ وہ میری چھواچال کے مطابق اپنے آپ پر جبر کرتا قدم روکتا آہستہ آہستہ چلتا تھا...... وہ مجھ سے آگے چل رہا ہوتا لیکن اس کے کان' چٹانوں اور بجری پر پڑتے میرے جوگرز کی آواز پر لگے رہتے...... کہیں پر میں ذرا پھسلتا' بے ربط ہوتا تو وہ فوراً پیچھے مڑ کر اپنا ہاتھ آگے کر دیتا "آؤ صاحب......"

یہ حواس منتشر کر دینے والا ایک ایسا سفر تھا کہ میں نے اپنا حلق تر کرنے کے لئے نہ تو کوئی ٹافی منہ میں ڈالی' نہ چیونگم چبائی اور نہ فلاسک کھول کر اس میں سے نمکول کے گھونٹ بھرے...... ان فضول کاموں کا ہوش کسے تھا...... بس یہ تھا کہ سر جھکا کر چلتے جاؤ اور کسی نہ کسی طرح اس عذاب کے پار ہو جاؤ...... ظلم تو یہ تھا کہ ستانے کے لئے بھی کوئی مناسب مقام نہ آتا تھا...... ہر مقام تیکھا اور گرتا ہوا تھا اور براہ راست شمشال نالے میں گرتا تھا......

بقا کو کوئی پرابلم نہ تھی وہ مزے سے چلتا تھا......

ایک مقام پر ندیم ایک نہایت خطرناک ڈھلوان پر اٹکا کھڑا تھا...... اگلا قدم اٹھانے کی ہمت نہ تھی...... مونچھوں کا اور پتہ نہیں کہاں کہاں کا ایک ایک بال خوف سے تیر ہو رہا تھا کہ بقا نے کوہ قارون میں سے گرتی کوئی آبشار سپاٹ کر لی اور اسے پکار کر کہنے لگا "اوئے جانگلوس ذرا وہ آبشار تو دیکھ......"

ندیم اسی طور اپنے آپ کو بیلنس کرتا...... راستے پر نظریں جمائے خاموش کھڑا رہا......

اس پر بقا نے پھر آواز دی "اوئے ادھر تو دیکھ...... بڑے زبردست آبشار ہے......"

ندیم اسی حالت میں خوف کے سناٹے میں آیا ہوا زیر لب منمنایا "میں تو آبشار کی...... بہن کی......"

بعد میں اس نے بہت گلا کیا کہ بقا بھائی میری جان پر بنی ہوئی تھی اور آپ آبشاریں دکھاتے تھے......

سب سے پیچیدہ اور خوفناک مرحلہ ان ڈھلوانوں کا تھا جو پتھروں کی نہیں سنگریزوں اور بجری کی تھیں...... کنکروں اور موٹی ریت کی تھیں...... یہ کہیں اوپر سے اترتی تھیں اور ایک اہرام کی اترائی کی ہی نیچے گرتی چلی جاتی ہتی...... اور ان کے درمیان میں راستے کے کچھ نشان تھے اور کہیں نہیں تھے...... اس پر آپ ڈولتے ہوئے چلتے تھے...... چلتے تو خیر کیا تھے...... ہر قدم سنگریزوں کی بھربھری گود میں رکھتے تھے اور وہ گود بھرنے لگتی تھی اور اس کے ساتھ پاؤں کھسکتا ہوا نیچے ہونے لگتا تھا...... اس میں فنون لطیفہ کا کمال یہ تھا کہ آپ اس پر پاؤں رکھیں...... اور اس سے پیشتر کہ وہ سنگریزوں اور بجری میں ڈوبتا ہوا نیچے چلا جائے اسے اٹھا لیں اور اگلا قدم رکھیں...... اور ہاں پچھلے قدم کو کھینچ کر باہر نکالیں جیسے صحرا کی ریت میں چلتے ہوئے نکالتے ہیں اور ظاہر ہے اپنا توازن بھی برقرار رکھیں......

ایک وقت ایسا آیا کہ میں رجب کا سہارا لیتے لیتے تنگ آ گیا...... جیسے آپ برفانی دراڑوں کو کمال احتیاط سے پھلانگتے بالآخر تنگ آ جاتے ہیں اور پھر انہیں بے دریغ ٹاپتے جاتے ہیں...... چنانچہ ایک اور بجری کی قدرے ناپسندیدہ ڈھلوان سامنے پا کر میں نے رجب کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اسے ہدایت کی "رجب آپ چلو...... میں خود آؤں گا۔"

رجب آگے چلا گیا......

اور حقیقت یہ تھی کہ یہاں چلنا اتنا دشوار بھی نہ تھا...... صرف خوف تھا' نا تجربہ کاری تھی...... اگر آپ کار ڈرائیو کرتے ہوئے ہمہ وقت یہ سوچتے رہیں کہ اگر یہ کار سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکرا جائے تو...... اگر اس سپیڈ پر اس کا ٹائر برسٹ ہو جائے تو...... سٹیرنگ وہیل قابو میں نہ رہے اور یہ روڈ سے نیچے کھیتوں میں جا گرے تو...... تو آپ ڈرائیو کر چکے...... اسی طور یہاں آپ ایک بار لڑکھڑاتے تھے تو نیچے جاتے تھے...... اور دریا تک پہنچتے پہنچتے فوت ہو جاتے تھے...... بلندی بھی تھی اور دھوپ بھی اور سانس بھی ہونکتا تھا......

لیکن اگر آپ ان عوامل کو ذہن سے نکال دیں تو چلا جا سکتا تھا...... اگر آپ تجربہ کار ہوں...... لیکن ہم تو ان راستوں کے اناڑی ڈرائیور تھے اور ہر شے سے خوفزدہ ہوتے تھے......

رجب آگے چلا گیا......

میں نہایت اطمینان سے اس گہرائی میں تیکھی گرتی ہوئی بجری کی ڈھلوان پر اپنے قدموں کے لئے جگہ بناتا آہستہ آہستہ چلنے لگا...... اور یہ چنداں دشوار نہ تھا...... بلکہ میں لطف اندوز ہونے لگا اور گنگنانا شروع کر دیا...... پھر فوراً ہی یہ گنگناہٹ موقوف کر دی کیونکہ میں اتنا بے سرا تھا کہ ڈھلوان کے سنگریزے ڈسٹرب ہو سکتے تھے...... میں ایک ایک قدم ناپ تول کر اعشاری نظام کے تحت رکھ رہا تھا اور نہایت آسانی سے چل رہا تھا......

ڈھلوان کے عین درمیان میں پہنچ کر میں سانس درست کرنے کے لئے رکا...... اور سامنے کی بجائے یونہی نیچے دیکھ لیا...... بے دھیانی میں...... اور جب نیچے نگاہ کی تو وہ ڈھلوان جس پر میں تھا سینکڑوں میٹر نیچے ہی نیچے گرتی ہی چلی جاتی تھی اور اس باریک فیتے میں گرتی تھی جس کے بارے میں شبہ تھا کہ وہ شمشال نالہ ہے...... اور میں اس پر ایک کلاسس آف رہوڈز مجسمے کی طرح کھڑا تھا جس کی بنیادیں ایک زلزلے سے ہل چکی ہیں اور وہ منہ کے بل سکندریہ کے سمندر میں گرنے کو ہے...... میری نظروں کے سامنے وہ ڈھلوان باقاعدہ متحرک ہو گئی اور ایک فلم کی طرح چلنے لگی...... اور شمشال نالہ جیسے اپنی تنگ گزرگاہ میں سے اٹھتا ہوا میری جانب آنے لگا...... میں نے اپنے پورے بدن کو تناؤ میں لا کر مٹھیاں بھینچ کر اپنے آپ کو اس حالت میں قائم رکھا...... سانس لینے میں بھی احتیاط کی...... مجھے نیچے نہیں دیکھنا چاہیے تھا...... میں ایک مقام پر گڑا ہوا تھا لیکن میری جڑیں اکھڑنے کو تھیں...... ٹانگیں شہتوت کی دو ٹہنیاں تھیں جو لچک رہی تھیں...... اور دماغ ایک اندھے خوف میں ڈوب رہا تھا...... میں یہاں زیادہ دیر تک اپنے آپ کو معلق نہیں رکھ سکتا تھا...... میں کسی بھی لمحے مسمار ہو کر لڑھک سکتا تھا...... تب میں نے ایک نہایت گھگھیائی ہوئی آواز بمشکل حلق سے نکالی

"را...... جب......"

ایسی آواز جو ایک مارموٹ اپنے سامنے دیوسائی کے ریچھ کا کھلا منہ دیکھ کر نکالتا ہے کیونکہ وہ جان جاتا ہے کہ اب تو جان گئی اور وہ اگلے لمحے اس منہ کے اندر ہوگا......

رجب فوراً پلٹا......

اور اس نے مجھے ڈھلوان کے عین درمیان میں کھیتوں میں آویزاں پرندوں کو ڈرانے والے "بڈاوے" کی طرح ہاتھ پھیلائے ساکت کھڑا دیکھا تو فوراً سمجھ گیا کہ کیا معاملات ہیں اور تیزی سے پلٹ کر مجھ تک آن پہنچا اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا......

"کیا ہوا تھا سر......" ڈھلوان کے پار جا کر اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا "آپ تو ٹھیک ٹھیک چل رہا تھا......"

"میں نے نیچے دیکھ لیا تھا......"

"نیچے تو نہیں دیکھتے سر...... ہم بھی نہیں دیکھتے......"

"لیکن جب ہم شمشال سے واپس آئیں گے تو یہی چڑھائی' اترائی ہو گی...... پھر تو نیچے دیکھنا ہو گا...... پھر کیا کریں گے؟"

"جب واپس آئیں گے تو پھر دیکھیں گے......"

یہی انہی پتھروں پر چل کر واپسی کا خیال بھی مجھے پریشان کرتا تھا......

"کے ٹو کہانی" میں کنکورڈیا سے واپسی پر ہیلی کاپٹر کی سواری مل گئی تھی......

"یاک سرائے" میں ہم وادیٔ اشکومن سے داخل ہو کر درّہ درکوت سے پار ہو گئے تھے......

"سنولیک" میں اسکولے سے چلے تو دنیا کے طویل ترین برف زار کو عبور کر کے نگر کی ریاست میں جا نکلے......

لیکن وادیٔ شمشال پہنچ کر...... مجھے پھر اسی راستے سے واپس آنا تھا...... یہی خیال مجھے پریشان کرتا تھا......

ایک چٹان میں ایک کٹاؤ سا آیا جہاں رکنا ممکن تھا...... جہاں میں بیٹھ کر ستا سکتا تھا...... لیکن یہاں بھی بیٹھا ہوں تو یوں لگتا تھا جیسے میں نامعلوم انداز میں آہستہ آہستہ کھائی کی جانب کھسکتا جا رہا ہوں اور بار بار دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹکاتا ہوں کہ کہیں لڑھک نہ جاؤں......

"رجب شاہ جی...... یہ تو مشکل ہو گئی...... اگر ابھی سے یہ حالات ہیں تو شمشال کیسے

پہنچیں گے؟"

"نہیں کوئی مشکل نہیں......" اس نے ماتھے پر سے وہ پسینہ پونچھا جو وہاں نہیں تھا...... اور اسے پسینہ بہت کم آتا تھا...... اس کے حصے کا مجھے آتا تھا" روڈ کیمپ کے فوراً بعد یہی چڑھائی ہے...... ابھی ایک گھنٹے میں ختم ہو جائے گی...... پھر ہم اترنے لگیں گے اور شمشال نالے کے کناروں تک اتر جائیں گے...... پھر تقریباً ہموار علاقہ ہو گا...... کل کا سفر بھی دشوار نہیں ہو گا...... دو تین نالے کراس کریں گے...... دو چار پل ہیں...... بس شمشال سے پہلے ایک اور چڑھائی ہو گا...... باقی راستہ مشکل نہیں ہو گا...... اب چلتے ہیں" اس نے ہاتھ آگے کر دیا۔

قصہ انتہائی مختصر...... روڈ کیمپ کے بعد والی چڑھائی عرش منور تھی...... دریائے برالڈو کے اوپر جو ایک ڈیتھ ڈراپ آیا تھا...... ان کی یہاں فراوانی تھی اور اگر میں وہاں ڈراپ نہیں ہوا تو صرف قسمت اور رجب کی وجہ سے......

بالآخر وہ پتھر آ گیا جو آخری بلندی پر فائز تھا اور وہاں سے راستہ نیچے اترنے لگتا تھا...... اب اگر نیچے اترتا تھا تو چہل قدمی کرنے والا کسی پارک کا ٹریک تھوڑی ہو جاتا تھا...... چٹانوں کے کناروں کو چھوتا...... سنگریزوں کی ڈھلوانوں میں سے نیچے اترتا تھا......

بقا ہاتھ میں واکنگ سٹک تھامے نہایت لاپرواہ سرائیکی موڈ میں اترتا تھا......

ندیم ایک نابینا کی طرح اپنی لاٹھی ٹھک ٹھک کرتا ٹیکتا اترتا تھا......

اور میں چلتا تو کیا تھا...... بس ہمت کرتا...... اپنے آپ کو گرنے سے بچاتا...... سانسیں سنبھالتا نیچے اترتا تھا اور حساب لگاتا تھا کہ واپسی پر یہی اترائی 'چڑھائی ہو گی تو پھر کیا ہو گا......

بالآخر ہم نے اس عذاب بلندی سے نجات حاصل کر لی اور ہموار ہو گئے......

یہاں منظر کھلا اور ایک بڑے پھیلاؤ میں بدل گیا......

"جہاں شیطان پتھر گراتا ہے"

شمشال نالے نے بھی یہاں پہنچ کر اطمینان کا سانس لیا تھا اور وہ درّے کی تنگ گھٹن سے برآمد ہو کر ایک وسیع وادی میں پھیل رہا تھا...... وادی کے آخری کناروں پر مہیب اور عظیم چٹانی اور بھربھری مٹی والی پتھروں سے گندھی ہوئی بلند فصیلیں تھیں۔ ایسی عمودی دیواریں تھیں جو کئی ہزار میٹر بلند تھیں...... انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ لگتی تھیں اور ان کے عقب میں جو کچھ تھا اسے روپوش کرتی تھیں......

یہ وادی کے دائیں جانب تھا...... اور ان فصیلوں کے دامن میں ہم چلتے تھے......

بائیں جانب...... وادی وسیع ہوتی تھی...... پتھروں اور سنگریزوں کی ایک دنیا جس کے درمیان میں شمشال بہتا تھا...... اور اس کے پار ایک طویل فاصلے پر چٹانوں کی بلند دیواریں تھیں...... ہم سر اٹھا کر دائیں طرف دیکھتے تھے تو ان بلند فصیلوں کو دیکھ کر دہشت میں آتے تھے جو ہمارے عین اوپر معلق تھیں......

ہماری مشکلیں آسان ہو چکی تھیں...... اب صرف چلنے کی مشقت تھی...... گہرائی اور کھائی کا کوئی موت خوف نہ تھا......

پہلی بار پورٹروں کی طرف بھی دھیان دیا اور انہیں غور سے دیکھا اور گپ شپ لگائی......

راہبر...... کے ٹو کی چوٹی سر کرنے والے مہربان کا خوش مزاج...... شرارتی مسکراہٹ والا کھلنڈرا بیٹا...... جو زندگی میں پہلی بار کسی ٹیم کے ہمراہ بوجھ اٹھا رہا تھا...... وہ نیچے غل مت میں مقیم تھا...... ایک ویگن ڈرائیو کرتا تھا اور مسافر ڈھوتا تھا...... رجب کے کہنے پر ہمارے

ساتھ آگیا تھا...... یہ ایک خاصا حسین غلمان تھا جس کے ساتھ سب لوگ چھیڑ چھاڑ کرتے تھے...... اور اسے بھی ایک غلمان ہونے کی حیثیت میں دل پھینک مولویوں کا تجربہ تھا...... پٹاخ پٹاخ جواب دیتا تھا کیونکہ ایک مسافر ویگن چلاتا تھا اور انسانی فطرت کی کجی کا تجربہ رکھتا تھا...... وہ ایک کائیاں مسکراہٹ کے ساتھ مخاطب کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لیتا تھا...... میں اسے دیکھتا تو سوچتا کہ جس لڑکے کے باپ نے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی پر قدم رکھا ہے وہ ایک ویگن ڈرائیور ہے...... بوجھ ڈھونے کا کام کرتا ہے...... اور ہمارے ہاں...... جس کا باپ کالے دھن کے زور سے کسی پارلیمینٹ کا ممبر منتخب ہو جاتا ہے...... ان پڑھ اور رسہ گیر ہونے کے باوجود...... تو اس کے بیٹے پجاروز اور بی ایم ڈبلیو میں براجمان فرعون بنے پھرتے ہیں...... وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا...... گینگ ریپ میں ملوث ہوتے ہیں تو بھی شکایت نہیں ہوتی کہ کہیں ان کا استحقاق مجروح نہ ہو جائے...... اور...... راہبر...... ویگن چلاتا ہے...... بوجھ ڈھوتا ہے......

قربان محمد...... ہاتھ پاؤں کا بہت مضبوط...... شمشال کا باسی...... نہایت مددگار اور عمدہ انسان......

مہمان بیگ دراصل روڈ کیمپ میں وہ دوکان رکھتا تھا جہاں ہم نے عارضی قیام کیا تھا...... لیکن ایک پورٹر کم پڑ گیا تو وہ رجب کی سفارش پر ہمارے ساتھ آ گیا...... سابق فوجی تھا اس لئے بال ہمیشہ سنوارے رکھتا تھا اور ادب آداب کا پابند تھا...... اس میں ایک قابل توصیف شمشالی سادگی تھی......

عطا کریم...... بہت ہی چپ اور خاموش طبع شخص...... میں نے تو اسے بولتے ہوئے کبھی نہیں سنا...... ہم اس کی جانب دیکھتے تو وہ ہمیں ایک شرمیلی مسکراہٹ سے نوازتا اور پھر سر جھکا کر چلنے لگتا......

قدرت...... نہایت ہینڈسم شخص...... آسانی سے ایک ٹاپ ماڈل ہو سکتا تھا...... اگر چانس ملتا تو ٹیلی ویژن پر ایک دلوں کو توڑنے والا خوش شکل رف اینڈ ٹف ہیرو ہو سکتا تھا...... کسی مہم کے ہمراہ کے ٹو کے چینی کی جانب چہرے کی طرف گیا تھا اور اب کچھ داستانیں لے کر اپنے آبائی گاؤں شمشال کو لوٹ رہا تھا...... بعد میں معلوم ہوا کہ لاہور کی ایک ٹریول ایجنسی

میں گائڈ کے فرائض سرانجام دیتا تھا اور لاہور کو اتنا قریبی جانتا تھا کہ ہر جمعرات شاہ جمال کے مزار پر ڈھولی پپو سائیں کا جو مست مست کانسرٹ ہوتا تھا اس میں بھی شریک ہو چکا تھا...... میں بھی کسی زمانے میں پپو سائیں کی کلاسیکی ڈھول نوازی کا مداح ہوا کرتا تھا...... پھر اس کے ایک چیلے چانٹے نے...... ایک کوڑا کرکٹ سے بھی بدتر شخص نے میرے دوست مصوّر ظہور الاخلاق اور اس کی بیٹی جہاں آرا کو شغل کے طور پر قتل کر دیا...... تب سے پپو سائیں کا نام سنتا ہوں تو مجھے ظہور یاد آتا ہے اور میں اسے پسند نہیں کر سکتا......

روڈ کیمپ سے چلنے کے بعد ہم پہلی بار حواس میں ہوئے...... آرام سے چلنے لگے...... اور باتیں کرنے لگے۔

ایک ایسی وادی کے اندر چلنے لگے جس کے کناروں پر ناقابلِ عبور فصیلیں کھڑی تھیں اور ایک دریا بہتا تھا...... دھوپ تھی اور تنہائی تھی۔

"زیارت کتنا دور ہے رجب؟"

رجب کی ایک اور خوبی تھی...... وہ آپ کی رفتار...... بدنی ہمت اور ذہنی کیفیت کو مدنظر رکھ کر اندازہ لگا لیتا تھا کہ آپ منزل پر کتنی دیر میں پہنچیں گے...... یہ نہیں کہتا تھا کہ صاحب آگے تھوڑا چڑھائی ہے...... پھر میدان ہے...... راستہ آسان ہے...... تھوڑی دیر میں پہنچ جائیں گے اور ادھر تو بھیڑ بکری اور مویشی لوگ بھی چلتا ہے...... خطرناک نہیں۔

"صاحب......" رجب کے ماتھے پر بل پڑتے گئے "ابھی تھوڑی دیر چلیں گے تو دائیں ہاتھ پر جو فصیل نما بلندیاں ہیں وہاں وہ جگہ آئے گی جدھر اوپر سے ہمیشہ پتھر برستا ہے...... کہتے تھے کہ اوپر بلندی پر شیطان کا ڈیرہ ہے جو ہمہ وقت پتھر دھکیلتا رہتا ہے...... پہلے ہم لوگ ادھر پہنچتے تھے تو وہاں رک کر اوپر جائزہ لیتے تھے اور پھر بھاگتے ہوئے شاہ شمس کو یاد کرتے ہوئے اس حصے کے پار جاتے تھے...... یہ پتھر گرنے کا علاقہ ایک گھنٹے میں پار ہوتا تھا...... ایک بار میں ادھر پھنس گیا تھا...... اُس ٹائم تو پتھر کا بارش ہو رہا تھا اور بہت گرد اور دھول آسمان کو جاتا تھا...... میں ایک چٹان کے نیچے چھ گھنٹے تک سر چھپائے بیٹھا رہا...... ایسے کہ میری کمر پر کنکر برستے تھے...... پھر میں نے دریا کے پار جاتے ہوئے ایک شمشالی کو مدد کے لئے پکارا...... وہ آیا اور مجھے وہاں سے نکالا۔"

"لیکن میں نے تو سنا تھا کہ اب وہ راستہ ختم ہو گیا ہے۔"

"ہاں صاحب...... ہم بہت خوش نصیب ہیں کہ وہ مصیبت ختم ہو گیا ہے...... اب ایسا ہے کہ جونہی پتھر گرنے والا پہاڑ شروع ہو گا ہم یہ راستہ چھوڑ کر دریا کی طرف چلیں گے...... وہاں اب ایک پل ہے جو پہلے نہیں تھا۔ اس پل کے پار ہو کر دوسرے کنارے پر چلتے جائیں گے اور جب یہ پتھر گرنے والا علاقہ ختم ہو جائے گا تو ہم ایک مرتبہ پھر دریا پار کر کے واپس اسی کنارے پر اسی راستے پر آ جائیں گے......"

"یعنی آپ نے خطرناک علاقے کو بائی پاس کر دیا ہے اور اب بے چارہ شیطان اوپر بیٹھا سوچتا ہو گا کہ نیچے سے کوئی مسافر تو گزرتا نہیں تو پتھر گرانے سے فائدہ......"

"نہیں صاحب...... شیطان بیکار نہیں بیٹھتا وہ پتھر گراتا رہتا ہے چاہے نیچے سے کوئی گزرے یا نہ گزرے...... اب وہ علاقہ شروع ہونے کو ہے......" میں نے اوپر اس فصیل نما بلندی کو دیکھا وہاں خاموشی تھی...... سکوت تھا "آئیں دریا کی جانب چلتے ہیں۔"

چنانچہ ہم چٹانوں کی آغوش سے جدا ہو کر دریا کی جانب چلنے لگے...... اس کا شور آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا...... پھر وہ بھی قریب آ گیا اور اس پر ایک پل دکھائی دینے لگا......

ہم نے اس کے پار جانا تھا......

"شمشال کا پہلا پُل...... اور ہیلو چاچا تارڑ...... ریلیکس"

اسے ودین بین پُل کہتے تھے۔

یہ پُل ایک عجیب سا پُل تھا...... "رجب کیا ہم سے پہلے کسی ایک شخص نے بھی اس نامعقول پُل کو پار کیا ہے۔"

رجب کا کھنچا ہوا ماس اس کے دانتوں سے ہٹا اور وہ مسکرانے لگا......

یہ پُل...... عجیب و غریب پُل تھا......

جیسے ایک ماہر تعمیر نے ایک گھر کا نقشہ اپنے گاہک کو سمجھاتے ہوئے اسے ذرا دانشوری سے زدوکوب کیا کہ جناب یہ جو دیوار آپ دیکھ رہے ہیں...... اس کا ڈیزائن بے حد انوکھا ہے...... بس یوں سمجھ لیجئے کہ یہ دیوار ہے بھی...... اور نہیں بھی!

تو آپ بھی یوں سمجھ لیجئے کہ یہ پُل تھا بھی...... اور نہیں بھی تھا......

ایسا پُل شمشال کے راستے میں ہی ہو سکتا تھا......

یہ بالکل درست کہ پل صراط بال سے بھی زیادہ باریک ہو گا...... لیکن وہ چاہے کتنا ہی باریک کیوں نہ ہو مسلسل تو ہو گا...... ہر دو تین فٹ کے بعد ٹوٹا تو نہیں ہو گا......

اور یہ پُل...... ودین بین پُل ٹوٹا تھا......

عجیب مزاحیہ سا پُل تھا لیکن اسے دیکھ کر ہنسی نہیں رونا آتا تھا......

اس پُل کی وجۂ شہرت کچھ یوں ہے کہ اس کے دونوں جانب باریک تاروں سے بٹے ہوئے لوہے کے رسّے تھے جنہیں ایک پرندے کی طرح ہاتھ پھیلائے...... دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس پر سے گزرا جاتا تھا' لیکن گزرنے کے بعد جن مقامات پر پاؤں رکھے جاتے

تھے وہاں جائے پاؤں کا کوئی معقول بندوبست نہ تھا...... پہلی نظر پر یہ معلوم پڑتا تھا کہ پل صرف ان دو رسّوں پر مشتمل ہے اور معمار حضرات اس پر چلنے کے لئے کوئی تختے وغیرہ لگانا بھول گئے ہیں...... اور آپ پہلا قدم آگے دھرتے ہیں...... اور کس پر دھریں گے...... نیچے شمشال نالہ پُرجوش ہو رہا ہے...... اور پہلا قدم آگے گیا تو آپ دھڑام سے نالے میں گئے...... لیکن ذرا غور کرنے پر آگہی ہوتی تھی کہ نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں کہیں کہیں لکڑی کے ان گھڑے ٹکڑے سے بندھے ہیں...... بے شک ان کے درمیان کہیں کہیں دو تین فٹ کے شگاف بھی ہیں اور ان میں سے شمشال کے پانی ابھرتے ہیں اور سر کو لٹو کی طرح گھماتے ہیں...... اور یہ پانی اگرچہ براالڈو کی طرح وحشی تو نہ تھے' اس کی نسبت قدرے تہذیب یافتہ تھے لیکن اتنے بھی نہیں کہ ہمارے جیسے چناب کے باسی اپنے بدن کا کچا گھڑا ان کے سپرد کر دیتے اور وہ ہمیں پار اتار دیتے...... یہ تو بدن کے گھڑے کو لمحوں میں ریزہ ریزہ کر دینے پر قادر تھے......

چنانچہ سوہنی گھڑے کو کہتی ہے کہ آج مجھے پار لے جاؤ تو مانوں!

میں نے اپنا مختصر رک سیک اور واکنگ سٹک قربان کے حوالے کی اور چند پتھروں پر چڑھ کر پل پر قدم رکھا...... پھر بازو پھیلا کر دونوں جانب رسّے کو مٹھیوں میں بھینچا اور نہایت شجاعت سے آہستہ آہستہ اس پر قدم دھرنے لگا...... میں دونوں ہاتھوں میں جکڑے آہنی رسّے پر گرفت مضبوط رکھتے ہوئے یوں آگے کھسکتا تھا جیسے ڈور پر مانجھا لگانے والے ڈور کو مٹھی میں لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں۔

قدم دھرنے کے لئے تختوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جاتا تھا......

میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ ایک باقاعدہ پل بنانے کے باوجود فرش پر تختوں کا استعمال کم کم کیوں کیا گیا ہے...... کنجوسی کیوں برتی گئی ہے؟

اگلا قدم تین فٹ کے خلا کو پھلانگ کر ایک ایسے تختے پر دھرنا ہے...... جو ذرا ٹیڑھا بھی ہے...... ان گھڑا بھی ہے اور پُل کے ڈولنے سے ذرا جھولتا بھی ہے...... اب ایک ڈری ڈری جست لگا کر اس پر لینڈ کیا ہے اور دونوں پاؤں بمشکل اس پر ٹکائے ہیں تو اس سے اگلا تختہ بھی ذرا فاصلے پر ہی ہے...... یوں محسوس ہوا جیسے کسی سرکس کے بلند گنبد والے ٹینٹ سے لٹکتے

ہوئے جھولے پر دونوں قدم جمائے ہیں اور وہ جھولا جھول رہا ہے اور سینکڑوں فٹ نیچے ہزاروں تماشائی بوتھیاں اٹھائے مجھے دیکھ رہے ہیں کہ یہ بازی گر ابھی قلابازی لگائے گا اور خلا میں سفر کرتا ہوا دوسرے جھولے کو جا تھامے گا...... یعنی میں جھولے کی رسیاں دونوں ہاتھوں سے تھامے...... وہ کرتب دکھانے کو ہوں جسے سرکس کی زبان میں "ٹراپیز" کہتے ہیں...... اور مجھ میں یہ صلاحیت نہیں تھی اگرچہ بیشتر ادیبوں میں ہوتی ہے کہ وہ حکومت کے بدلتے ہی اپنے پہلے جھولے کو جھولتے ہوئے قلابازی لگا کر ٹراپیز کا کرتب دکھا کر دوسرے جھولے میں جا کھڑے ہوتے ہیں لیکن مجھ میں یہ صلاحیت نہ تھی۔

اگلا تختہ اگرچہ تین فٹ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن پل کے درمیان میں پہنچنے کی وجہ سے میں دریائے شمشال کے درمیان میں بھی پہنچ چکا تھا اور نیچے دیکھنے سے دماغ میں ایک بگولا سا اٹھتا تھا اور سر چکرانے لگتا تھا...... یہ بھی ممکن نہ تھا کہ سرے سے نیچے ہی نہ دیکھا جائے...... نیچے نظر نہ کریں تو اگلا قدم کیسے اٹھائیں...... چنانچہ جونہی وہ چکرا دینے والا بگولا میرے تن بدن میں گھوم کر اٹھا اور مجھے لگا کہ میں گر بھی سکتا ہوں تو میں نے ایک گھگھیائی ہوئی وہی آواز نکالی جو ایک مار موٹ اپنے بل سے سر نکالتا ہے اور اپنے سامنے ایک دیوسائی ریچھ کا اسے ہڑپ کر جانے والا کھلا منہ دیکھتا ہے تو نکالتا ہے "...... را...... جا...... جب"

رجب اگرچہ پار ہو چکا تھا لیکن مجھ پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھا۔ یہ مار موٹی فریاد سن کر فوراً پل کے تختوں کو ٹاپتا ہوا مجھ تک پہنچ گیا اور ہاتھ آگے کر دیا "آئیں صاحب......" لیکن صاحب اگر رسوں پر جمی دونوں مٹھیوں میں سے کسی ایک کو کھول کر اس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہیں تو صرف ایک ہاتھ کے سہارے اس پل پر قائم رہنا مشکل تھا...... تو رجب کہتا ہے کہ "آئیں صاحب......" اور صاحب رسّوں کو چھوڑ نہیں رہے اور بُت بنے کھڑے ہیں اور گھگھیا بھی رہے ہیں کہ "را...... جا...... جب"...... تب رجب نے رسّے پر جمی میری دائیں مٹھی پر ہاتھ رکھا اور کہا "چھوڑیں صاحب......" اور میری مٹھی کھلتے ہی اس نے اسے دبوچ لیا اور آہستہ آہستہ مجھے پل کے پار لے گیا......

میرا پورا بدن کھنچا ہوا تھا اور ابھی تک سناٹے میں تھا اور میں پار ہوا ہوں اور اس کیفیت میں جب پل کے برابر میں...... ریت میں دھنسے ایک بڑے پتھر کو دیکھتا ہوں تو اس پر مار کر سے ایک

عبارت لکھی ہوئی ہے......اور میں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کرتا لیکن پتھر پر لکھا ہوا ہے......

HELLO CHACHA TARAR,

RELAX.........

FROM MALANGO DE EXPEDITION.

اس ویران اور دور افتادہ تنہائی میں میرے لئے ایک ذاتی پیغام...... یہ کیا گھمن گھیری ہے بھئی...... یہ تو ایسے ہی ہے جیسے ایڈمنڈ ہلیری ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچے تو وہاں ایک تختی لگی ہو کہ......

HELLO UNCLE HILLERY....

RELAX......

پھر پورٹروں نے بتایا کہ ایک روز پیشتر فیصل آباد کے کوہ نوردوں کی ایک پارٹی یہاں سے گزری ہے جو وادیٔ شمشال کے بعد شمشال پاس تک جانے کا ارادہ رکھتی ہے اور وہاں ایک بلند چوٹی ملونگودی کو سر کرنے کا سودا سر میں رکھتی ہے...... وہ لوگ یہاں سے گزرے ہیں اور انہیں علم تھا کہ میں ایک دو روز میں ادھر سے گزرنے والا ہوں...... اور وہ جانتے تھے کہ چاچا تارڑ اوّل تو روڈ کیمپ کی چڑھائی دیکھ کر کان لپیٹے واپس ہو جائیں گے اور اگر وہ اسے پار کر آئے تو اس پل کو پار کرتے ہوئے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی...... اور اگر بفرض محال نہ کی تو پھڑ پھڑاتے ہوئے اپنے آپ کو زخمی ضرور کر لے گی...... اور جب وہ پار پہنچیں گے تو انہیں RELAX ہونے کا مشورہ تو دیا جانا چاہیے......

اور واقعی میں اس پیغام کے لئے ان نوجوانوں کا شکر گزار ہوا اور مناسب حد تک RELAX ہوا۔

اس پتھر کے ساتھ متعدد تصویریں اتاری گئیں تاکہ سند رہے کہ چاچا جی یہاں تک تو پہنچ ہی گئے تھے......

پل کے پار...... دریائے شمشال کے دوسرے کنارے پر...... ایک باقاعدہ چوڑا راستہ تھا جس کے دونوں جانب پتھر ترتیب دیئے گئے تھے اور یہ اہل شمشال کی مشقت تھی...... جب

کبھی جیپ روڈ یہاں تک پہنچے گی تو یہ راستہ اس کا منتظر ہو گا......

دریا کے پار...... جدھر سے ہم ادھر آئے تھے...... وہاں وہ راستہ جسے ہم نے چھوڑا تھا بلند ہو کر خطرناک ڈھلوانوں کے اندر جا رہا تھا...... یہ وہی سنگ باری کا خطرناک علاقہ تھا......

رجب درست کہتا تھا...... شیطان کبھی بھی بیکار نہیں بیٹھتا...... اونچی فصیلوں سے دھول اتر رہی تھی اور اس میں ملفوف بڑے بڑے پتھر نیچے آ رہے تھے...... جانے اہل شمشال وہاں سے کیسے گزرتے ہوں گے...... اگر وہ کہتے تھے کہ شمشال کا راستہ اب آسان ہو گیا ہے تو درست ہی کہتے تھے...... ہم میں تو اتنی سکت نہ تھی کہ ہم اس راستے پر جان بچانے کے لئے اندھا دھند مسلسل بھاگ سکتے...... اگرچہ ہم نے "سنولیک" کے دوران دریائے برالڈو کے کناروں سے اترتے پتھروں کی بارش میں اپنے آپ کو ہلکان کیا تھا اور بھگایا تھا...... لیکن وہ چند لمحوں کا کھیل تھا اور یہاں ایک طویل فاصلہ تھا......

ہم دریا کے پار اس سرمئی ڈھلوان پر اٹھتی دھول اور پتھروں کو گرتے دیکھتے رہے......

اگرچہ ہم محفوظ تھے اور ایک طویل فاصلے پر تھے لیکن اس کے باوجود اس منظر کی دہشت ہم پر اثر کرتی تھی......

شیطان کبھی بیکار نہیں بیٹھتا......

دو تین کلو میٹر چلنے کے بعد ہم پھر دریا کی قربت میں ہوئے......

وہ شیطانی پورشن گزر چکا تھا......

ایک اور پل آیا......

یہ پل بھی...... پہلے پل کی مانند عجیب پل تھا...... پل تھا بھی اور نہیں بھی تھا......

اس کے تختوں کے درمیان بھی مہیب شگاف تھے اور اوپر اٹھتے بگولا صفت شمشال دریا کے پانی تھے لیکن...... اب ہم شادی شدہ تھے...... پہلی شادی کے بعد دوسری شادی سے جھجکتے نہ تھے کیونکہ تجربہ کار ہو چکے تھے۔ نہایت احتیاط سے آہنی رسوں کو تھامتے ہوئے...... تختوں کو پھلانگتے ہوئے ہم اس پل کے پار ہوئے اور یہ جانا کہ تجربے سے خوف کم ہو سکتا ہے، خطرہ نہیں!

"وہاں......" رجب پل کے دوسری جانب میری آمد کا منتظر تھا...... اس نے فصیل نما

چٹانوں کی طرف اشارہ کیا "وہاں...... پہاڑوں کے دامن میں دو کمرے دکھائی دیتے ہیں......"

"نہیں دکھائی دیتے......"

"بہر حال مجھے دکھائی دیتے ہیں......" اس نے جھلا کر کہا...... "وہ زیارت ہے۔"

ہم کھل اٹھے کہ منزل سامنے ہے لیکن منزل کا محل وقوع دیکھ کر کچھ مرجھا بھی گئے...... کوئی ویران سی اور خشک چٹانی جگہ تھی...... زیلدت کو بھی آئے تو کیسی زیارت کو آئے......

"رات اُدھر کریں گے؟"

"ہم وہاں پہنچ کر دیکھیں گے کہ رات کدھر کریں گے...... اگر آپ میں ہمت ہوئی تو...... زیارت سے پرے ان بلند دیواروں کے دامن میں جہاں تھوڑی سی برف جھانکتی ہے اور کچھ سبزہ دکھائی دیتا ہے...... اس سے پرے شکار جوئی ہے جو یہاں سے دکھائی نہیں دیتا...... تو وہاں پہنچ کر خیمے لگائیں گے...... لیکن اس کا فیصلہ زیارت پہنچ کر ہوگا......"

"زیارت...... بلند عرش پر شاہ شمس اپنے پرچم لہراتا تھا"

دریا کے پار ہو کر...... ہم بہت دیر چلے...... پتھروں کے درمیان ایک طویل سفر کے بعد...... ریت سے اٹے راستے میں سے پاؤں نکالتے...... ہانپتے ہوئے ہم بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچے جو چٹانوں کے دامن میں تھی...... اور کچھ سیڑھیاں...... پتھروں کی' اوپر جا رہی تھیں......

"آئیں صاحب...... ان کے اوپر زیارت ہے۔"

اوپر آمنے سامنے دو پتھریلی آماجگاہیں تھیں جو چٹانوں میں مدغم ہو رہی تھیں......

رجب نے ایک پتھر کو اٹھایا تو اس کے نیچے چابیوں کا ایک گچھا تھا......

ایک کوٹھڑی کے سنگلاخ سینے میں ایک مختصر سا لکڑی کا تختہ نصب تھا اور کنڈے کے نیچے ایک منحنی سا قفل زنگ آلود ہو رہا تھا...... رجب نے متعدد بار ایک چابی اس میں گھمائی اور پھر کنڈی سرکا کر تختے کو اندر دھکیل دیا......

ہم سر جھکائے...... جیسے کسی تنگ غار میں داخل ہوتے ہیں...... اندر چلے گئے......

اندر زیر زمین پوشیدہ غاروں والی اجنبی خاموشی تھی...... اور تاریکی تھی......

اس لئے ہم بھٹکتے ہوئے اندر گئے اور رک گئے......

اس کھلے تختے میں سے جب تک لوگ اندر داخل ہوتے رہے وہاں تاریکی رہی اور پھر کچھ دکھائی دینے لگا...... جیسے تبت کے لاماؤں کی کوئی لاماسری ہوتی ہے......

پھر آگ دکھائی دی جو ایک چولہے کے نیچے روشن ہو رہی تھی...... اور چولہے پر ایک دیگچہ چڑھا تھا...... اور اس میں نوڈل سوپ ابل رہا تھا...... اور قدرت اس پر جھکا ہوا تھا......

لگتا تھا کہ وہ ہماری آمد سے پیشتر یہاں پہنچ گیا تھا...... لیکن ایسا نہیں تھا۔

وہ ہمارے ساتھ ہی اس کمرے میں داخل ہوا تھا اور جتنی دیر ہم تاریکی میں بُت بنے کھڑے رہے تھے اس نے لکڑیاں جمع کر کے آگ سلگالی تھی اور چینی کے ٹو مہم سے حاصل کردہ نوڈلز کو دیگچے میں ڈال کر اب سُوپ تیار کرنے کے آخری مرحلوں میں تھا۔

چولہے کا دھواں ایک بوسیدہ جستی پائپ کے راستے کمرے کی چھت کے کھلے روشندان سے باہر جا رہا تھا۔

کمرے کے تین جانب چولہے سے ذرا بلند کچے پلیٹ فارم تھے اور ان پر پرانے گدے اور رضائیاں بچھے ہوئے تھے اور ہمارے پورٹر اپنے بوجھ سے آزاد...... اپنے پاؤں کو بوٹوں اور جوگرز سے بھی آزاد کر کے...... وہاں آرام کر رہے تھے۔

رجب شاہ نے بھی اپنا رک سیک اتارا...... بوٹوں کے تسمے کھولے اور گدوں پر صرف دو کروٹیں بدل کر یکدم گہری نیند میں چلا گیا......

قربان نے بھی اپنا بوجھ اتارا اور سر کے نیچے بازو رکھ کر فوری طور پر آسودہ ہوا اور سو گیا...... راہبر کہیں باہر گھومتا تھا...... اور چولہے کے لئے لکڑیاں تلاش کرتا اور چٹانوں میں درختوں کے کسی ذخیرے میں جا چکا تھا۔

قدرت...... اپنی خوبصورت نیم باز آنکھوں سے دیگچے میں ابلتے ہوئے سوپ کو دیکھتا تھا اور انہیں سرخ کرتا تھا "ریلیکس تارڑ صاحب......"

میں نے اپنا رک سیک کندھوں سے کھسکا کر اتارا...... بوٹوں کے تسمے ڈھیلے کئے اور پلیٹ فارم پر بچھے ہوئے گدوں پر نیم دراز ہو گیا...... ابھی تک اس نیم تاریک ماحول کی عادت نہیں ہو رہی تھی...... ویسے عجیب پوستی سا ماحول تھا...... کہیں بھی جانے کو جی نہیں چاہتا تھا......

میں نے اس سے پیشتر کسی بھی کوہستانی راستے میں اس قسم کی آرام گاہ نہیں دیکھی تھی...... قدرت اپنے نوڈل ٹوپ کے دیگچے میں ڈوئی ہلا رہا تھا "یہ شمشال والوں کے کمرے ہیں تارڑ صاحب...... یہاں سٹور میں کچھ نیلے ڈرم رکھے ہوئے ہیں جن میں چائے، چینی، گھی اور آٹا وغیرہ موجود ہیں...... جو کوئی بھی ادھر پہنچتا ہے وہ جانتا ہے کہ ان کی چابی کہاں پوشیدہ

ہے، وہ انہیں کھول کر حسب ضرورت خوراک استعمال میں لاتا ہے...... رات بسر کرتا ہے اور آگے چلا جاتا ہے...... اکثر اوقات پورے خاندان سفر کرتے ہیں بچوں اور عورتوں کے ساتھ اور ادھر رات کرتے ہیں۔"

"یہ جو بے شمار بستر ہیں...... اور رضائیاں اور کمبل ہیں...... یہ بھی آپ لوگوں نے سٹور کر رکھے ہیں؟"

"ہاں...... سردیوں میں ادھر سے زیادہ مسافر گزرتے ہیں...... ایک زمانہ ایسا تھا کہ گرمی کے موسم میں دریائے شمشال میں بہت پانی ہوتا تھا اور نیچے پہنچنے کے لئے اسے بیس پچیس مرتبہ عبور کرنا پڑتا تھا...... کبھی اس کنارے پر اور کبھی دوسری جانب...... اس لئے صرف مجبوری کے تحت یا بیماری کی وجہ سے موسم گرما میں لوگ شمشال چھوڑ کر نیچے آتے تھے......

البتہ سردیوں میں...... جب دریائے شمشال میں پانی بہت کم ہو جاتا تھا اور اسے آسانی سے پار کیا جا سکتا تھا، وادی کے لوگ زیادہ سفر کرتے تھے...... یوں بھی سردیوں میں شمشال میں کوئی فصل نہیں ہوتی...... کھیت ویران پڑے رہتے ہیں اور دھول اڑتی ہے...... کبھی برف گرتی ہے اور کبھی موسم خشک گزر جاتا ہے...... تب لوگ نیچے آتے ہیں، ضروریات زندگی کے حصول کے لئے...... آٹا، چائے، چینی اور دالوں کے لئے...... اور پھر ہر برس شاہ شمس کے عرس پر شمشالی خواتین آتی ہیں اور وادی کے راستے میں جتنے بھی پڑاؤ ہیں...... شمشال والوں کی سرائے ہیں...... ڈوٹ، زیارت، گرم چشمہ وغیرہ...... تو وہ آتی ہیں اور کمروں کی صفائی ستھرائی کرتی ہیں...... رضائیوں کو روئی سے بھر کر نگندتی ہیں...... کمبل اور بستر دھوتی ہیں...... زیارت میں لوگ خاص طور پر آکر ٹھہرتے ہیں اور وہ شاہ شمس کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ موسم گرما عافیت سے گزرا...... ان کے مال مویشی اور یاک چارے پر موٹے ہونے اور پھر موسم سرما کے خیریت سے گزر جانے کی دعا کی جاتی ہے......"

"لیکن شاہ شمس کی یہ زیارت ہے کہاں؟"

"دریا کے پار......"

"تو یہ زیارت نہیں جہاں اس وقت ہم ہیں......"

"نہیں...... یہ تو زیارت کے کمرے ہیں...... ان کمروں کے اوپر بھی ایک جگہ ہے

جہاں لوگ سلام کرتے ہیں لیکن شاہ شمس کی زیارت دریا کے پار چٹانوں کے اوپر ہے۔"

میں نے بھی دریا کے پار نگاہ کی تھی تو وہاں بہت ہی بلند ایک ڈھلوانی اور چٹانی مقام تھا...... بہت اوپر بے آب و گیاہ اور ویران پہاڑوں کے اوپر چند جھنڈے لہراتے تھے جو فاصلے کی وجہ سے بہت غور کرنے سے نظر آتے تھے۔ وہ اتنی بے پناہ بلندی پر لہراتے تھے......

"تو اوپر جہاں مختلف رنگوں کے جھنڈے آویزاں ہیں وہاں شاہ شمس کا مزار ہے؟"

"نہیں صرف زیارت ہے' شاہ شمس کے قدم وہاں سے گزرے تھے...... وہ ہم شمشال والوں کے بزرگ ہیں...... پیر ہیں...... ہم ان سے بہت کچھ مانگتے ہیں۔"

"میں نے چٹانوں کے اوپر اس ناقابل یقین بلندی پر پتھروں کی کوئی قدیم چاردیواری بھی دیکھی ہے جو ظاہر ہے انسانی ہاتھوں کی تعمیر کردہ ہے...... تو یہ کب تعمیر ہوئی اور کون لوگ تھے جو اتنی اونچائی پر پہنچے؟"

"ہم نہیں جانتے...... ہمارے دادا اور ان کے دادا کے زمانے سے وہ دیواریں موجود ہیں...... ہم نہیں جانتے کہ انہیں تعمیر کرنے والے کون تھے...... ادھر پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔"

"تو پھر وہاں جھنڈے کون لہراتا ہے؟"

"جن کی مرادیں پوری ہوتی ہیں...... وہ جان جوکھوں میں ڈال کر وہاں پہنچتے ہیں اور جھنڈے نصب کرتے ہیں۔"

"قدرت' آپ کبھی اوپر گئے ہو؟"

"نہیں...... اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں جو وہاں اوپر تک گیا ہو...... انکل رجب بھی نہیں...... تارڑ صاحب جن کی مراد پوری ہوتی ہے وہی وہاں تک جانے کا خطرہ مول لیتے ہیں......"

"شاہ شمس ہر مراد پوری کر دیتے ہیں؟"

"اگر آپ ان پر یقین کرتے ہوں تو...... آپ کی کوئی مراد ہے؟"

"ہاں ہے...... لیکن یہ شاہ شمس اسے پوری نہیں کر سکتا......"

قدرت تھوڑا رنجیدہ ہوا کہ میں اس کے شاہ کی کرامات پر یقین نہیں رکھتا "کیوں؟"

"اس لیے کہ میں مراد مانگوں گا تو وہ پوری کریں گے ناں...... میں مانگوں گا ہی نہیں......"

قدرت نے نوڈل سوپ میں سے اٹھتی گرم بھاپ پر سے سرخ آنکھیں اٹھائیں "لیکن مراد ہے تو سہی......"

"ہے......"

"تو پھر کیوں نہیں مانگتے؟"

"بھئی اگر مراد پوری ہو جائے تو مجھے جھنڈا لگانے کے لیے اس ناممکن سی بلندی پر جانا پڑے گا' جہاں کے ٹو پر پہنچنے والوں کے بھی قدم نہیں پہنچے...... چنانچہ راستے میں وصال کا شدید احتمال ہے...... اس لیے ہم مراد مانگنے سے گریز کرتے ہیں...... دیکھو ناں اگر مراد مل جائے اور بندہ فوت ہو جائے تو فائدہ......"

"تو پھر آپ کی لگن سچی نہیں ہے...... اگر آپ اتنا حساب کتاب کرتے ہیں......"

"صحیح...... لیکن تم میرے معاملات میں دخل نہ دو اور سوپ میں ڈوئی ہلاتے رہو جو تمہارا کام ہے......" میں نے ہنس کر کہا۔

ایک مستطیل کمرہ جو اب تاریک نہ رہا تھا...... ہمیں اس میں دیکھنے اور پرکھنے کی عادت ہو گئی تھی...... تین اطراف پر تقریباً پون فٹ بلند کچا پلیٹ فارم جس پر گدے اور ان پر ہم...... سامنے وہی مختصر پھاٹک جو اندر آنے کا واحد وسیلہ تھا...... اور پلیٹ فارم کے درمیان میں ایک کچی جگہ...... جس کے درمیان میں چولہا اور اس پر ابلتا نوڈل سوپ...... ہم پلیٹ فارم پر بیٹھے پاؤں کچے فرش پر رکھے سوپ کے منتظر...... اور چولہے کا دھواں باہر لے جاتا ہوا ایک پائپ...... چھت کے چوکور روشن دار سے باہر...... اور باہر...... دھواں اس وسیع وادی میں تحلیل ہوتا تھا' جس کے دونوں جانب آسمانی قلعہ بندیاں تھیں' فصیلیں تھیں' زمین پر دریائے شمشال تھا اور ایک بلند عرش پر شاہ شمس اپنے پرچم لہراتا تھا......

یہ ایک ایسا محبت نما ماحول تھا جس میں میں پہلی بار سانس لے رہا تھا...... اگرچہ گدے اور رضائیاں خاصے غلیظ تھے...... کمرے کی تعمیر کے لیے جو پتھر استعمال کیے گئے تھے اور جانے ایک صدی پیشتر ایسا ہوا تھا تو ان کے جوڑوں میں شگاف تھے جن میں یقیناً متعدد چھپکلیاں اور

دیگر رینگنے والی چیزیں رینگتی ہوں گی...... چھت سے جالے لٹکتے تھے...... کچے فرش پر دھول تھی اور متعدد ایسے BUGS یا کیڑے رینگتے تھے جو مویشیوں میں پائے جاتے ہیں...... وہاں سے گڈریوں میں منتقل ہوتے ہیں اور وہ پھر گڈریے جہاں جاتے ہیں ان کو ساتھ لے جاتے ہیں...... چنانچہ کچے فرش پر اس نوعیت کی متعدد رعنائیاں رینگتی تھیں...... لیکن...... اس کے باوجود میں اس پتھریلے نیم تاریک کمرے کے ماحول کے عشق میں مبتلا ہوتا چلا گیا...... کیونکہ یہ مختلف تھا...... سجاوٹ نہیں تھا...... انسان کی اصل کے مطابق تھا...... ضرورت اور عقیدے کے مطابق تھا...... مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی پہلا جنم ہوتا ہے تو میں انہی خطوں میں رہتا تھا...... مارخور کا وہ شکاری تھا جو اسی قسم کی پناہ گاہوں میں رات بسر کرتا تھا...... بیافو گلیشیر کے اوپر چٹان میں پوشیدہ جو گھاس والا جھونپڑا تھا اس میں آگ جلائے اپنے بدن کو گرماتا تھا...... اور وہ شکاری تھا جو مارخور سامنے آنے پر اسے مار نہیں سکتا تھا اس کے قدرتی حسن اور سینگوں کے پیچ وخم میں الجھ جاتا تھا...... ایسا شکاری تھا...... اسی لیے شمشال مجھے بار بار بلاتا تھا...... میرا پہلا جنم مجھے بلاتا تھا......

میرے شمشالی پورٹروں کے چہرے بھی اس نیم تاریک کمرے میں کچھ چینی...... کچھ تاجک اور کچھ کرغیز تھے...... رجب کا کھنچا ہوا چہرہ...... قدرت کی ترچھی پرکشش منگول آنکھیں...... راہبر کی شکل...... بیگ کا مشقتی وجود...... وہ بے شک آج کے لباس میں تھے' لیکن ان کے چہرے چغلی کھاتے تھے کہ وہ اس عہد کے نہیں...... قدیم کوہستانی زمانوں سے آئے ہیں...... وقت کی سرنگ کے پار ہو کر ادھر اس کمرے میں آ نکلے ہیں......

سوپ تیار ہوا تو قدرت نے رجب کو بھی جگا دیا......

وہ گرم اور آتش مزاج تھا...... یعنی سُوپ......

سُوپ کے مگ میں سے چند سرکیاں لینے کے بعد میں نے اس کی تہہ میں جمع...... سفید سنپولیوں کی طرح کنڈلیاں مارے آرام کرتے نوڈلز کو دیکھا اور سوچا کہ اب انہیں کیسے نوش کیا جائے تو قدرت نے میرے چہرے سے بھانپ لیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں...... اس نے فوری طور پر چولہے میں سلگتی ایک ٹہنی اٹھائی اور چاقو سے اسے تراش کر ایک چمچہ بنایا اور مجھے تھما دیا...... یہ قانون ضرورت کے تحت تخلیق کیا گیا تھا اور نہایت کارآمد تھا...... میں اس

تراشی ہوئی ٹہنی کو سُوپ میں ڈبو کر نوڈلز کو اس پر بیلنس کرتے اور مگ لبوں کے قریب لے جا کر انہیں چینی سٹائل میں منہ میں اتار لیتا......

زیارت کی اس کوٹھڑی کے باہر جو فصیلوں میں گھری وادی کی ایک وسیع دنیا تھی اس سے ہم لاتعلق ہو چکے تھے...... اور اس تپتی نیم تاریکی میں پاؤں پھیلائے اطمینان سے سوپ پیتے تھے...... اگرچہ کچے فرش پر BUGS رینگتے تھے اور ہمارے جوگرز کے قریب آ کر سستی سے اپنا رخ بدل لیتے تھے......

راہبر اور بیگ نے کواڑ نما دروازہ دھکیلا اور اندر آ گئے...... وہ قریبی چشمے سے پانی بھرنے کے لیے گئے تھے اور شکار جوئی جا کر کچھ لکڑیاں لے کر آئے تھے تاکہ سوپ کے بعد نمکین چائے کی تیاری کی جا سکے......

کواڑ بند ہوا تو پھر اندھیرا ہو گیا......

صرف چوکور روشن دان میں آسمان کا ایک مختصر مکھڑا تھا اور وہاں سے ہلکی روشنی اِس تاریکی میں داخل ہوتی تھی اور نگلی جاتی تھی اور صرف اتنی باقی رہ جاتی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے چہرے پہچان سکیں......

"رجب...... آپ بھی دریا پار شاہ شمس کے قدموں کی بلندی تک نہیں پہنچے؟"

"نہیں صاحب......" اس نے سر ہلایا...... ایک نوڈل اس کے ہونٹوں سے لٹکتا تھا اور رجب نے اسے انگلی سے منہ میں ڈالا اور سر ہلایا "کبھی نہیں......"

"ویسے اوپر ہے کیا؟"

"قدرت نے بتایا ہو گا کہ اوپر جانے کا کوئی راستہ نہیں...... بے شمار پتھر گرتا ہے...... ہم نے سنا ہے کہ ایک سال پہلے کسی آدمی کا مراد پورا ہوا تو وہ اوپر گیا...... اور یہ جھنڈے جواب دکھائی دیتے ہیں تو وہ لگا کر آیا تھا۔"

"لوگ کیا مراد مانگتے ہیں؟"

"عام طور پر بچے کا مراد مانگتے ہیں۔ جن کی اولاد نہیں ہوتی...... کوئی بیماری ہو تو عرض کرتے ہیں...... اور ہر شخص کا اپنا اپنا مراد ہوتا ہے...... وہ مانگتا ہے۔"

"بہت بڑے بزرگ ہیں؟"

"ہاں جناب...... ادھر شمشال میں تارڑ صاحب...... تین بڑے بزرگ ہیں جن کی بہت برکت ہے...... چپرساں کی وادی میں بابا غُندی کی زیارت ہے...... بہت مشہور ہے...... پھر آپ جب گل مت سے پسّو آتے ہیں تو شاہراہ ریشم کے کنارے شاہ طالب کی زیارت ہے جدھر ڈرائیور لوگ رکتے ہیں اور ان کے جھنڈے کو ہاتھ لگاتے ہیں...... اور پھر یہ ہمارے شاہ شمس ہیں۔"

"شاہ کدھر سے آئے تھے؟"

"چین کی جانب سے...... شمشال پاس کے راستے سے آئے تھے۔ جدھر ان دنوں ہماری چراگاہیں ہیں...... پھر اس مقام پر...... دریا کے پار اُس بلند جگہ پر چند روز ٹھہرے اور پھر آگے چلے گئے۔"

"آگے کہاں چلے گئے؟"

"یہ معلوم نہیں...... سامنے پہاڑ پر ان کی قدم گاہ ہے...... میں نے اپنے ایک دادا سے سنا ہے جو وہاں اوپر قدم گاہ تک گئے تھے کہ وہاں اس زمانے میں ایک چراغ دان ہوا کرتا تھا‘ بہت بڑا...... پتھر کا بنا ہوا...... اور شاہ شمس کا عصا تھا......"

"اب بھی ہے؟"

"نہیں...... اب نہیں ہے...... یہ جو سامنے پہاڑ ہے جس پر قدم گاہ اور پرانی دیواریں ہیں اور جھنڈے لہراتے ہیں‘ اس کا نام اَمرس ہے جو شاہ شمس کے ساتھی اور مرید کا نام تھا......"

"آپ بہت معتقد ہیں شاہ کے؟"

"ہاں صاحب...... ادھر آپ نے دیکھا ہے کہ جدھر مسلسل اوپر سے پتھر آتا ہے اور سینکڑوں برسوں سے آتا ہے تو کچھ عرصہ پہلے تک شمشال کے لوگ مجبوراً ادھر سے ہی گزرتے تھے...... لیکن آج تک کوئی بھی شمشالی ان پتھروں سے ہلاک نہیں ہوا...... شدید زخمی ہو گیا ہے لیکن مرا نہیں تو ہم سمجھتے ہیں یہ شاہ شمس کا ہاتھ ہے جو بچاتا ہے...... ورنہ آپ نے خود دیکھا ہے کہ کتنا پتھر اوپر سے آتا ہے...... اس میں انسان تو کیا پرندہ بھی نہیں بچ سکتا...... تو شاہ بچاتے تھے...... شمشال تک جتنا بھی خطرناک سفر ہے وہ صرف شاہ کے قدم کی

وجہ سے آسان ہو جاتا ہے......"

اور یہ ایک حقیقت ہے اور میں اس کا گواہ ہوں کہ شمال میں اچانک اوپر سے پتھر آنے سے لوگ مرتے رہتے ہیں...... لیکن یہاں سینکڑوں برسوں سے بارش سنگ جاری ہے اور اس میں سے لوگ گزرتے رہتے ہیں اور پھر بھی بقول رجب آج تک کوئی ہلاک نہیں ہوا...... ان علاقوں میں غیب سے ضرور مدد آتی ہے ورنہ یہ دورافتادہ بستیاں کب کی ویران ہو چکی ہوتیں......

"ہمارے ہاں یہ بھی کہاوت ہے کہ...... زیارت کا شمس اگر کچھ نہیں کرے گا تو پھر دیکھنا قارون کرے گا...... یعنی شاہ شمس مہربان ہے اور کوہ قارون کے راستے سفر کرنے والے ہلاک ہوتے ہیں۔"

"سائیں رات ادھر کرتے ہیں ناں......" ندیم جو یوں بھی ذرا مست دکھائی دیتا تھا آنکھیں نیم وا کیے بیٹھا تھا...... "ایسا ماحول نہیں ملے گا ناں......"

"یہاں BUGS رینگتے تو میں نے بھی دیکھے ہیں اور ان رضائیوں میں یقیناً کھٹمل اور پسّو وغیرہ بھی بسیرا کرتے ہوں گے...... کیوں رجب؟"

"وہ تو ہیں صاحب......" رجب بہت خوش ہوا "ہمیں تو کچھ نہیں کہیں گے شاہ شمس کی برکت سے...... لیکن آپ کو پریشان کریں گے۔"

اس تپتی کمرے کا ماحول اپنی جگہ...... لیکن میں اپنے پورٹروں اور ساتھیوں کے ہمراہ یہاں رات بسر کرنے کے خیال سے خوش نہیں تھا...... میں کھلی فضا میں اپنے خیمے کی پرائیویسی کا متمنی تھا...... اور میں نے سیڑھیاں چڑھ کر جب ان کمرے کے برابر میں اس مقام کو دیکھا تھا جہاں عام طور پر کوہ نورد اپنے خیمے نصب کرتے ہیں تو اس جگہ کو بے روح اور ویران پایا تھا...... دور دور تک خشک اور چٹیل مسافتیں تھیں اور دریا کے پار بلندی پر شاہ شمس کے پھریرے تھے...... اور کچھ نہ تھا...... نہ سبزہ نہ گھاس...... نہ پانی...... نہ کوئی خوشی دینے والا منظر......

"رجب...... ہم آگے جا کر کیمپ کریں گے...... تم کہتے ہو کہ شکار جوئی یا شکر جوئی میں پانی ہے اور جنگل ہے...... وہ یہاں سے کتنی دور ہے......"

"آپ چل سکتے ہیں؟"

"ہاں...... لیکن کتنی دور؟"

"کوئی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آسانی سے پہنچ جائیں گے......"

"تو پھر کوچ کرو......"

"لیکن ایک مسئلہ ہے جناب......"

"وہ کیا؟"

"ادھر تو رات گزارنے کا پورا بندوبست ہے...... ادھر شکار جوئی میں جاتے ہیں تو آپ کے پاس تو خیمے ہوں گے لیکن ہم لوگوں کے لیے کوئی چھت نہیں ہوگی۔"

"تو پھر مجبوراً ہمیں بھی یہیں قیام کرنا ہوگا؟"

"نہیں صاحب...... ایسا کریں گے کہ ابھی پورٹر لوگ آپ کا سامان لے کر ادھر جائیں گے' آپ کا خیمہ وغیرہ لگائیں گے اور واپس آکر ادھر زیارت میں رات کریں گے اور پھر کل صبح سویرے آپ کے کیمپ میں پہنچ جائیں گے۔"

"صرف چھت کا مسئلہ ہے؟"

"ہاں......"

"تو ہمارے پاس تین ٹینٹ ہیں...... دو میں ہم گزارہ کریں گے...... اور تیسرا ٹینٹ بہت بڑا ہے اس میں آپ رات بسر کر سکتے ہیں۔"

"ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔"

"تو چلیں؟"

"ابھی تو نمکین چائے پییں گے صاحب...... شکار جوئی دور نہیں۔"

اور زیارت کے کمرے میں جو نمکین چائے میں نے سُڑک سُڑک کر پی وہ بہت ہی نمکین تھی اور اس میں شاید یاک کا گھی بھی ملا ہوا تھا......

"رجب آپ نے بتایا تھا کہ پرانے زمانوں میں آپ لوگ کوہ قارون کے راستے...... مارخون سے سفر شروع کرتے تھے اور پھر ادھر زیارت پہنچ کر اپنی وادی کو جاتے تھے تو پھر ادھر پسّو کے راستے سے کب آنے لگے؟"

"ابھی 1966ء تک ہم ادھر سے ہی آتے تھے...... مارخون کی جانب سے...... اور کوہ قارون...... شاہ شمس کی طرح مہربان نہ تھا...... بہت ظالم تھا...... اس کے درّے میں سے گزرتے ہوئے بہت لوگ رہ جاتے تھے...... وہاں سے خورزن اور مستاگ درّے میں سے آتے تھے اور بارہ دن لگ جاتے تھے...... اس زمانے میں ہم میروں کے غلام تھے اور ان کے لیے نمک ڈھوتے تھے بیگار کرتے تھے...... ہاں صاحب بہت حیرت کی بات ہے کہ ادھر اوپر نمک پایا جاتا ہے اور پورے ہنزہ میں اور کہیں نہیں ملتا۔ اب تو پنجاب سے آ جاتا ہے...... تو ہم نمک کو اپنی پیٹھ پر بوجھ کر کے لاتے تھے۔ گوشت...... پنیر...... گھی اور کھالیں اٹھا کر میر کے پاس خراج کے طور پر لے جاتے تھے۔ ہم اپنے لیے زندگی نہیں کرتے تھے...... ڈھور ڈنگر تھے اور میر کی چاکری کرتے تھے...... پہلے بہت ظلم ہوا...... لیکن میر جمال کے زمانے میں ایسا نہیں ہوا...... وہ رحم دل انسان تھا......"

"اور اب......"

"اب تو میر لوگ گئے صاحب...... بھٹو صاحب نے ان کو فارغ کر دیا...... اس کا احسان ہے صاحب...... اب ہم اپنے لیے مشقت کرتا ہے...... آزاد ہو گیا ہے......"

زیارت بہت ایکسائٹک اور بہت ہی تبتی قسم کا مقام تھا...... لیکن شاہ شمس کی موجودگی کے باوجود بہت ویران اور خشک تھا...... ابھی دوپہر ڈھلتی تھی اور شام ہونے میں کچھ دیر تھی......

ہم اس تبتی لاماؤں کی قراقرم میں پوشیدہ کوٹھڑی کی...... قدامت میں سے باہر آئے...... تو تیز ہوا سے...... دریا کے شور اور بلند فصیلوں سے...... کچھ حواس باختہ ہو گئے......

رجب نے کمرے کے کواڑ کو بند کر کے اسے مقفل کیا اور چابی ایک پتھر کے نیچے رکھ دی......

ہم نے سوچ لیا تھا کہ واپسی پر جتنی خوراک بچے گی...... جتنا سامان ہو گا وہ ہم سب کا سب شاہ شمس کی اس زیارت کی بھینٹ کر دیں گے تاکہ ہم شمشال کے مسافروں کے کچھ تو کام آئیں...... ان کی خواتین اور بچے عمدہ چائے پییں...... خشک دودھ میں چینی گھول کر نوش کریں...... دیسی گھی کے پراٹھے کھائیں یا سارڈین مچھلیاں کھائیں تو ہمیں یاد کریں...... اور ہم

نے واپسی پر ایسا ہی کیا۔

ہم اس کوٹھڑی سے باہر آئے تو یکدم بے سروپا ہو گئے......

اب ہم سے چلا نہیں جاتا تھا......

آرام میں بسرام کرتے کرتے ہمارے بدن اکڑ چکے تھے......

نیم تاریک پرانی دنیا سے باہر ویرانی اور وسعت تھی اور شمشال نالے کا شور تھا......

نالے کے پار شاہ شمس کے پھریرے لہراتے تھے...... جہاں ایک زمانے میں ایک چراغ دان تھا......ان کا عصا تھا......

ہم زیارت کے کمروں سے نیچے آئے...... پتھریلی سیڑھیوں سے اترتے نیچے آئے اور چلنے لگے......

”ایک رنگین رام چکور میرے قدموں میں......“

سبزے......پانی......اور جنگل کی آس میں پھر سے چلنے لگے۔

زیارت کے فوراً بعد ایک پر شور نالے نے راستہ روک لیا......

یہ کوئی اتنا خونخوار نالہ نہ تھا......

ہم اس کے بہاؤ میں مزاحمت کرتے پتھروں پر قدم رکھتے...... اگرچہ بے حد احتیاط سے......اس کے پار چلے گئے......

پار ہوتے ہی ہم نے اوپر نگاہ کی...... تو ایک حسین چٹی گوری چوٹی نظر آئی جو ”چکورین سر“ تھی...... یہ شاید ایک بانوری چکوری تھی جو کسی چندا سے پیار کرتی تھی اور خود بھی مہتاب شکل تھی...... میں نہیں جانتا کہ ”چکورین“ میں کسی چکور کا عمل دخل ہے یا نہیں...... لیکن یہ جانتا ہوں کہ شمشال میں چکور بہت پائے جاتے ہیں۔

زیارت کی ویران خشکی کے بعد ریت میں پھوٹتی گھاس اور اس میں جذب ہوتے کچھ پانی دیکھے تو آنکھوں کو چین آ گیا......

”ادھر کیمپ کریں گے؟“

”نہیں صاحب‘ ابھی آگے جائیں گے...... شکار جوئی وہ سامنے برفوں کے نیچے جو ہریاول جمی ہے بس وہیں ہے۔“

ہم چلتے رہے......راستہ ہموار تھا لیکن ہماری تھکن اسے مشکل بناتی تھی۔

اور تقریباً نصف گھنٹہ چلنے کے بعد......ایسے کہ میں قدم گھسیٹتا تھا‘ ریت میں سے جو گر کھینچ کر نکالتا تھا اور اس سے کہیں مصیبت یہ کہ بدن کے صحرا میں سے سانس بھی کھینچ کر نکالتا تھا......

ہم نے دیکھا کہ دائیں ہاتھ پر بلند فصیلیں تو موجود ہیں لیکن ان پر سے برفیں جھانکتی ہیں......

اگرچہ ان کے انبار نہیں ہیں' لیکن وہ نظر کو بھاتی ضرور ہیں' اپنی سفیدی اور ٹھنڈک سے...... اور ان کے دامن میں...... پوری خشک اور چٹیل وسعت کے ایک کنارے پر ایک مختصر سا نخلستان ہے...... یہاں بھی ریت نم ہوتی ہے تو اس میں گھاس اور بوٹیاں پھوٹتی ہیں...... پستہ قد جھاڑیاں ہیں...... کوروفون کی مانند کبڑے اور نہایت خوش نظر چھوٹے چھوٹے درخت ہیں...... جیسے جاپانی بونسائی ہوتے ہیں...... اور ان درختوں کے جھنڈ گھنے ہیں اور ان کے اندر ریت میں برف کی تیز ندیاں بہتی ہیں...... پانی ٹھنڈے ٹھار ہیں اور خاموشی سے ہنستے ہوئے بہتے ہیں...... اور درختوں پر یا جھاڑیوں میں کچھ پرندے ہیں جو نظر نہیں آتے' لیکن ان کی آواز آتی ہے......

میں اس نخلستان میں داخل نہیں ہو رہا کنارے پر جو راستہ ہے اس پر چلتا جا رہا ہوں۔

شمشال کے راستے کا جو تصور تھا اور جو کچھ میں نے پڑھا تھا اس کے مطابق اس راستے میں صرف بلند چٹانیں' خطرناک گھاٹیاں اور خوفناک دریا اور اوپر سے گرنے والے پتھر تھے...... ویرانی تھی...... تنہائی تھی...... اذیت ناک گرمی تھی...... اور یہ سب کچھ تھا...... لیکن کسی گائیڈ بک یا کوہ نورد نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس راستے میں شکر جوئی بھی ہے......

شکر جوئی...... شکار جوئی...... یعنی میٹھے پانی کا تالاب۔

پورٹر آگے جا چکے تھے......

میرے ساتھی آگے جا چکے تھے......

اور میں اس نخلستان کے کنارے پر ایک پیاسے اونٹ کی طرح اٹکھیلیاں کرتا اپنے آپ کو ہی شتر غمزے دکھاتا چلتا جاتا تھا...... ایک ایسا شتر جو اگرچہ نڈھال تھا...... روڈ کیمپ کے بعد کی چڑھائی سے بے حال تھا' لیکن اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں میٹھے پانی کے تالاب تک پہنچ گیا ہوں اور اب میں خوب پانی پیوں گا اور اپنے کوہان میں اس کا ذخیرہ کر کے اگلے کئی روز تک مزید شتر غمزے کروں گا......

ایک راستہ تھا جس میں ریت اور پتھر تھے اور دائیں جانب کے سرسبز ذخیرے میں سے کچھ پانی بہتے آتے تھے اور اس میں جذب ہو کر اسے گیلا کرتے تھے۔ ایک چھوٹی سی ندی اس کی ہریاول میں سے بہتی ہوئی میرے سامنے آ گئی اور ریت پر بوٹوں کے نشان یہ اطلاع کرتے تھے کہ تمہارے ساتھی یہیں سے پار گئے ہیں۔ میں نے اس مختصر سی ندی کے پاٹ کو ایک نظر

سے دیکھا اس میں اٹکے ہوئے ان دو چار پتھروں کو دیکھا جن پر قدم رکھ کر میرے ساتھی گزرے تھے اور میں نے سوچا کہ نہیں ادھر خدشہ ہے کہ میں اس میں گر کر اپنے آپ کو بھگو لوں گا یا اپنے جوگر گیلے کر لوں گا تو ذرا آگے چل کر اسے پھلانگتے ہیں' جہاں یہ مزید مختصر ہو گی...... یا پتھر زیادہ ہوں گے......

اب میں شکر جوئی پہنچنے کی مسرت میں مست تھا...... ڈھلوانوں پر نہ گرنے کی سرخوشی میں الست تھا...... میرے دائیں جانب گھنی جھاڑیوں میں وہ ندی میرا ساتھ دے رہی تھی اور میں اپنی ترنگ میں تھا اور عمر کے زوال کو بھول چکا تھا جب......

دائیں طرف سے گھنی جھاڑیوں میں سے...... میرے قدموں کی چاپ سے ہراساں ہو کر کوئی شے نکلی۔

پھڑ پھڑاتی ہوئی اور ایک نامانوس سی آواز نکالتی ہوئی......

اور مجھے تقریباً چھوتی ہوئی کہ میں اس کے پروں کی خوفزدہ پھڑ پھڑاہٹ کی زد میں جو ہوا آئی تھی اسے اپنے چہرے سے ٹکراتے ہوئے محسوس کر گیا......

وہ شے یکدم نکلی...... مجھے ششدر کرتی ہوئی...... جو کوئی پرندہ تھا اور بہت حجم والا...... مرغی سے کہیں بڑا لیکن اس کے بدن پر رنگ اتنے تھے کہ ایک قوسِ قزح میری نظروں کے سامنے تیر گئی۔

اور اس کی یکدم پھڑ پھڑاہٹ اس خاموشی اور ویرانی میں جو یکدم پٹاخ سے آئی تو میری مستی اور الستی کافور ہو گئیں کہ یہ کیا ہے......

اور وہ پرندہ میرے گھٹنوں کی سطح پر پھڑ پھڑ کرتے گزرا اور بائیں ہاتھ پر جو پتھروں کی دنیا تھی اس میں گم ہو گیا......

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میرے ساتھ ہوا کیا ہے...... کچھ ہوا بھی ہے یا نہیں......

وہ پرندہ ایسے آناً فاناً برآمد ہوا ہے کہ میں خوفزدہ ہو گیا کہ اللہ جانے یہ کیا شے ہے جو شاید مجھ پر حملہ آور ہو گئی ہے......

لیکن وہ شے جا چکی تھی...... پتھروں میں روپوش ہو چکی تھی......

میں نے دو چار لمحے اس کی یکدم آمد کے سکتے میں گزارے...... کچھ غور کیا اور غور کرنے پر بھی فہم و دانش نے کچھ مدد نہ کی تو پھر چلنے لگا...... بہرحال کوئی شے تھی...... جانے کیا شے تھی......

"شکر جوئی...... میٹھے پانی کا تالاب"

شکر جوئی......

میٹھے پانی کا تالاب......

تالاب نہیں درجنوں چھوٹی بڑی ندیاں تھیں جو چٹانی فصیل کے دامن میں گھنے ذخیرے میں اور جھاڑیوں کے جمگھٹ میں لاپروائی کی خنک ٹھنڈک میں رواں تھیں اور ان کے کنارے جو ایک چھوٹی سی ریتلی جگہ تھی وہاں ہمارے رک سیک ایک پتھر سے ٹیک لگائے آرام کرتے تھے کہ وہ بھی تو تھک چکے تھے...... پورٹر تھے...... اور نیلے ڈرم تھے جو خنکی میں خوش تھے اور مزید نیلے ہو رہے تھے...... پورٹر تھے...... رجب اور قدرت تھے اور بقا اور ندیم تھے......

یہ شکر جوئی آج شب کے لیے ہمارا پڑاؤ تھا......

اور جناب کیا پڑاؤ تھا......

خیمے سر اٹھانے لگے......

دو خیموں نے تو آسانی سے سر اٹھا لیا لیکن تیسرا خیمہ...... میرا کوریائی چنگیزی کا تحفہ خیمہ ذرا اڑیل ثابت ہوا اور سر نہیں اٹھاتا تھا...... مہربان اور راہبر اس کا کوہان بلند کرتے تھے تو اس کی پشت بیٹھ جاتی تھی...... پشت کو اوپر کرتے تھے تو کوہان میدان ہو جاتا تھا...... اور یہ وہی "یاک سرائے" والا جونک نما کھوا خیمہ تھا جس میں صرف ایک چوپائے کی طرح رینگ کر داخل ہوا جا سکتا تھا...... اور اس میں رینگنے سے پیشتر میں ہمیشہ اپنے ساتھیوں اور پورٹروں کو وارننگ دیتا تھا کہ آپ حضرات میری طرف نہ دیکھیں کسی اور جانب دھیان کریں کیونکہ

جب میں اس میں رینگتا ہوا داخل ہوں گا تو میں نہیں چاہتا کہ آپ میرا عقبی منظر ملاحظہ کریں کیونکہ یہ کوئی اتنا خوش نظر نظارہ نہیں ہو گا۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ ایک مشکل سے ایستادہ ہونے والا خیمہ شمال کے پورٹروں کے لیے ایک ایسا چیلنج ہوتا ہے کہ وہ اسے قائم کرنے کے لیے جان لڑا دیتے ہیں...... سر جوڑتے ہیں...... مشورے کرتے ہیں...... کبھی میخوں کو ادھر ٹھونکتے ہیں کبھی راڈ کو ادھر بلند کرتے ہیں...... اسے اپنے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔

چنانچہ راہبر اور قربان جتے رہے اور بالآخر اسے نصب کرنے میں کامیاب ہو گئے......

اس نے سر اٹھایا اور قائم رہا تو اس میں میرا سلیپنگ بیگ کھول کر بچھایا گیا اور رک سیک آراستہ کر دیا گیا......

خیمہ بستی آباد کرنے کے بعد پورٹر درختوں کے ایک جھنڈ میں چولہا گرم کرنے لگے......

وہ ہم سے الگ ہو گئے اور آج کے سفر کے بارے میں باتیں کرنے لگے......

اور میں ایک ایسے بچے کی طرح کلکاریاں مارتا پھر رہا تھا جسے اس کی اماں جان نے بہت دیر کے بعد...... بھوکا رکھ کر...... دودھ پلا دیا تھا اور وہ خوش ہو رہا تھا...... میرا جی چاہتا تھا کہ شکر جوئی کی غیر متوقع مسرت میں ہر کسی کو شامل کر لوں...... اور ان سے ہاتھ ملاؤں......

"ہاتھ ملائیں رجب شاہ......"

رجب نے حیران ہو کر اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ "ادھر تو کوئی خطرناک چڑھائی نہیں ہے، تارڑ صاحب...... تو ہاتھ کیوں ملاتے ہیں؟"

"بس یونہی...... آپ بس یونہی کا مطلب سمجھتے ہیں ناں؟"

"نہیں......"

"پھر بھی ہاتھ ملایئے......"

رجب مسکرا دیا...... وہ پاکستان کی تمام بلند ترین چوٹیوں کو سر کرنے کے دوران ایسے کئی کوہ پیماؤں سے مل چکا تھا جو بلندی اور پہاڑوں کی تنہائی کے اثر میں اسیر ہو کر اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے تھے......

رجب کے بعد میں نے باری باری سب پورٹروں سے ہاتھ ملایا...... اور جب ندیم کے سامنے جا کر میں نے اسے ہاتھ ملانے کو کہا تو وہ پہلے سے ہی تیار تھا "سائیں آپ کی مہربانی...... میری زندگی میں یہ پہلی شام ہے کہ میں ایک ٹریک کے دوران خیمے میں رات بسر کروں گا...... کیا جگہ ہے تارڑ صاحب...... تھینک یو......"

اور جب میں ہاتھ پھیلائے بقاء کی طرف بڑھا تو اس کی مونچھیں پھڑپھڑا رہی تھیں...... اس کے باوجود کہ یاک سرائے ٹریک کی جاپانی دوشیزہ ویدہ...... جسے اس نے ملتانی سوہن حلوہ پیش کر کے اور خشوپی کی خوبانیوں کے بادام کھلا کر رام کر لیا تھا' یہاں موجود نہیں تھی...... اس کی مونچھیں پھڑپھڑا رہی تھیں...... وہ ایک بے خود کوہ نورد تھا اور میرے جذبات کو خوب سمجھتا تھا۔

ویسے یوں ہاتھ ملانے کا یہ طریقہ' مسرت میں نے اپنی بیٹی قرۃ العین سے مستعار لیا تھا۔ وہ کسی امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کرنے پر...... کسی پاپ سانگ پر...... بھائیوں کی کامیابی پر یا ایک چاکلیٹ کیک تیار کرنے پر یونہی مسرت کا اظہار کرتی تھی...... سب سے ہاتھ ملاتی تھی...... ابو خراٹے لیتے ہوئے خواب خرگوش میں ہیں تو انہیں جگا کر "ابو ہاتھ ملائیں" امی باورچی خانے میں کریلے فرائی کر رہی ہیں تو امی...... ہاتھ تو ملائیں...... اور بے شک اسلام آباد میں دفتر خارجہ کے ڈیسک پر بیٹھے سلجوق بھائی بل کلنٹن کی متوقع آمد کے حوالے سے کوئی حساس ڈاکومنٹ تیار کر رہے ہیں تو انہیں فون کر کے...... بھائی ذرا ہاتھ ملائیں......

چنانچہ سب کے ساتھ ہاتھ ملانے کے فرض سے سبکدوش ہو کر میں نے رک سیک میں سے اپنی سفری نوٹ بک اور مار کر نکالے اور ایک خوش و خرم مارخور کی طرح کللیلیں بھرتا اس خیمہ بستی سے پرے ہو کر ذخیرے کے اندر چلا گیا...... یہاں روشنی یک دم کم ہو گئی...... اس گھنے اور جھکے جنگل کے اندر ندیاں تھیں......

میں نے وہاں تک پہنچنے کے لیے اپنے جوگرز کو بھگو لیا اور ایک چھوٹے سے جزیرے میں جا بیٹھا' جس کے گرد صرف پانی بہتے تھے' جھاڑیاں تھیں اور تنہائی راج کرتی تھی...... اور یہ جزیرہ بس میرے لیے ہی کافی تھا...... وہاں کسی اور کی گنجائش نہ تھی...... اگرچہ خیمہ بستی چند قدم پر تھی لیکن وہ ہریادل میں گم ہو چکی تھی...... اور میں ان کے لیے گم تھا......

میں یہاں الگ ہو کر آیا تو اس نیت سے تھا کہ آج کے سفر کی روئیداد لکھوں...... لیکن میں نے بہت مجرم محسوس کیا...... کہ یہاں بیٹھ کر میں اس بیکار کام میں جُت جاؤں...... یہ تو اس وقت کا زیاں ہو گا کہ میں اس ماحول کو محسوس نہ کروں اور ایک منشی کی طرح آج کے سفر کے بہی کھاتے بھرنے لگوں...... چنانچہ میں نے اپنی سفری نوٹ بک پر چار حرف بھیجے جنہیں انگریزی میں "فور لیٹر ورڈ" کہا جاتا ہے اور بس اپنے آپ میں گم ہوا...... اپنے آس پاس بہتے ان پانیوں میں گم ہوا جن سے یہ میری پہلی شناسائی تھی اور آخری ملاقات تھی...... ان کی ٹھنڈک میں اور سرسراہٹ میں...... اور لمحہ بہ لمحہ اترتی شام میں...... جو یہاں خیمہ بستی کی نسبت...... درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں زیادہ شام تھی...... میں شانت ہو کر بیٹھا رہا...... اور تادیر بیٹھا رہا...... ندیاں شاید درختوں میں سے جنم لیتی آ رہی تھیں...... ان میں جزیرے ریت کے نیم تاریک ہوتے تھے...... اور ان کے اندر شام آتی تھی' باتیں کرتی ہوئی...... مجھ سے لپٹتی ہوئی اور میرے بدن کو بوسے دیتی ہوئی......

اور شام کے ساتھ ندیم بھی چلا آتا ہے...... اور وہ نہیں دیکھتا کہ راستے میں پانی ہیں...... کانٹے دار جھاڑیاں ہیں...... بس چلا آتا ہے اور میرے جزیرے کے سامنے پہنچ کر رک رک جاتا ہے...... "تارڑ صاحب آپ یہاں بیٹھے ہیں؟"

"نہیں...... میں یہاں نہیں بیٹھا ہوں......"

"کدھر پہنچ گئے ہیں سائیں...... ادھر بقاء بھائی مٹر نکال رہے ہیں...... آلو چھیل رہے ہیں' رات کے کھانے کے لیے...... چوکڑی مارے بیٹھے ہیں چولہے کے سامنے...... اور وہ قدرت کہتا ہے کہ تارڑ صاحب کے بغیر بات نہیں بنتی...... ان کو بلاؤ...... آپ آ جائیں۔"

میں آ گیا......

شکر جوئی کے خیموں پر رات اتر رہی تھی......

سامنے...... جس سمت میں ہم نے کل سفر کرنا تھا' وہاں پوری وادی کے آگے ایک دیوار...... ایک فصیل کھڑی تھی...... تاریکی میں تھی' لیکن نمایاں ہو رہی تھی...... میں تشویش میں مبتلا ہوا...... ہم اس آسمانی بلندی کو کیسے عبور کر کے شمشال کی طرف جائیں گے...... وہ راستہ روکے ہوئے ہے......

"رجب...... سامنے جو عرش مقام دیوار وادی کے درمیان میں بلند ہے ہم کیسے اس کے پار جائیں گے؟"

"صاحب آپ غور کرو...... ابھی رات میں واضح نظر نہیں آتا لیکن اس دیوار کے درمیان میں ایک درہ سا ہے جس میں سے دریائے شمشال گزرتا ہے...... تو ہم دریا کے کنارے پر چلیں گے اور اس فصیل کے دوسری جانب پہنچ جائیں گے۔"

شکر جوئی کی خیمہ گاہ کے برابر میں راستہ تھا...... راستے سے پرے دریا تک...... جو اوجھل تھا...... اور نہ اس کی آواز آتی تھی...... وہاں تک ریت کے ایک میدان میں ہزاروں لاکھوں بڑے بڑے پتھر تھے...... ایک پتھریلی خاموش دنیا تھی...... اگر یہ پتھرل بول سکتے تو حشر بپا ہو جاتا' اتنے پتھر تھے...... اور دریا تک جاتے تھے......

خیمہ گاہ سے پرے...... میٹھے پانی کے تالاب سے دور...... اس پتھروں کے شہر کے درمیان میں ریت تھی...... ریت کی دیواروں سے بنا تھا پیار کا پہلا شہر...... اور اس ریت پر ہم براجمان ہوئے۔ شکر جوئی کی رات میں......

"مگر چاندنی میں...... سرخ بھیڑیئے' سنو ٹائیگر اور کاسون"

"تارڑ صاحب...... میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں چین سے آرہا ہوں...... چین میں جو کے ٹو کی سائیڈ ہے وہاں سے لوٹ کر آرہا ہوں۔ تو وہاں دوستوں نے مجھے تحفے کے طور پر گندم کا عرق پیش کیا تھا۔ جو میں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"میں نے خمارِ گندم کے بارے میں تو سن رکھا ہے...... کیا پاکستانی اور چینی گندم میں فرق ہوتا ہے؟"

کچھ زیادہ فرق نہیں تھا......

اور اس ساعت ماہتاب ابھرا...... وہ پہلے سے وہاں تھا' لیکن تاریکی گہری ہونے سے ہمیں وہ اس لمحے دکھائی دیا...... پہلی تاریخوں کا ایک مدھم بجھتا ہوا تھال......

میں...... رجب...... قدرت اور ندیم...... پہاڑوں کی عظیم فصیلوں کے گھیراؤ میں......

ایک وادی کی قید میں...... تنہا اور دور افتادہ......

ابھی وہ وادی بہت فاصلے پر تھی جو دنیا کی تنہاترین جگہ تھی اور جہاں پر ہم خوشی کی تلاش میں جا رہے تھے......

ہم پتھروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے......

اور یہاں اتنے پتھر تھے کہ ہر ایک کے لیے ایک الگ پتھر ٹیک لگانے کو تھا...... اور ہر پتھر تختِ طاؤس کی پشت تھا...... اس لیے ہر کوئی اس جہان کا شاہ تھا......

ریت ہمارے بدنوں کے بوجھ سے بھرتی ہوئی...... اس کے ذرّے سرکتے ہوئے......

ہم پہلو بدل کر پھر سے اپنے آپ کو آرامدہ کرتے ہوئے......

اور پہلی تاریخوں کا بجھا ہوا تھال...... اور اس کی اداس زردی ہم پر اثر نہ کرتی تھی۔ ایک زرد چینی شہزادی جو میری قربت میں آتی تھی اور اپنی گندم کے خمار میں لے جاتی تھی......

رات ذرا گہری ہوئی تو دریائے شمشال کی ہلکی سی آواز پتھروں کی دنیا میں سے سفر کرتی ہوئی ہم تک آنے لگی......

ہم سے دور...... شکر جوئی کے چولہوں میں آگ جلتی تھی' اس کی روشنی میٹھے پانی کے اوپر جو آسمان تھا اس کی تاریکی کم کرتی تھی۔

پتھروں کی اتنی بڑی دنیا میں کھوئے ہوئے الگ تھلگ...... دنیا کی تنہا ترین وادی کے راستے میں...... ہم تھے...... اور دھونی رمائے بیٹھے تھے...... اگرچہ ہمارے بدنوں کے بوجھ سے ریت کھسکتی جاتی تھی...... کہ ہم جوگی تھے......

اگرچہ جوگی ہمیشہ پہاڑوں سے اتر کر آتا ہے......

لیکن ہم وہ جوگی تھے۔ جو پہاڑوں پر جاتے تھے۔

ہم تو ملنگ لوگ تھے اور ہمارے نام پر شمشال پاس کی بلندی پر ایک چوٹی ملنگو دی نام کی تھی۔

چونکہ ہم جوگی تھے...... اس لیے درشن کو آئے تھے' زیارت کو آئے تھے...... بلکہ زیارت سے آگے یہاں شکر جوئی تک آئے تھے۔

میں نے رجب کو شکر جوئی کے راستے پر چلتے ہوئے جھاڑیوں میں سے یکدم نکل کر پھڑپھڑاتی ہوئی شے کے بارے میں بتایا۔

اور جونہی میں نے تذکرہ کیا تو رجب جیسا ٹھنڈا ٹھار...... کُول شخص...... یکدم ایک بچے کی طرح ایکسائٹ ہو گیا "صاحب آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا...... کتنا بڑا پرندہ تھا...... اس کے پر رنگین تھے...... مرغی کے سائز سے بڑا تھا......"

"میرا خیال ہے کہ چکور تھا...... اگرچہ اس لمحے وہ مجھے ایک عظیم گدھ کی طرح لگا تھا......"

"نہیں صاحب...... چکور اتنا بڑا نہیں ہوتا۔ اتنا بڑا تو صرف رام چکور ہوتا ہے...... ان دنوں اس کے انڈوں کا سیزن ہے...... میرا خیال ہے کہ وہ جھاڑیوں میں بیٹھا ہو گا...... ادھر تو

پورے سیزن میں چند ایک کوہ نورد آتے ہیں تو وہ اطمینان سے اپنے انڈوں پر بیٹھا ہو گا اور پھر آپ کے قدموں کی چاپ سن کر...... یکدم خوفزدہ ہو کر اڑ گیا ہو گا...... ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہو گا...... وہ مرغی کے موافق...... پھڑ پھڑا کر زیادہ دور تک نہیں اڑان کرتے...... ابھی ادھر انہی پتھروں میں بیٹھا ہو گا...... اسے تلاش کرتے ہیں صاحب......" رجب اتنا مغلوب ہوا کہ اٹھ کھڑا ہوا......

"رجب اگر وہ رام چکور ہے...... اور آپ اسے پکڑ لیتے ہیں تو کیا رات کے کھانے کے لیے اسے روسٹ کر لیں گے؟"

"نہیں صاحب......" رجب بہت دکھ سے بولا......

"تو پھر کیا کریں گے؟"

"اسے صرف اچھی طرح دیکھیں گے...... اور چھوڑ دیں گے...... ادھر رام چکور بہت کم رہ گیا ہے...... کم لوگوں نے اسے دیکھا ہے...... جو ادھر رہتے ہیں انہوں نے بھی نہیں دیکھا...... آپ نے دیکھا ہے تو بس آپ کا نصیب ہے......"

"آپ بیٹھ جائیں...... رام چکور کی تلاش صبح کریں گے رجب۔"

ندیم نے ایک سگریٹ سلگایا اور تادیر اس پر جھکا رہا...... اور پھر سر اٹھا کر تشویش ناک نظروں سے آس پاس دیکھا "سائیں ادھر پولیس تو نہیں ہے؟"

"نہیں......" میں نے اسے تسلی دی......

"مہربانی سائیں......" قصور اس کا نہ تھا...... کل پتو میں اتنی زیادہ پولیس آئی تھی کہ اسے یہاں بھی دھڑکا لگا ہوا تھا......

تنہا اور دور افتادہ...... میٹھے پانی کے تالاب کی خیمہ گاہ سے پرے...... پہلی تاریخوں کا بجھا ہوا چاند اور اور اس کے نیچے پھیلی پتھروں کی ایک کائنات...... ان میں سے ایک پتھر کے ساتھ میں ٹیک لگائے ہوئے...... اور میرے نیچے نرم دھنستی ہوئی ریت کی کشادگی...... بدن کے بوجھ کے سانچے میں ڈھل جانے والی پر سکون ریت۔

ہم چاروں اپنے پتھروں سے ٹیک لگائے بجھی ہوئی روشنی میں باتیں کرتے تھے۔

میں بار بار اُس مکر چاندنی کی بجھارت میں دکھائی دیتی اس عظیم دیوار کو دیکھتا تھا جس کی

جانب ہم نے کل چلنا تھا...... وہ تو راستہ روکے ہوئے لگتی تھی' لیکن اس کے درمیان میں ایک تنگ اور اونچی گزر گاہ تھی...... ایک چھوٹا سا درہ تھا اور گمان گزرتا تھا کہ ابھی ایک سلائیڈنگ ڈور کی طرح دیوار کے دونوں حصے آپس میں جُڑ جائیں گے اور کل ہم شمشال نہ جا سکیں گے...... بس گمان گزرتا تھا......

''بالکل اسی جگہ پر جہاں ہم بیٹھے ہیں ایک فرانسیسی سیاح نے اپنے خیمے کے پس منظر میں اس دیوار کی ایک تصویر اتاری تھی جسے فرانس میں انعام ملا تھا...... لوگ یقین نہیں کرتے تھے کہ کوئی ایسا مقام بھی ہو سکتا ہے......''

''لیکن سائیں میں یقین کرتا ہوں ناں......'' ندیم نے اپنے سگریٹ پر سے سر اٹھایا ''مقام تو یہ ہے ناں......''

''تم پتہ نہیں کس مقام پر ہو......'' میں نے ہنس کر کہا۔

''سائیں آپ چینی گندم کی خوشہ چینی کریں اور ملنگوں کو تنگ نہ کریں......''

قدرت' رجب کو انکل کہتا تھا......

انکل جو ابھی تک ایک کمپیوٹر کی مانند حرکت کرتے رہے تھے...... سیے تُلے قدم اٹھاتے تھے' میرا ہاتھ تھامتے تھے تو ان کی گرفت میں آہنی عناصر شامل ہوتے تھے' کم بولتے تھے' بہت ٹھنڈے اور میٹر آف فیکٹ تھے...... آہستہ آہستہ رواں ہو گئے اور اپنی نوجوانی کے قصے سنانے لگے...... اور شمال کے لوگوں کی نوجوانی کے قصوں میں عشق کا اتنا عمل دخل نہیں ہوتا جتنا جنگلی جانوروں کا...... وہ کسی محبوب کی نسبت ایک مارخور یا سرخ بھیڑیے کے تذکرے کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں......

''صاحب ایک سُرخ بھیڑیا ہمارے مویشی کھاتا تھا' اوپر چراگاہ میں...... ہمیں پتہ نہیں تھا کہ اسے کس طریقے سے روکیں...... کیسے پکڑیں...... سرخ بھیڑیا بہت خونخوار ہوتا ہے صاحب...... انسان سامنے آجائے تو اسے بھی بھیڑ بکری کی طرح چیر پھاڑ دیتا ہے...... تو ہم شمشالیوں نے کرغیز لوگوں کو یہ مسئلہ بتایا تو انہوں نے ایک طریقہ سکھایا...... آپ یوں سمجھو کہ جیسے ایک چوہادان بناتے ہیں چوہا پکڑنے کو...... ایسے ہم نے ایک بہت بڑا بھیڑیادان بنایا...... یعنی پتھر کا چھوٹا سا کمرہ بنایا...... اس کا چھت بنایا...... پھر چھت میں ایک سوراخ کے

راستے گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا کمرے کے درمیان میں لٹکایا...... رات کو بھیڑیا آیا تو اسے گوشت کا بُو آیا...... وہ بہت دیر تک کمرے کے گرد گھومتا اور غراتا رہا...... پھر وہ کمرے میں داخل ہوا اور گوشت کو منہ مارا...... تو گوشت کے ساتھ جو رسی تھا اس کے آخر میں ہم نے ایک بڑا پتھر باندھا ہوا تھا...... وہ دروازے کے آگے گر گیا اور بھیڑیا کمرے میں بند ہو گیا......''

''بھیڑیا......'' ندیم چونک گیا۔ ''سائیں کدھر ہے......''

''ادھر نہیں ہے......'' قدرت نے اسے تسلی دی۔ ''انکل شمشال پاس کی بات کر رہے ہیں......''

''پھر کیا ہوا؟'' میں اپنے گھٹنوں پر بازو جمائے ان پر ٹھوڑی ٹکائے بے حد دلچسپی سے رجب کی بھیڑیا داستان سن رہا تھا......

''پھر صاحب' میں آج تک شرمندہ ہوں' لیکن مجبوری کی بات ہے...... میں نے بھیڑیے کو لکڑی سے ہلاک کر ڈالا...... اس کی آنکھ کا نشانہ لگا کر پہلے اسے اندھا کر دیا پھر مار دیا۔ مجھے آج تک افسوس ہے کہ اتنا خوبصورت جانور تھا...... سرخ رنگ میں رنگا ہوا اور بہت نرم اور گھنی کھال والا...... لیکن میں کیا کرتا...... اسے چھوڑتے تو وہ ہمارے مال مویشی نہ چھوڑتا......''

''آپ نے کبھی سنو ٹائیگر بھی دیکھا رجب......''

''بھتیجے......'' رجب نے شاید میرا سوال سنا نہیں...... قدرت سے مخاطب ہو گیا ''میں ماؤنٹ ایوریسٹ کی مہم کے ہمراہ تبت گیا تھا...... لیکن ادھر تو چینی گندم کے پانی کا یہ ذائقہ نہ تھا......''

''تبت......'' ندیم نے نہایت آہستگی سے سر اٹھایا ''سائیں تبت کی کیا بات ہے...... وہاں جو لامے رہتے ہیں ان کی کیا بات ہے...... سائیں تبت نہ چلیں......''

''ہاں ادھر سے شمشال پاس کے راستے نکل جاتے ہیں' شارٹ کٹ رہے گا۔''

''سائیں آپ تبت میں ہیں...... میرا مطلب ہے تبت کیا کرنے گئے تھے؟''

''ماؤنٹ ایوریسٹ کی پاکستانی مہم نیپال کی جانب سے نہیں چین کی جانب سے اس پر چڑھنے گئی تھی......''

"اور تبت سائیں......"

"تبت چین کا حصہ ہے ناں صاحب......"

"وہ سنو ٹائیگر رجب......" میں نے سوال دوہرایا......

اس سے پیشتر کہ رجب کچھ کہتا ندیم پھر رواں ہو گیا۔ "سنو ٹائیگر سائیں تارڑ نے دیکھے تھے ناں سوختر آباد ہیں...... جلتی آنکھوں والے نیلے پیلے سنو ٹائیگر...... جو پامیر سے اتر کر آئے تھے اور دور کھڑے ہو کر انہیں گھورتے تھے...... کل کتنے سنو ٹائیگر تھے سائیں؟"

"وہ تو ایک فینٹسی تھی سائیں...... کیا پتہ وہاں سنو ٹائیگر تھے بھی یا نہیں...... ہم لوگ تو تخیل میں اڑان کرتے ہیں اور یہ لوگ...... حقیقت کی سرزمینوں کے باسی ہیں...... جی تو رجب، سنو ٹائیگر......"

"بس ایک بار دیکھا تھا صاحب...... اور یہ بھی شمشال پاس کا قصہ ہے۔ رات کا وقت تھا۔ میں چراگاہ میں بیٹھا تھا۔ آگ جل رہی تھی اور درے کے اوپر چاند پورا نکلا ہوا تھا...... کوئی آواز آئی...... صاحب ہماری وادی سے اوپر...... کئی دنوں کی مسافت پر جو ہماری چراگاہیں ہیں وہاں جتنی بھی آوازیں ہوتی ہیں...... تیز ہواؤں کی...... برف پگھلنے کی...... پتھر وغیرہ گرنے کی...... تو ان سے ہم بہت واقف ہوتے ہیں...... تو ان کے علاوہ اگر کوئی نامانوس آواز آئے تو ہم چوکنے ہو جاتے ہیں...... تو میں وہ آواز سن کر الاؤ سے الگ ہو کر اٹھا اور آگ کی روشنی جہاں تک جاتی تھی وہاں سے ذرا آگے گیا...... میں نے بولا ہے ناں کہ چاندنی کا سماں تھا تو وہاں دیکھا تو...... وہ بالکل سامنے بیٹھا تھا...... اور بہت اطمینان سے ایسے بیٹھا تھا جیسے اپنی برفانی تنہائی سے تنگ آ کر نیچے چراگاہ میں ہم سے ملنے آیا ہو...... ہمیں دیکھنے آیا ہو...... اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا، وہیں بیٹھا مجھے دیکھتا رہا...... اور صاحب چاندنی بھی سفید تھا اور وہ بھی سفید تھا جیسے اس میں نہا کر نکلا ہو...... میرے ہاتھ میں بندوق تھی...... میں اسے ہلاک کر سکتا تھا لیکن وہ ہمیں مارنے کی نیت سے نہیں آیا تھا اس لیے میں نے صرف ہوائی فائر کیا اور وہ یکدم گھبرا کر اٹھا اور ایک لمبی چھلانگ مار کر چراگاہ کے ایک کوٹھے پر جا بیٹھا...... وہاں بھی وہ آرام سے بیٹھا رہا جیسے کہتا ہو کہ مجھے بیٹھا رہنے دو میں تمہیں کیا کہتا ہوں...... لیکن تارڑ صاحب یہ تو بہت مشکل ہے کہ جس کوٹھڑی میں آپ کو سونا ہے ادھر اس کی چھت پر ایک

سنو ٹائیگر بیٹھا ہو، اس لیے میں نے ایک اور فائر کیا اور کچھ شور وغل کیا تو وہ ذرا مایوس ہو کر چھلانگ مار کر چراگاہ میں آیا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا اوپر شمشال پاس میں چلا گیا...... بس ایک بار ہی دیکھا تھا......"

بقاء نیم اندھیرے میں چلتا آرہا تھا...... اسے نہیں معلوم تھا کہ ہم کدھر ہیں...... وہ ہر دو قدم کے بعد کسی ایک پتھر کے قریب رک کر اُسے غور سے دیکھتا کہ شاید ہم میں سے کوئی ساکت بیٹھا ہے اور پھر ایک نامعلوم سا قہقہہ لگا کر چلتا ہوا آرہا تھا۔ ہمارے قریب پہنچا تو سرگوشی میں بولا "اوئے تم بھی پتھر ہو کہ بندے ہو......"

"ہم تو سائیں پتھر ہیں......" ندیم یکدم بول اٹھا اور بقاء کچھ ڈر گیا "اوئے آہستہ بول جانگلوس...... تراہ ہی نکال دیا ہے......"

"آؤ آؤ بقاء بھائی......" ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ "سائیں اپنے سرائیکی بھرا کے پاس بھی تو بیٹھو ناں...... کس پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھو گے؟......"

"آپ کتنی دیر میں آئیں گے تارڑ صاحب......"

"کیوں؟"

"یہ سرائیکی بھرا ادھر ہانڈی روٹی کا بندوبست کر رہا ہے...... سالن تیار ہے، دیسی گھی کا تڑکا لگا دوں؟"

"ابھی ادھر بیٹھو سائیں...... ادھر پہلے سُرخ بھیڑیا آیا...... پھر سنو ٹائیگر آیا...... اب تم آگئے ہو...... بیٹھو ناں...... رجب انکل موڈ میں ہیں اور قصے سناتے ہیں......"

"رجب انکل آپ تارڑ صاحب کو کاسون کا قصہ سنائیں۔" قدرت کہنے لگا۔

"نہیں......" رجب ریت پر انگلیاں پھیرتا جانے کیا حساب کتاب کر رہا تھا۔ "شاید تارڑ صاحب بھی یقین نہ کریں......"

"میں یقین کروں گا ناں......" ندیم کھڑا ہوا اور فوراً بیٹھ گیا......

"یقین تو مجھے میٹھے پانی کے تالاب کی اس رات کا بھی نہیں آرہا...... بالآخر وادیٔ شمشال کی جانب سفر کرنے کا بھی نہیں آتا...... لیکن یہ سب کچھ ہے...... میں دنیا کی تنہاترین جگہ سے خوشی حاصل کرنے جارہا ہوں۔ یہ بھی میرے یقین میں نہیں

آتا...... تو یقین کی بات چھوڑیں رجب آپ ہمیں قارون کا قصہ سنائیں۔"

"قارون نہیں...... قاسون......" قدرت نے فوراً کہا۔

"قارون حضرت موسیٰ کے بھائی تھے سائیں......" ندیم نے سر اٹھا کر اطلاع دی "یا شاید ان کا نام ہارون تھا لیکن ان کے خزانے بہت بڑے تھے۔"

"قارون......" قدرت مسکرانے لگا "آپ نے دیکھ لیا ناں کہ کوہ قارون کتنا بڑا ہے...... راستہ نہ ختم ہونے والا...... بلندیاں عرش تک...... تو شاید اس کی وسعت کے باعث اسے قارون کہا گیا کہ اس کے پاس برفوں اور بلندیوں کے بے بہا خزانے ہیں......"

"ہاں تو یہ کاسون کا کیا قصہ ہے رجب؟"

رجب اپنی ہر داستان پر قدرے شرمندہ سا ہوتا تھا...... اسے فخر سے نہیں انکساری سے بیان کرتا تھا...... متاثر کرنے کے لیے نہیں اطلاع کرنے کے لیے سناتا تھا۔

"آپ جانتے ہو کہ شمشال کے لوگ مئی کے مہینے میں اپنے مال مویشی اور یاک وغیرہ ہانک کر اوپر تین دن کی مسافت پر واقع شمشال پاس میں اپنی چراگاہوں کو چلے جاتے ہیں اور پھر اکتوبر میں لوٹتے ہیں۔"

"برباد تھی گئے سائیں......" ندیم کی مونچھیں مگر چاندنی میں بھی تیر ہوتی نظر آئیں۔

"تو ہم شمشال پہنچیں گے تو وہاں کوئی بندہ بشر نہیں ہو گا......"

"نہیں...... سب لوگ تو نہیں جاتے۔" رجب چپکے سے ہنسا "کھیتوں کی دیکھ بھال اور گھروں کی نگرانی کے لیے پیچھے بھی رہتے ہیں...... تو کوئی پندرہ برس پہلے میں اوپر چراگاہ میں تھا...... ہم لوگ ایک مویشی خانہ بنا رہے تھے...... قریب ہی ایک دریا بہتا تھا جس کا نام ذرسنک ہے...... تو کسی نے دیکھا کہ اس کے دوسرے کنارے پر کوئی جانور حرکت کرتا ہے...... ایسا عجب جانور ہے کہ ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... ہم سرخ بھیڑیے...... چیتے...... جنگلی گدھے یا مارکو پولو شیپ وغیرہ سے تو واقف تھے لیکن یہ کچھ اور ہی تھا...... وہ لومڑی سے ذرا بڑے سائز کا تھا اور حیرت انگیز طور پر اس کے بال سبز رنگ کے تھے...... سبز رنگ کی کھال والا جانور تو ہمارے دادا امون سنگھ کے زمانے میں بھی نہ تھا۔ سب لوگ گھبرا گئے...... بندوق لے کر ادھر گئے لیکن ان میں فائر کرنے کو جرأت نہ تھا کہ پتہ نہیں جواب میں یہ جانور

کیا کرے...... وہ رک گئے لیکن میں اس کی طرف بڑھتا گیا...... وہ دریا کے پار تھا...... میں پانی کو کراس کرنے لگا...... ابھی کنارے پر پاؤں رکھتا تھا تو وہ اچانک مجھ پر حملہ آور ہو گیا ہے...... میرے پاس بندوق نہ تھا...... میں نے دو بڑا پتھر اٹھا کر اسے مارا ہے...... لیکن وہ اچھل کر میرے اوپر آگیا اور میری چھاتی پر اپنا پنجہ جما دیا ہے اور اپنا دانت اتار دیا ہے...... میں نے بہت تکلیف میں اور خوفزدہ ہو کر اسے دونوں ہاتھوں سے پرے پھینکا ہے تو وہ پھر آگیا ہے اور میرا ٹانگ کو پکڑ لیا ہے...... اور اس کو کسی صورت نہیں چھوڑتا...... میں نے دیکھا کہ اس کا دُم بہت لمبا ہے...... میں نے اس کا دُم پکڑ کر اپنے ہاتھ میں لپیٹا ہے جیسے سانپ کو لپیٹتے ہیں اور اسے بہت زور سے کھینچا ہے...... اس نے تکلیف محسوس کیا تو میرا ٹانگ چھوڑ دیا...... میں اسے دُم سے گھسیٹتا ہوا دریا میں گھسیٹتا چراگاہ تک لے آیا اور شور مچایا کہ اسے پکڑ لو...... کسی نے بھی آگے بڑھ کر اسے نہیں پکڑا' کیونکہ وہ عجیب شکل کا تھا اور سب لوگ ڈرتا تھا...... پھر میں نے اس کے گلے میں رسی ڈال کر اس کو مار دیا...... اس کا سبز کھال نیچے وادی میں اپنے گھر میں لے آیا...... اس زمانے میں ہنزہ کا میر جمال وادی میں آیا تو سب شمشالی اسے تحفہ دیتے تھے' تو میں نے اس جانور کا سبز کھال میر کو پیش کر دیا...... کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ کیا ہے...... پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ اس جانور کو کاسون کہتے ہیں' پانی میں اور خشکی میں رہتا ہے...... کچھ اور بوڑھے لوگ تھے جو بولتے تھے اسے سگابی کہتے ہیں...... کسی نے دیکھا نہیں سنا ہے کہ ایک سگابی ہوتا ہے جو سبز رنگ کا ہوتا ہے اور خشکی اور پانی میں یکساں رہتا ہے......"

"کیا کبھی کسی اور شخص نے بھی کبھی اس جانور کو دیکھا؟"

"دولت امین کا کہنا ہے کہ اس نے ایک بار اسے دور سے دیکھا تھا...... اور کسی نے آج تک نہیں دیکھا......"

اگر کوئی اور شخص ایسا قصہ بیان کرتا تو شاید میں اسے فرضی سمجھتا...... لیکن رجب اور طرح کا شخص تھا...... جیسے کوئی محیر العقول قصہ بیان کیا جائے تو آپ یہ دیکھتے ہیں اسے بیان کون کر رہا ہے اور اگر وہ شخص کھرا ہو تو اس بظاہر ناممکن قصے پر بھی انسان ایمان لے آتا ہے......

یہ ایک عرصے کے بعد ویرانے میں میری پہلی شب تھی۔

جیسے ایک جانور کو چڑیا گھر کے پنجرے سے نکال کر اس کے قدرتی ماحول میں ایک شب گزارنے کی اجازت دی جائے تو جو وہ محسوس کرتا ہے وہی کیفیت میری تھی۔

یہ دیوسائی کے بڑے پانیوں کے کنارے سے خیمہ زن ہونے کے بعد پچھلے دو برس میں پہلی شب تھی جب میں تہذیب کے چڑیا گھر سے دور...... اپنے قدرتی ماحول میں سانس لیتا تھا۔

میں...... میٹھے پانی کے تالاب کی خیمہ گاہ سے ذرا فاصلے پر پتھروں کی ایک دنیا میں اپنے تخت طاؤس پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا بجھتی چاندنی میں اس فصیل کو تکتا تھا جس کے درمیان میں ایک دراڑ سی تھی جس میں سے دریائے شمشال گزرتا تھا اور کل مجھے بھی گزرنا تھا......

شکر جوئی کے پڑاؤ میں جو چولہے جلتے تھے وہ راکھ ہونے کو تھے...... مگر چاندنی میں سرخ بھیڑیے...... سنو ٹائیگر اور کاسون کے قصے ٹھہرے ہوئے تھے......

"رچھ دشت اور زرد فصیلیں"

اگلی سویر شکر جوئی سے ہم نکلے تو خوش نہ تھے' رنجیدہ اور دل گرفتہ نکلے......

ابھی اس کے میٹھے پانیوں کی سرد ندیوں سے ہماری جان پہچان کا آغاز ہوا تھا کہ ہم نکل آئے......

کوروفون اور بیانتھا کی مانند یہ ایک ایسی خیمہ گاہ تھی جو ایک پڑاؤ نہیں ایک منزل ہونی چاہیے تھی۔ اگر ویران راستوں اور موت ڈھلوانوں میں سے بچتے گرتے پڑتے ایک ایسی جگہ پر پہنچ جائیں جہاں کبڑے درختوں اور جھاڑیوں میں برفانی ندیوں کے ترل رل نغمے سرسراتے ہوں' ریت کے مختصر مختصر جزیرے ہوں اور آپ کے پاس خوراک کے خیمے ہوں اور ان میں بچھے نرم سلیپنگ بیگ ہوں تو وہاں صرف رات گزار کر آگے نکل جانا کفرانِ نعمت نہیں تو اور کیا ہے۔

رجب اور پورٹر رات گزارنے کے لیے زیارت کے کمروں سے بستر' گدے اور کھانا پکانے کے برتن اٹھا لائے تھے...... انہوں نے اس سامان کو سمیٹا اور ایک بڑے پتھر کے نیچے سٹور کر دیا......

"آپ اس سامان کو زیارت رکھ کر نہیں آئیں گے؟"

"نہیں...... اوپر شمشال سے جو مسافر آئیں گے وہ اس سامان کو اٹھا کر زیارت لے جائیں گے...... ہمیں واپس جانے کی ضرورت نہیں۔"

"اور...... یہ یہاں محفوظ ہے؟"

"بالکل...... ان راستوں پر شمشال والوں کے سوا اور کون چلتا ہے...... اور صدیوں سے

یہ رواج چلا آتا ہے کہ ہم وادی سے نیچے آئیں تو راستے میں جو سامان ہوگا اسے بوجھ کر کے اگلی منزل پر پہنچادیں گے......"

شکر جوئی سے نکلنے پر کچھ راستہ تو اس متوقع جیپ روڈ پر تھا' جس پر ابھی ریت تھی' پتھر تھے اور کہیں کہیں پانی بہتے تھے اور دونوں جانب پتھروں کی حد بندی تھی...... پھر ہم اس سے الگ ہو کر ذرا اوپر گئے اور نیچے گئے تو پرک جریخت کا بڑا نالہ پورے زور و شور سے اترتا آتا تھا اور ہمارے راستے میں حائل ہوتا تھا......

مجھے قطعی طور پر اطلاع نہ تھی کہ شمشال کے راستے میں اس قسم کے نالے بھی پڑتے ہیں......

"جی رجب انکل......" ہم رُک گئے۔ "یہ کیا ہے؟"

"صاحب یہ پرک جریخت نالہ ہے اور اسے ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر پار کرتے تھے......

اس کا مطلب ہے جہاں چوہا بھی پھنس جاتا ہے......"

"تو رجب شاہ ہم چوہے ہیں اور پھنس گئے ہیں......"

"تین چوہے...... گھر سے نکلے اور کرنے چلے شکار......"

لیکن ان تین چوہوں میں سے دو کو قربان اور بیگ اپنی پشت پر لاد کر پار لے گئے......

مجھے اور بقاء کو اس انسانی سواری کی عادت تھی' لیکن جانگلوس جھجک رہا تھا...... "سائیں انسان پر کیسے سواری کروں؟"

"تو سائیں آپ ادھر ٹھہرو' ہم شمشال ہو کر آتے ہیں......"

"سواری کروں سائیں......" وہ فوراً آمادہ ہو گیا......

اگرچہ اس نالے میں بھی "گھوڑے" کے پھسلنے سے سوار اور گھوڑا دونوں دریائے شمشال کے دھارے میں شامل ہو کر نیچے پسو کے پاس دریائے خنجراب سے ادھر کہیں نہیں ابھرتے تھے' لیکن یہ نالہ ورگوتھ کی ندیوں کی طرح موت کا دعوت نامہ نہ تھا...... اسے نسبتاً آسانی سے پار کیا جاسکتا تھا......

چکورین سریک پھر دکھائی دینے لگی......

یہاں سے عظیم گلیشیر ملونگے دی سر کی بھی ایک جھلک نظر آئی......

اور پھر پوری وادی کو دو حصوں میں بانٹتی وہ عظیم دیوار قریب آنے لگی جس کی دہشت شکر جوئی کی بجھی ہوئی چاندنی میں نظر آتی تھی۔ ہم اس کی طرف بڑھتے چلے جاتے تھے' لیکن ہمیں یقین نہ تھا کہ ہم اس کے درمیان میں جو معمولی سا شگاف ہے اس میں سے گزر کر دوسری جانب چلے جائیں گے۔

ہم دیوار کے سائے میں ہوئے......

ذرا نیچے اتر کر دریائے شمشال کے کناروں پر آئے۔

دریا سمٹ کر اس فصیل کی رکاوٹ میں دکھائی دیتے درّے کے درمیان میں سے گزر رہا تھا۔ ہم بھی ذرا سمٹ کر دریا کے کنارے جو پتھر بھیگتے تھے اور گیلی ریت دیوار سے بھرتی تھی اس پر قدم جماتے۔ اپنے چہروں پر پُر شور پانیوں کے جھاگ نما چھینٹوں کو وصول کرتے چلتے گئے۔ ہم ذرا اطمینان سے چلتے تھے' دیکھ بھال کر نہیں چلتے تھے جب رجب نے ہمیں وارننگ دی' ادھر لوگ لاپرواہ ہو جاتے ہیں۔ پرواہ کرنی چاہئے' کیونکہ اگر آپ پھسلتے ہیں اور ادھر کنارے تک جو تھوڑے سے پانی آتے ہیں' ان میں گرتے ہیں تو وہ آپ کو اٹھنے نہیں دیں گے' لے جائیں گے اس لیے پرواہ کرو صاحب۔"

تو صاحب پرواہ کرنے لگے۔

ہم جب دریا کے کناروں سے اٹھ کر اوپر آتے ہیں' اس فصیل کے پار ہوتے ہیں تو وہاں ایک اور میدان تھا۔ بڑے بڑے پتھر' ریت اور جھاڑیاں اور دائیں جانب ایک بلند دیوار کے اوپر ملونگے دی سر گلیشیر رُوپوش!

اس وسعت میں دریائے شمشال ہم سے پرے ہو کر پھیل گیا اور ہم ریتلے راستے میں سے پاؤں کھینچتے چلتے جاتے تھے۔

اس میدان کا نام رچھ دشت تھا...... گھاس کا صحرا۔

یہاں گھاس تو کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی' البتہ دشت کی ویرانی بہت تھی۔

جب میں شکر جوئی کی ندیاں دیکھ کر بے تاب ہوا تھا کہ ان میں فوراً ڈبکیاں لگائی جائیں تو رجب نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ "ادھر کا پانی صرف پینے کے لیے ہے' نہانے کے لیے نہیں ہے۔ ہم شمشالی بھی ادھر نہیں نہاتے۔ بہت برا پانی ہے' ٹھنڈا ہے' بیمار کر دیتا ہے۔ کل

دوپہر تک ہم گرم چشمہ کے مقام پر پہنچے گا تو ادھر جو پانی ہے وہ نہانے کے لیے اچھا ہے۔"

چنانچہ شکر جوئی سے کوچ کرتے ہی سوال جواب شروع ہو گیا تھا کہ رجب گرم چشمہ کب اور کتنی دیر میں آئے گا۔

یہ سوال پھر دوہرایا گیا۔

"صاحب ابھی اس رچھ دشت کو پار کرے گا' پھر ایک پل آئے گا' بہت اونچی چٹانوں کے دامن میں' وہاں سے ہم دائیں جانب جائے گا' دریا کے ساتھ اور پھر گرم چشمہ آئے گا۔"

"اور اس کے بعد کیا آئے گا؟"

"اس کے بعد تھوڑا چڑھائی آئے گا' سخت ہو گا اور پھر نیچے اترے گا تو میرا گھر آ جائے گا۔"

"یعنی شمشال آ جائے گا؟"

"نہیں...... میرا گھر وادی کے شروع میں ہے۔ ادھر سے چھ کلو میٹر چلے گا تو پھر سنٹرل شمشال آئے گا جہاں آپ نے پہنچنا ہے۔ لیکن ابھی گرم چشمہ پہنچ کر آپ نہائے گا تو تازہ دم ہو جائے گا۔"

"ادھر پانی بہت گرم تو نہیں؟" میرے ذہن میں چترال کے قصبے گرم چشمہ کے ابلتے ہوئے پانی تھے۔ فیئری میڈو کے دامن میں تتو گاؤں کے بہت ہی تپتے پانی تھے' جن میں آلو ڈال کر ابالے جاتے تھے۔ اور درہ درکوت سے اتر کر روات کی وادی کے بہت گرم انگلیوں کو جھلسا دینے والے پانی تھے۔

"نہیں صاحب اتنا گرم نہیں ہے۔"

میں ایک عرصے کے بعد ایک سخت ٹریک پر چل رہا تھا۔ کل کا دن تو بہت ہی پر صعوبت تھا۔ شاید "سنو لیک" کے بعد پہلی مرتبہ...... اگرچہ میں اس دوران درّہ برجی لاء سے واپسی پر دیوسائی کی ایک رات میں تھکاوٹ اور بدن کو توڑ کر رکھ دینے والی ناقابل برداشت اذیت سے آشنا ہو چکا تھا...... لیکن یہ زندگی کا ٹریک بھی تو اتنا آسان نہیں۔ عمر کی مسافت بھی عجیب مسافت ہے۔ عمر کا ہر برس گزرنے سے' کیلنڈر کا ہر ورق الٹنے سے' ہر

نئے برس کی آمد پر...... میرے بال و پَر میں سے کوئی ایک پَر بوسیدہ ہو کر جھڑ جاتا تھا کہ یہی قانون قدرت ہے۔ کوئی ایک پَر اپنی طبعی عمر پوری کر کے سفید اور ناکارہ ہو کر جھڑ جاتا تھا...... اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی پرواز میں کوتاہی آتی جاتی تھی اور اس کے باوجود کل اور آج میں کہیں بھی لاچار نہیں ہوا تھا...... ٹوٹ کر گرا نہیں تھا...... اگرچہ سب سے سُست رو اور دھیما تھا...... لیکن قدم تو خود اٹھاتا تھا...... سہارتا تھا تو اپنے آپ کو سہارتا تھا...... اس لیے مجھ میں ایک پُر مسرّت اعتماد تھا کہ ابھی میرے لیے کوہ نوردیوں کے کچھ دن باقی ہیں۔

ویسے تھکا ہوا تو میں بہت تھا۔

پاؤں گھسیٹتا تھا...... ہر قدم پر ستانے کی آرزو کرتا تھا لیکن...... چلتا جاتا تھا اور بہت خوش تھا...... ایک وسیع وادی میں...... ایک ہموار دشت میں' چلتا جاتا تھا۔

یہاں ہمیں ایک مرتبہ پھر اس علاقے کے سب سے عالی شان گلیشیئر ملونگودی کے سفید آثار دائیں جانب کی چٹانی فصیل کے اوپر سے جھانکتے دکھائی دینے لگے۔

یہاں سے...... ایک راستہ شمشال کو جاتا تھا۔

یہاں سے اس فصیل پر چڑھ کر کچھ آشفتہ سر گلیشیئر تک پہنچتے تھے اور پھر اس کی برفوں اور دراڑوں پر سے سفر کرتے شمشال میں اتر جاتے تھے۔

لیکن ہم آشفتہ سر تو تھے لیکن اتنے نہ تھے۔

اور ہم اتنی شتابی میں بھی نہ تھے۔

ہم معمول کے راستے سے الگ ہو کر کسی برفانی جھنجٹ میں مبتلا نہیں ہونا چاہتے تھے۔

اُسی راستے پر چلتے رہے جس پر شمشالی چلتے تھے......

رچھ دشت اختتام کو پہنچ رہا تھا......

اور اختتام پر زرد رنگت کی ایسی چٹانیں تھیں' جن کی بلندی ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھی اور وہ آسمان پر بھی قابض ہوتی تھیں......

یہیں پر ہم دریائے شمشال کے قرابت دار ہوتے گئے...... اس کے نزدیک ہوتے گئے......

تب ہم نے ان زرد رنگت کے عظیم الشان چٹانی معبدوں...... فلک کو خراشتی ہوئی

بلندیوں...... جہاں یہ وادی پہنچتی تھی اور ان کو سامنے پا کر رک جاتی تھی' اپنے اختتام کو پہنچ جاتی تھی...... اور وہ چٹانیں جو اس کا راستہ روکتی تھیں کسی بھی کے ٹو یا ایورسٹ سے زیادہ بلند دکھائی دیتی تھیں...... زیادہ ناقابل عبور دکھائی دیتی تھیں...... وہاں ان کے دامن میں...... جہاں دریائے شمشال سمت کراں میں گم ہوتا لگتا تھا وہاں ہم نے...... ایک درّے کے دہانے پر...... زیادہ سے زیادہ دو انچ کی لمبائی کا ایک کھلونا سا پل دیکھا...... جہاں ہم تھے وہاں سے وہ اسی سائز کا نظر آتا تھا...... بلکہ نظر بھی نہیں آتا تھا...... وہ کبھی بہت غور کرنے سے دکھائی دے جاتا تھا اور پھر اپنے اوپر اٹھتی ہوئی آسمانی چٹانوں کے انبار میں گم ہو جاتا تھا...... ہم اپنے آپ کو یقین دلاتے تھے کہ نہیں ابھی ہم نے وہاں کچھ دیکھا ہے جو ایک پُل لگتا تھا اور ذرا آنکھیں میچ کر غور کرو تو پھر دکھائی دے جائے گا...... وہ اس چٹانی حجم میں اتنا بے توقیر اور مختصر تھا...... جیسے کسی مغل منی ایچر تصویر میں شکار کے منظر میں کسی درباری کے گلے کے ہار کا ایک موتی!......

میں نے اس کبھی نظر آتے اور کبھی چٹانوں میں مدغم ہو کر آنکھوں سے کھو جانے والے پل کو اس لیے اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ شمشال کے راستے کا سب سے پرکشش اور دیومالائی بے یقینی کا پل تھا......

ہم ایک مدت تک اس کی جانب سفر کرتے رہے......

اور اس کا حجم بڑھتا گیا......

لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ زرد چٹانیں بھی مزید بلند ہو کر ہمارے وجود کو مختصر اور بے توقیر کرتی گئیں......

ہم سر اٹھا کر دیکھتے تو وہاں ان چٹانی بلندیوں والے معبدوں' مندروں کے سوا اور کچھ بھی نظر نہ آتے......

ہم قریب ہوئے......

"ایک الف لیلوی پُل...... عبدل محمد پُل"

پھر راستہ ختم ہوا...... اور ہم چٹانوں پر چڑھتے ہوئے...... ہانپتے ہوئے اس کے قریب ہوئے...... پہلے تو وہ چٹانوں کی اوٹ میں تھا اور پھر یکدم سامنے آ گیا......

عبدل محمد پل......

ایک ایسا پل...... جو حقیقت میں نہیں...... صرف کارٹون فلموں میں ہی تخلیق ہو سکتا ہے...... الف لیلیٰ کا کوئی شہزادہ...... جان جوکھوں میں ڈال کر بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے جہاں ایک چٹانی محل کے اوپر وہ شہزادی قید ہے جسے وہ حاصل کرنے کے لیے یہاں تک پہنچا ہے اور سامنے دیکھتا ہے تو وہاں ایک ناقابل عبور پل ہے...... ایک تنگ درے پر معلق...... دریائے شمشال غراتا ہوا اس کے نشیب میں کہیں بہتا ہے اور اس کے عقب میں ایک سیاہ غار ہے۔

یہی عبدل محمد پل تھا...... ایسا پل جو وادیٔ شمشال کے راستے میں ہی ہو سکتا تھا...... کہیں اور ہوتا تو اس وادی کے باسی وہاں سکونت ترک کر کے کہیں اور جا آباد ہوتے......

لیکن میں اس پل سے خوفزدہ نہیں ہوا......

اس کے شاندار وجود کی ہیبت مجھ پر طاری ہو گئی......

اس کے طلسماتی منظر نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا......

اس کی کوئی تصویر...... کوئی بیان اس کے حیرت ناک وجود کو سامنے نہیں لا سکتا......

لیکن میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوا......

میں اسے مبہوت ہو کر دیکھتا رہا...... کہ کیا ایسا پل ممکن ہو سکتا ہے......

میرے ساتھی پار جا چکے تھے......

اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ میں خوف کی گرفت میں ہوں اس لیے اس پر قدم نہیں رکھتا......

لیکن ایسا نہیں تھا...... میں اس خوف کی گرفت میں تھا کہ میں پار چلا گیا تو اسے پہلی بار دیکھنے کا

طلسم ٹوٹ جائے گا۔ یہ ان پلوں میں سے کوئی ایک ہو جائے گا جسے میں نے اپنی کوہ نوردیوں کے دوران عبور کیا تھا۔

کل جو دو پل کراس کیے تھے' شیطانی راستے سے پرے ہونے کے لیے...... یہ بھی ان میں سے ایک ہو جائے گا......

لیکن جیسے ہر فیصلہ بالآخر کرنا پڑتا ہے......اس کے پار وصل ہو یا جدائی ہو......اسے میں نے اس عبدل محمد پل کو...... بلا جھجک...... یہ پرواہ کیے بغیر کہ جن تختوں پر میں قدم رکھتا ہوں ان کے درمیان فاصلہ بہت ہے......اور ان شگافوں میں سے دریائے شمشال کے پانی لپک لپک کر اوپر آتے ہیں......میں پار چلا گیا......

میں نے پار ہو کر کچھ دیر رک کر اس پہاڑوں کی تنہائی اور تنگ درے کی تنگنائی میں معلق......اس پل کی غیر یقینی کو دیکھا......کچھ دیر دیکھا پھر رجب شاہ کے پیچھے ان چٹانوں پر چڑھنے لگا جو یکدم سامنے آتی تھیں......وادی کے آگے دیوار بن کر کھڑی ہوتی تھیں......ہم دائیں ہاتھ پر چلنے لگے......

جس وادی میں ہم روڈ کیمپ کے بعد سفر کرتے تھے اس کا اختتام ہو گیا تھا اور ہم نے دائیں جانب رخ کر لیا تھا......

ان چٹانوں سے اترے تو ریت کا ایک مختصر جزیرہ آ گیا جس میں ہم اترے......اس کے کناروں پر چند غاریں تھیں جو چٹانوں کے اندر تک جاتی تھیں......

یہ وہ آماجگاہیں تھیں جہاں صدیوں سے مسافر رات کرتے تھے......ان کی پناہ میں رات کرتے تھے......

پھر اس ریتلے جزیرے سے اوپر اٹھے تو شکر جوئی کے بعد پہلی مرتبہ کچھ درختوں اور جھاڑیوں میں گئے اور ہمارے قدموں تلے جو ریت تھی اس میں کہیں کہیں پانی بھیگتا تھا۔

اس کے دوسری جانب گئے تو پھر چٹانیں راستے میں آ گئیں......

ابھی تک کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا......

اس مختصر سے ہریاول کے جزیرے کے آگے چٹانوں کے آگے ہوئے تو یکدم منظر کھل گیا......

"گرم چشمہ کے آبی چراغ"

منظر کھلا تو سامنے ایک زرد رنگ کی آسمانی چٹان کے عین نیچے سبزہ اور جھاڑیاں نظر نواز ہوئیں......

"گرم چشمہ ہے صاحب......"

"کہاں ہے"

"یہ سامنے ہے صاحب......"

اور سامنے شکر جوئی ایسا تو کچھ نہ تھا......ایک شفاف چٹانی بدن کے درمیان کچھ روئیدگی سی تھی جیسے مصوّر رافیل کی نیوڈز کے درمیان میں ہوتی ہے......

اور جب سامنے پہنچتے ہیں...... تو ایک پتھریلی اور دھوپ میں سفید ہوتی چٹانوں کی اونچائی کے قدموں میں ایک ہموار چھت کی بے روح سی کوٹھڑی ہے زیارت کی طرح......باہر ہمارے رُک سیک پتھروں سے ٹیک لگائے آرام کر رہے ہیں اور نیلے اور ڈرم اپنی گولائی پر براجمان دھوپ میں گرم ہوتے ہیں......اور کوئی ویرانی سی ویرانی ہے......البتہ ملونگودی گلیشیر کی سرمئی اور کہیں کہیں سے اپنا سفید بدن جھلکاتی دیوار اس ویرانی کے سامنے تھی اور اس پر سے چند برف پوش چوٹیاں ابھرتی تھیں......

بدن کی تھکاوٹ مجھے ڈھیر کرنے کو تھی......

میں نے اپنا چھوٹا رک سیک کندھے سے اتار کر ایک بڑے پتھر پر رکھ دیا اور رجب کی طرف دیکھا......مایوسی کے ساتھ...... کہ یہ ہے گرم چشمہ......

"چشمہ ادھر ہے صاحب......"

اور تب میں نے اُدھر دیکھا...... اور ادھر دیکھنے کیلئے بس بے جان سے پتھریلے کمرے سے چند قدم نیچے اتر کر...... ادھر دیکھنا شرط تھا......

تھکاوٹ کے باعث میں رجب کے نقش قدم پر قدم رکھتا سر جھکائے چلتا آیا تھا اور جب بالآخر سر اٹھا کر دیکھا تھا تو عین نیچے اس کمرے کی ویران موجودگی کو دیکھا تھا...... میں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ یہ کمرہ پہاڑوں کی کس تصویر کے کونسے کونے میں الگ تھلگ ہے اور بقیہ تصویر میں کیا کیا ہے......

عبدل محمد پل ایک طرح سے اس وسیع وادی کا اختتامی منظر تھا جو روڈ کیمپ سے شروع ہو کر زیارت اور شکر جوئی کی قیام گاہوں کو اپنے دامن میں چھپائے اس پل تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کے درمیان میں دریائے شمشال بہتا چلا جاتا تھا...... بلکہ یہ دریا بہتا چلا آتا تھا کیونکہ شمشال سے اتر کے نیچے آ رہا تھا...... پل پر سایہ فگن بلند چٹانیں گویا اس وادی کی آخری فصیلیں تھیں......

پل کے پار ہو کر ہم جو اب تک ناک کی سیدھ میں چلے تھے پہلی بار نوّے درجے کا اباؤٹ ٹرن کر کے دائیں جانب چلنے لگے اور دریا نظروں سے اوجھل ہو گیا......

گرم چشمہ کا پتھریلا کمرہ...... جس تصویر میں ہم داخل ہوئے اس کا ایک معمولی سا حصہ تھا......

تو جب رجب نے کہا کہ چشمہ اُدھر ہے صاحب...... اور تب میں نے اُدھر دیکھا اور اس کمرے سے آگے جا کر چند قدم نیچے اتر کر دیکھا...... تو میں نے دیکھا!

جس فلک بوس چٹان کے سائے میں وہ کوٹھڑی تھی اس سے چند قدم کے فاصلے پر اس عظیم چٹان کے اندر سے...... جس کی چوٹیاں اوپر دیکھنے سے دکھائی نہ دیتی تھیں...... اس چٹان کے اندر سے...... کہیں اندر سے بے شمار پانی ابلتے ہوئے برآمد ہو رہے ہیں...... ایسے جیسے سوڈا واٹر کی بوتل کا ڈھکنا یکدم اڑایا جائے تو اس میں سے جھاگ اڑاتے بے اختیار پانی چھینٹے اڑاتے آپ کے چہرے اور ہاتھوں کو بھگو دیتے ہیں...... یہ پانی ایسے اس چٹان کی کوکھ میں سے ابلتے ہوئے چلے آتے تھے...... اور وہاں سے نیچے جا رہے تھے...... اور نیچے یہ پانی ایک ایسی آبی فینٹسی کو جنم دے رہے تھے جو فیئری میڈو کے علاقے فنتوری سے مشابہ تھی......

یہ پانیوں مختصر آبشاروں' تالابوں اور گھنی گھاس اور جھاڑیوں ...... دیدہ زیب سفید پتھروں کے گرد بھنور بناتے سفید ٹھنڈے پانیوں اور ان کے کائی زدہ کناروں اور نرم سبزے کی ایک ایسی فینٹسی تھی جو فینٹسی کی حدوں کے بھی پار جاتی تھی...... پانی چٹان میں سے برآمد ہو کر نیچے ایک ہموار اور مختصر سے میدان میں اترتے تھے تو درجنوں چھوٹی چھوٹی ندیوں میں بٹتے چلے جاتے تھے اور آبشاروں کو اور تالابوں کو ...... اور سرکنڈوں میں مچلتے ہوئے آبی کنجوں کو جنم دیتے تھے...... صرف ایک پن چکی کی پتھریلی اور بند کوٹھڑی تھی جو ان کے بہاؤ کے تواتر کو روکتی تھی لیکن وہ کب رکتے تھے اسے گھیرے میں لے کر شور کرتے نیچے اتر جاتے تھے...... سرکنڈے' بیلیں اور گھاس ان آبشاروں اور ندیوں کے کناروں پر کہیں کہیں سر اٹھاتے تھے اور شُبہ ہوتا تھا کے وہاں ایک جاپانی باغ کی سجاوٹ کی طرح یہ خاص طور پر سجائے گئے ہیں......

میں ان پانیوں کو...... ان کی رمق دمک کو پارے سے تشبیہ نہیں دوں گا کیونکہ پارا بھاری اور مُردہ ہوتا ہے جب کہ یہ پانی زندہ تھے...... ان میں جان تھی...... یہ پانی زندگی کی تمامتر چلبلاہٹ اور بےخود کیفیت سے بھرے ہوئے تھے...... ان کی سرسراہٹ کانوں کو ایسے ہی بھلی لگتی تھی اور خون میں خمار بھرتی تھیں جیسے ننگے پاؤں کوٹھے پر آنا یاد ہے...... یا کسی چلمن کے عقب میں کسی عشق خاص کی سرگوشی...... وہ ایک سرگوشی جو پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے......

مجھے اس منظر کا بھی یقین نہیں آ رہا تھا......

اور ایسے موقعوں پر میرے خزاں رسیدہ چہرے پر پاگل پن کی وہی بےخود مسکراہٹ پھیلتی ہے...... جو کبھی وادئ روپل کے پھولوں میں...... کبھی سنولیک پر...... اور کبھی چھوٹے دیوسائی کی پہلی جھلک پر پھیلتی ہے...... اور مجھے رب کی ثنا کرنے پر مجبور کر دیتی ہے......

مجھے اس لئے یقین نہیں آ رہا تھا کیونکہ میرے تخیل میں شمشال ٹریک خشک اور پیاس بھری جان لیوا مسافتوں سے عبارت تھا...... زیارت کی ویرانی تو اس عبارت پر پوری اترتی تھی...... لیکن شکر جوئی نے...... میٹھے پانی کے اس تالاب نے مجھے ایک خوشگوار دھچکا سا دیا اور اب گرم چشمہ نے...... مجھے باقاعدہ ناک آؤٹ کر دیا تھا...... اور مجھے یقین نہ آتا تھا......

گرم چشمہ ...... شکر جوئی کو بھی نہ صرف ماند کرتا تھا بلکہ اس کے سجے ہوئے ماہتاب

کو بجھا دیتا تھا...... اور اپنے الگ آبی چراغ روشن کرتا تھا...... یہ آبی چراغ......

یہ ہر کنج میں...... ہر آبشار میں...... ہر تالاب میں جلتے تھے......

پورٹر اور میرے ساتھی سامان پتھروں کی اوٹ میں رکھ کر ان کی پشت سے ٹکا کر اُس بظاہر ویران آماجگاہ میں جا چکے تھے...... اور مجھے معلوم تھا کہ وہاں نوڈل سوپ کی تیاری کے لئے ایک دیگچہ چڑھا دیا گیا ہے اور قدرت اپنی کھنچی ہوئی منگول آنکھوں سے اس کی گرم بھاپ پر جھانک رہا ہے......

لیکن میں ابھی اس کمرے میں واپس نہیں جانے کا تھا......

ابھی تصویر مکمل نہیں ہوئی تھی......

مین نے ابھی گرم چشمہ کی اس تصویر کو جان بوجھ کر مکمل نہیں کیا تھا کیونکہ یہ عشق خاص کا وہ بدن تھا کہ جہاں بھی نظر کریں نظر وہیں ٹھہر جاتی تھی کے بس......

ایں جااست!

خشک چٹان کی کوکھ میں جنم لینے والے پانیوں کا یہ دھڑکتا پھڑکتا ابال نیچے...... ایک ہموار اگرچہ مختصر میدان میں اتر کر آبشاریں...... کنج...... اور تالاب بناتا تھا...... کناروں کی گھاس اور بیلوں کو دھکیلتا بہتا جاتا تھا اور میں اپنے ہی مخصوص خبط میں مبتلا تھا کہ اگر میں آج کی شب کے اترنے پر یہیں قیام کروں...... رجب سے کچھ مذاکرات کرلوں...... ابھی آگے جانے کی بجائے رات کیوں نہ بسر کرلیں اُس صورت میں...... میں اپنے خیمہ کہاں نصب کروں گا......

اور محبوب کے بدن کی طرح کوئی ایک مقام نہ تھا......

ہر جا...... ایں جااست!

وہاں کیسے کیسے چھوٹے چھوٹے ہریاول کے گھنے اور بھیگے ہوئے جزیرے تھے...... اتنے مختصر جو صرف ایک خیمے کو جگہ دے سکتے تھے...... یا پھر وہاں صرف اتنی گنجائش تھی کہ کوہ نورد وہاں اپنا خیمہ نصب کر کے اس کے باہر بیٹھ سکے...... اور کوئی ایک ندی اتنی نزدیکی میں ہو کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اپنے چلّو میں اس کے سرد پانی بھرے اور پھر انہیں اپنے پیاسے حلق میں اتارے...... ایسے پانی کہ وہ اگر مسلسل ان کے گھونٹ بھرتا رہے تو...... مست اور مخمور

ہو جائے...... چینی شاعر لِی پو کی مانند...... جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر اپنی نظم "از خود رفتگی" میں کہتا ہے......

میں بیٹھا پیتا رہا اور شام کا دھیان نہ کر سکا۔
تا آنکہ گرتی ہوئی پنکھڑیوں نے میرے لباس کی تہوں کو بھر دیا......
مدہوشی میں اٹھا اور چاندنی میں نہائی ندی کے پار پہنچا......
پرندے جا چکے تھے اور آدمی بھی نہیں تھے!

میں بھی اگر اس مقام پر ایک رات کر سکتا تو...... لِی پو ہو سکتا تھا......

اور صرف یہی آبی طلسم کی کاریگری نہ تھی......

اس کا ایک پس منظر بھی تھا......

اس ہموار اگرچہ مختصر میدان کے سبزے میں...... ندیاں تھیں...... آبشار اور کنج تھے جو پوشیدگی سے باہر آتے تھے اور کہیں کہیں کائی سطح آب پر تیرتی تھی...... تو یہ پانی جو چٹان میں سے نمودار ہو کر اس میدان میں اترتے جاتے تھے تو میدان کے خاتمے پر نیچے کہیں گرتے تھے اور اوجھل ہوتے تھے...... اور بہت نیچے دریائے شمشال تھا جس میں یہ گرتے تھے اور اس دریا کے دوسرے کنارے پر ملونگودی گلیشیر کی برفانی دیواریں...... نیلی برفوں کی برف فصیلیں منجمد کھڑی تھیں......

ملونگودی گلیشیر کی یہ نیلی اور سرمئی منجمد فصیلیں گویا اس ندیوں سے اٹے اور ان کے پانیوں سے کسمساتے ہوئے ہرے بھرے میدان کا پس منظر تھیں......

اور کیا پس منظر تھا......

ملونگودی...... شمشال کے بڑے اور ہیبت ناک خوبصورتی والے گلیشیر میں سے ایک...... اس آبی فردوسِ بریں کے سامنے ایک منجمد دیوار کی صورت کھڑا تھا اور کہیں کہیں اس کی سرمئی رنگت ٹوٹتی تھی اور اس کی برفیں ٹوٹ کر دریائے شمشال میں گرتی تھیں...... اور وہاں وہاں اس کی سرمئی رنگت میں نیل ابھرتے تھے...... جیسے میرے بچپن میں گورو ارجن نگر کی گلی میں بیٹھا ہوا گولے والا...... برف کے ٹکڑے کو ایک رندے پر چڑھا کر اسے

چھیلتا تھا...... پھر اس کے چھیلے ہوئے گودے میں ایک تیلا ڈال کر اسے مٹھی میں بھینچ کر ایک گولہ بناتا تھا...... پھر اس بھینچے ہوئے برف کے گولے پر کوئی میٹھا اور گاڑھا سرخ شربت ایک پچکاری سے چھڑکتا تھا تو اس گولے کی سفیدی میں آہستہ آہستہ شربت کا رنگ اترتا تھا اور اسے سرخ کر کے گوڑھا ہوتا جاتا تھا...... ایسے ان ملونگو دی کی برفوں میں کہیں کہیں...... جہاں سے برف جدا ہوتی تھی ...... وہاں ان کی سفیدی میں کسی نیلے رنگ کے شربت کی آمیزش اپنے رنگ دکھلاتی تھی......

اور ابھی تھین کُک...... یعنی گرم چشمہ کی تصویر مکمل نہیں ہوئی......

کوٹھڑی سے چند قدم نیچے چٹان میں سے پانی برآمد ہو کر اور نیچے ایک مختصر میدان میں ندیوں میں بٹتے آبشاروں میں گرتے اور پھر بالآخر بہت نیچے دریائے شمشال میں گرتے ......اور دریائے شمشال کے دوسرے کنارے پر ملونگو دی گلیشیر کی سُرمئی اور نیلے بوسوں والی برفانی دیوار...... اور اس دیوار سے بہت پرے تک جانے کتنے کلو میٹر پرے تک یہ گلیشیر پھیلا ہوا تھا اور پھر اس کے پار کہیں دستگیر سر کی مشہور عالم چوٹی تھی جو بلند ہوتی جاتی تھی اور اُس ایک بادل میں سے سر نکالتی تھی جو اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہا تھا......

اور دستگیر سر کے برابر میں کنیانگ چش کی چوٹی بھی صاف ابھرتی تھی......

کنیانگ چش کو دیکھ کر میں قدرے جذباتی ہوا......

اس لئے کہ ہماری جان پہچان پُرانی تھی...... "سنولیک" ٹریک کے دوران جب ہم بیافو کے بعد ہسپر گلیشیر پر سفر کرتے تھے اور ہمارے راستے میں متعدد گلیشیر آتے تھے اور پریشان کرتے تھے تو دائیں جانب ایک گلیشیر عبور کرتے ہوئے ہم نے اس کنیانگ چش کو دیکھا تھا اور تب ہمیں بتایا گیا تھا کہ اگر ہم اپنا ٹریک چھوڑ کر اس چوٹی کی جانب...... اس گلیشیر کے راستے سفر کرنے لگیں تو اس کے دامن سے ایک راستہ وادئ شمشال کو بھی جاتا ہے...... اگر ہم اس راستے کو اختیار کرتے تو شائد یہیں کہیں گرم چشمہ کے آس پاس آ نکلتے......

اور ابھی یہ تصویر مکمل نہیں ہوئی......

اور یہ تصویر کبھی مکمل نہیں ہو گی...... اس لئے کہ لفظوں کی جادوگری اور ہیر پھیر سے اگر دنیا کا کوئی بھی منظر مکمل ہو سکتا تو پھر اس منظر کے وجود کا جواز باقی نہ رہتا......

منظر اس لئے باقی رہتے ہیں کہ لفظ برسات میں نکلنے والے مکوڑوں کی طرح ان کے قدموں تلے آ کر روندے جاتے ہیں فنا ہو جاتے ہیں...... میرے یہ لفظ عارضی ہیں اور فنا ہو جائیں گے لیکن گرم چشمہ کا آبی منظر موجود رہے گا......

اور ہاں اس سرسبز پانیوں کے خطے میں ایک مقام پر پودینے کے خوشبودار پتے زمین کو ڈھکے ہوئے تھے اور میں انہیں جھک کر توڑتا تھا اور انگلیوں میں مسل کر اپنی پوروں پر ان کی مہک سونگھتا اس منظر کو تکتا تھا......

"تارڑ صاحب...... سُوپ تیار ہے...... آئیں......" کسی نے پکارا اور میں اس منظر میں سے نکلا اور آہستہ آہستہ چلتا اوپر گیا اور کمرے کے اندر چلا گیا...... وہی زیارت والا ...... تبتی قسم کا دھواں آلود اور تاریکی میں سیاہ سانس لیتا ایک ماحول تھا...... درمیان میں ایک چولہا روشن...... اس کا پائپ چھت کے چوکور روشندان میں سے نکلتا...... تین جانب کچے پلیٹ فارم جن پر رضائیاں گدے...... کمبل...... اور ان پر ہمارے پورٹر...... آرام کرتے ہوئے......

نہ صرف سوپ تیار تھا بلکہ چولہے پر اوندھی رکھی ایک پرات پر سے پراٹھے اترتے تھے...... اور خمیری روٹی کے ساتھ سعید شیخ کا عنائت کردہ شہد کام آیا...... اور کچھ اچار کام آیا...... اور قدرت کی نمکین چائے نہ صرف کام آئی بلکہ ہم بھی اس کے کام آئے اور اونگھنے لگے...... باہر کے منظروں کی آبی یکتائی اور خمار اپنی جگہ لیکن اس کمرے کے اندر جو ٹھہراؤ تھا اس میں چند لمحے ٹھہرنے کے بعد اُس منظر کی جانب لوٹنے کی تمنا ہر جمائی کے ساتھ کم ہوتی جاتی تھی......

ہم تا دیر اونگھتے رہے...... میرے نتھنوں میں پرانی کھالوں کی بُو کی کثافت اور اطمینان کی نشہ آور مہک تھی...... کچے تھڑے پر بچھے یاک کے بالوں کے نمدوں اور گدوں میں آنے والے یہاں شب بسری کر کے آگے جانے والے مسافروں کے بدنوں کی ایک خبر تھی......

میں قدرے بیدار ہوا تو رجب اپنے بوٹوں کے تسمے کس رہا تھا......

"ادھر تو رات کرنے کو جی چاہتا ہے رجب......"

"ہاں اچھی جگہ ہے...... جب ادھر تک روڈ آئے گا تو ہم ادھر ایک ہوٹل بنائے

گا......سیاح لوگ پسّو سے جیپ میں بیٹھ کر ادھر دو ڈھائی گھنٹے میں پہنچ جائے گا...... آپ دعا کرو کہ ادھر روڈ آ جائے......"

کم از کم یہ دعا تو میں کبھی بھی صدق دل سے نہیں مانگ سکتا تھا......

گرم چشمہ کے آبی نظارے اور گلیشیر ہر کسی کے ہو جائیں اور میری اجارہ داری ختم ہو جائے یہ دعا میں کیسے مانگ سکتا تھا......

"تو پھر آگے چلے گا؟"

"جی صاحب......ادھر رات ٹھہر جاتے لیکن شمشال ادھر سے دور نہیں...... ادھر سے نکلیں گے تو ایک پُل ہو گا......اس کے پار جائیں گے تو وہاں ایک چڑھائی ہے......اور وہ مشکل ہے لیکن آخری چڑھائی ہے......اس کے اوپر پہنچیں گے تو شمشال نظر آئے گا اور سب سے پہلے وادی کے شروع میں میرا گھر دکھائی دے گا......اُدھر میں نے پیغام بھیجا ہے کہ مہمان آتے ہیں تو گھر والوں نے کچھ چائے وغیرہ کا بندوبست کیا ہو گا......اگر اِدھر رات کرتے ہیں تو وہ انتظار کرتے رہیں گے......"

میں اگرچہ اسیر ہو چکا تھا......گرم چشمہ کے پانیوں کی بیڑیاں میرے بدن کو باندھتی تھیں لیکن اس کے باوجود ایک عجیب سا خوف تھا......کہ ہم شمشال پہنچنے سے رہ نہ جائیں...... راستے میں کوئی ایسی دشواری نہ آ جائے کہ وہاں سے واپس ہونا پڑے......ہمارے نقشوں میں صرف شمشال درج تھا......گرم چشمہ کا کہیں اندراج نہ تھا...... تو ہمیں آگے جانا تھا......

"شمشال پہنچنے پر ہم کدھر کیمپ کریں گے وہاں کوئی خاص جگہ ہے"

"آپ وہاں کیمپ نہ کرو صاحب...... جگہ تو ہے......بہت ہے...... لیکن ادھر آبادی ہے......آپ کو ٹائلٹ کا پرابلم ہو گا اور آرام بھی نہیں ہو گا......ادھر مجنون خان کا گیسٹ ہاؤس ہے......ادھر ٹھہرو......اچھی جگہ ہے......"

"ہم کسی کمرے کی گھٹن میں بند نہیں ہونا چاہتے شاہ جی...... خیمے ہمارے پاس ہیں اور خوراک وافر ہے تو......ہم کیمپ کرنا پسند کریں گے"

"ٹھیک ہے صاحب......"اس نے سر تسلیم خم کیا"لیکن ادھر پہنچ کر دیکھ لینا کہ کیا کرنا ہے تو ابھی چلیں"

"چلیں بقا" میں نے خراٹے لیتے ہوئے ملتانی کو پکارا......

اس کے خراٹے یک قلم موقوف ہوئے...... پھر وہ اونگھنے لگا......اور بالآخر حلق میں سے چند عجیب سی آوازیں برآمد کر کے تقریباً بیدار ہو گیا"کہاں چلیں؟"

"شمشال......"

"خواہ مخواہ چلیں......"وہ اپنا انٹینا سیدھا کر کے مونچھیں پھڑکاتا بولا"رجب انکل نے ہمیں شکر جوئی کی ندیوں میں نہانے سے منع کیا تھا کہ ادھر پانی خطرناک اور ٹھنڈے ہیں......گرم چشمہ جا کر نہانا...... تو ہم نے ابھی شمشال نہیں جانا بلکہ ہم نے تو نہانا......کیوں تارڑ صاحب......"

"بالکل نہانا......"میں نے خوش ہو کر متعدد بغلیں بجائیں جن کی آواز دور دور تک گئی

"اور کس کس نے نہانا...... تم ندیم"

"اللہ معافی ......"اس نے ہاتھ جوڑ کر کمرے کی دھواں زدہ چھت کی طرف دیکھا"سائیں نمونیا کروانا ہے......"

میں نے اور بقا نے......چٹان میں سے ابلتے پانیوں کے نیچے اس آبی جنت میں ایک ایسے مقام کو اپنے نہانے کے لئے پسند کیا جہاں ایک چھوٹی سی آبشار گرتی تھی اور کناروں پر کائی تیرتی تھی سبز جھالروں کی طرح......

ایک چھوٹے سے تالاب کو پسند کیا......

اگرچہ یہاں مکمل پرائیویسی تھی......ملونگودی گلیشیر کی آنکھوں میں برف کا سفید موتیا اترا ہوا تھا وہ دیکھ نہ سکتا تھا......دریائے شمشال بہت نیچے تھا اور وہ جھانک نہ سکتا تھا......اس کے باوجود میں اپنے آپ کو ملبوسات سے مکمل طور پر آزاد کر کے ننگ دھڑنگ نہیں ہو سکتا تھا......چنانچہ میں اپنے ٹریکنگ ٹراؤزر سمیت اس تالاب میں فرد کش ہو گیا......

یہ پانی اتنا گرم بھی نہ تھا کہ اسے گرم چشمہ کا نام دیا جاتا......بلکہ اتنا سرد تھا کہ اگر لاہور میں میری بالٹی میں ہوتا تو میں اس میں ایک انگلی ڈبو کر اگرچہ "اوئی اللہ" تو نہ کہتا البتہ نہانے کے عمل کو غیر معینہ مدت کے لئے فوراً ملتوی کر دیتا......

لیکن......یہ لاہور نہ تھا وادئ شمشال کے راستے میں ملونگودی گلیشیر کے سامنے

......کنیانگ چش اور دستگیر سر کی چوٹیوں کے سامنے ایک آبی حیرت کدے میں ایک تالاب تھا...... چنانچہ پیمانے سردی کے مختلف ہو جاتے تھے...... یہ پانی یقیناً سرد تھے...... لیکن اتنے نہ تھا کہ ترشنگ کے پانیوں کی طرح بچھو ہو جائیں. کاٹنے پر اتر آئیں...... بلکہ ایک بار شڑاپ سے ان میں اتر جائیں...... بدن کو بھگولیں تو نہائت لطیف ٹھنڈک والے ہو جاتے تھے......

اگرچہ میں "کے ٹو کی کہانی" کے دوران ایک سراسر مقامات آہ و فغاں کو بھی غائب کر دینے والے پانیوں سے بھی نہایا تھا...... "سنولیک" کے دوران سفید ہمالیائی سنو مین یے ٹی کے پتھر کے پہلو میں سے بہتی گلیشیر ندی میں بھی مکمل اشنان کر چکا تھا......اور ابھی تک زندہ تھا...... لیکن بدن کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں جواب دے جائے...... کبھی آتش نمرود میں گر کر سلامت رہتا ہے اور کبھی دیا سلائی جلانے سے بھی بھک سے اڑ جاتا ہے......

سوختر آباد کے حمام میں غسل فرمانے کے بعد گرم چشمے کی ندیوں میں ہم نے جو ڈبکیاں لگائیں انہوں نے مجھے ویسا ہی پوتر کر دیا جیسا کہ ہندو بھائی گنگا جل میں ڈبکی لگا کر ہر قسم کے پاپ سے پاک ہو جاتے ہیں......

میں اور بقا نچڑتے ہوئے ٹھٹھرتے ہوئے...... بدن کے نویں نکور ہو چکے سکے کھنکھناتے ہوئے جب واپس آئے تو پورٹر اپنے بدن پر ہمارا سامان بوجھ کئے نیچے اتر رہے تھے......

"یاک کی دُم پکڑ کر چڑھنے کا تجربہ"

گرم چشمہ سے نکلتے ہی...... چٹانوں پر کچھ دیر چڑھتے اور اترتے ہیں......اور اترتے ہی ایک پر شور نالہ راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے......

اور یہ نالہ بہت بلندی پر جو چند چولہوں کی نئی آبادی تھی جو ہمیں تو دکھائی نہ دیتی تھی وہاں سے اتر کر نیچے آرہا تھا اور حسین آباد کا نالہ تھا......

میں نے اسے ایک دھڑکتے دل سے...... جو اس نالے کے شور سے کہیں بڑھ کر دھڑکتا تھا...... نہائت خود مختار اور بیباک ہو کر کسی بھی سہارے کے بغیر عبور کیا......اور پھر ہم دریائے شمشال کی تنگ گذرگاہ کے قریب ہونے لگے......اور دریا کے کناروں تک آگئے ......اور اس پر ایک اور پل تھا جس کے پار ہم نے جانا تھا......اور پار وہی چڑھائی تھی جس کے بارے میں رجب ڈے ون سے دوہائی دیتا آرہا تھا کہ صاحب بس آخر میں ایک چڑھائی ہے جو مشکل ہے......

چنانچہ سامنے دریائے شمشال پر ایک اور پل تھا......

اسے...... کٹ دوربین...... کہتے تھے......

یعنی چڑھائی سے پہلے والا پل......

اور جہاں ایک پل کا نام...... چڑھائی سے پہلے والا پل...... ہو...... تو وہاں چڑھائی کیا ہو گی...... یہ پل بھی ایسا تھا کہ بس مرزا غالب کی مشکلوں ایسا تھا...... کہ...... پُل مجھ پر اتنے پڑے کہ آساں ہو گئے...... تو یہ پل بھی اسی کیفیت میں پار کیا گیا...... یہاں بھی پاؤں تلے کہیں کہیں نمودار ہوتے تختے تھے......اور میں ایک بازی گر...... تین شمشالی پلوں کو پار کر جانے والا تجربہ

کاراب ایک بازی گر...... اپنے دل کو اپنی ہی مٹھی میں لئے اس کے پار اتر گیا......

پار ہوئے تو چڑھائی نے ایک بھینسے کی مانند ماتھا آگے کر دیا کہ...... ہے تو رو...... ذرا آؤ تو سہی...... یہ چڑھائی دریا کے کناروں سے ایسے اٹھتی تھی...... جیسے سپیرے کی بین پر ایک ناگ پھن پھیلائے اپنی گردن اٹھاتا ہے اور سیدھا ہو جاتا ہے......

اس ناگ چڑھائی کو مقامی زبان میں کٹ دوئین کی چڑھائی کہتے تھے......

تو اس ناگ کو ہم نے قابو کرنا تھا......

گرم چشمہ کی آبی جنت کے بعد...... یک لخت یہ دانتے کا دوزخ کہاں سامنے آ گیا......

سیدھی آسمان میں سیڑھی لگاتی چڑھائی تھی......

ایسی چڑھائی تھی کہ ایک روبوٹ تو میکانکی انداز میں ٹھپ ٹھپ کرتا اس پر چڑھتا جائے تو چڑھتا جائے...... روبوٹ کو یوں بھی جان کی پرواہ نہیں ہوتی. نیچے گہرائی میں دیکھ لے...... تو زیادہ سے زیادہ اس کمپیوٹر کے چند ہندسے بدل جاتے ہیں خوف کے مارے گرتا تو نہیں...... لیکن ایک انسان کے لئے یہ چڑھائی انتہائی نامناسب دکھائی دیتی تھی......

روڈ کیمپ کے بعد جو چڑھائی تھی یہ اس کا ڈبل ایکشن ری پلے تھا......

دھوپ اگرچہ ڈھل چکی تھی لیکن اس کی شدت اب بھی زبان کو سکھاتی تھی......

میں معمول کی طرح رجب کے سہارے سہارے یہ نہیں جانتا تھا کہ آگے کیا ہے پیچھے کیا ہے اور نیچے کیا...... بس چڑھتا جاتا تھا...... ہر دو قدم بعد اسے روکتا تھا پھر سانس درست کرتا تھا اور پسینہ پونچھتا تھا...... اور چل بھائی رجب...... اور اس کے ساتھ شمشال میں رہنے والوں کو کوستا تھا کہ یہ لوگ کسی اور آسان سی وادی میں آباد نہیں ہو سکتے تھے......

پھر راستہ اتنا تنگ ہو گیا اور خطرناک ہو گیا کہ دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالبؔ اور جینا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ وغیرہ وغیرہ...... اتنا تنگ کہ رجب میرا ہاتھ تھام کر نہیں چل سکتا تھا...... بس آگے چلتا تھا اور میں اس کا رک سیک گرفت میں لینے کی جدوجہد کرتا تھا...... ایک مقام پر وہ رکا اور پھر مسکرایا...... "تارڑ صاحب یاک کی دُم پکڑ کر چلنے کا کچھ تجربہ ہے آپ کو؟"

"میں صرف ایک بار ایک خارش زدہ یاک کی پشت پر فوٹو اتروانے کیلئے بیٹھا تھا...... اس

کے علاوہ میرا کوئی یاک تجربہ نہیں......"

"ہم لوگ جب درّہ شمشال کو جاتے ہیں تو اس قسم کی چڑھائی پر آگے چلتے یاک کی دُم پکڑ لیتے ہیں اور اس کے سہارے چلتے ہیں...... آپ یوں کیجئے کہ میرے رک سیک کا نچلا سٹریپ ایک دُم کی طرح تھام لیجئے اور چلتے آیئے......"

چنانچہ میں نے رجب کی دُم پکڑی...... یعنی اسکے رُک سیک کے سٹریپ کو مضبوطی سے پکڑا اور پھر رجب ایک یاک کی طرح اوپر چڑھتا گیا اور میں اس کے پیچھے پیچھے کبھی قدم اٹھاتا کبھی گھسٹتا بلند ہوتا گیا...... وہ سر ہلاتا اطمینان سے میرے آگے یوں چلتا جا رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ جب یہ رکے گا تو ہم دونوں کے ٹو چوٹی پر ہوں گے اور یہ کہے گا" تارڑ صاحب اب تو میری دُم چھوڑ دیں ہم پہنچ گئے ہیں......"

اور تقریباً ایک گھنٹے کی مشقت کے بعد اس نے یہی کہا...... تارڑ صاحب اب تو میرا سٹریپ چھوڑ دیں چڑھائی ختم ہو گئی ہے......

پورٹر اور میرے ساتھی ایک پتھر سے ٹیک لگائے آرام کر رہے تھے......

"کیا یہی وادیٔ شمشال ہے......رجب شاہ کا گھر"

بلندی کا اختتام ہو چکا تھا......اور ہم ایک کنارے پر کھڑے تھے اور ہمارے قدموں کے عین نیچے......بہت نیچے وادیٔ شمشال تھی اور اس میں دریائے شمشال لیٹا ہوا تھا......

عجیب سی وادی تھی......

میرا دل بجھ گیا......

بہت اداس......خشک......دور ایک ڈھلوان پر چند گھر تھے......

بائیں جانب ملنگو دی گلیشیر کی برفیں تو دکھائی نہیں دیتی تھیں البتہ اسکی بھر بھری ڈھلوان نیچے وادی تک جاتی نظر میں آتی تھی......

نہ دُھند تھی......نہ بادل......نہ کوئی سحر اور نہ دور افتادگی کی کوئی کشش......ایک خاموشی سے لیٹا وسیع ریتلی گذرگاہ کے بیچ لیٹا ایک دریا......ویرانی......ایک عام سی کوہستانی وادی......

میرا دل بجھ گیا......

کیا یہی وادیٔ شمشال ہے......جس کے لئے میں نے اتنے جتن کئے تھے......

نیچے......بہت نیچے......اترائی کے بعد......جہاں سے وادی کا آغاز ہوتا تھا وہاں چند درخت اور کچھ سبزہ تھا......یہ رجب کا گھر تھا......

"تارڑ صاحب......میں نیچے چلتا ہوں......آپ کے لئے چائے پانی کا کچھ بندوبست وغیرہ کرتا ہوں......آپ آرام سے آجائیں......" وہ نیچے اترنے لگا۔

بقا نے میری جانب دیکھا......ندیم کی نظروں میں بھی شکایت تھی کہ سائیں یہ کہاں

لے آئے ہو......اس سے بہتر تھا کہ شکار جوئی یا گرم چشمہ میں ہی ٹھہر جاتے۔

یہ دنیا کی تنہاترین جگہ تو تھی......لیکن جس خوشی کو میں یہاں سے حاصل کرنے کے لیے آیا تھا وہ کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔

ہم بوجھل دل سے......بجھے بجھے......کبھی بجری کی ڈھلوان پر......کبھی ریتلے راستوں پر......اترتے گئے......

وادیٔ شمشال میں اترتے گئے۔

بائیں ہاتھ پر دریائے شمشال کے عین اوپر تنگ عشت اور رحیم آباد کے چھوٹے چھوٹے گاؤں......چند گھر تھے......اور وہاں تک جانے کے لیے دریا کے اوپر گراری والا جھولا تھا......

اور پھر زمین ہموار ہو گئی......ہم تھوڑی دیر اور چلے......ملنگو دی گلیشیر کی ڈھلوان کے دامن میں ایک پتھریلی چار دیواری کے اندر کچھ درخت اور کھیت تھے اور کھیتوں میں پانی پھیلا ہوا تھا......ہم یہاں رک گئے۔

یہ رجب شاہ کا گھر تھا......اس کے کھیت تھے......اور یہ فرمان آباد کہلاتا تھا۔

چار دیواری کے قریب رجب شاہ کا بڑا بیٹا امان خان......بلند قامت......سنہری رنگت جو ڈھلتی دھوپ میں دمکتی تھی نہایت خوش شکل جوان......اور اس کے برابر میں اس کی گڑیا سی بیٹی جو ہم اجنبیوں کو حیرت سے تکتی تھی اور منع کرنے کے باوجود اپنی انگلی منہ میں ڈالتی تھی......رحیم بھی موجود تھا جو گلگت میں زیر تعلیم تھا......ناصر اور عین اللہ بیگ شمشال سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے......

"آئیں نان تارڑ صاحب"......امان نے ذرا جھک کر اپنے گھر کی جانب اشارہ کیا......

اس گھر کے ارد گرد کوئی درخت کوئی سبزہ نہ تھا......جیسے صحرا میں ہو......اس کی بناوٹ اتنی سادہ تھی کہ پہاڑ کی ویرانی کا ایک حصہ لگتا تھا بس چٹیل دیواریں تھیں اور یہ شائبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کے اندر لوگ ہوں گے......ایک ایسی ہی چٹیل دیوار میں ایک چھوٹا سا در تھا جو امان نے دھکیلا اور ہم جھکتے ہوئے اندر داخل ہو گئے......

اور اندر ہمارے لئے حیرت کا سامان تھا......ایک نیا نکور......دیودار کی لکڑی سے بنا ہوا

ایک ہال نما وسیع کمرہ......ایک شمالی مزاج کا......ایک شمشالی کمرہ......ہنزہ یا کرغیز انداز کی ایک آماجگاہ جس میں تازہ چھلی ہوئی لکڑی کی مہک تیرتی تھی......تعمیر کا سٹائل تو وہی تھا جو ہم نے زیارت اور گرم چشمہ کے کمروں میں دیکھا تھا لیکن یہ ان کی نسبت ایک عالی شان اور ستھرا مقام تھا...... آسودگی، نیم تاریکی اور خوشگوار ٹھنڈک والا ایک ایسا مقام جس کے اندر داخل ہوتے ہی مسافر اپنے بقیہ سفر کو فراموش کر کے بس وہیں قیام کر جانا چاہتا ہے......

درمیان میں نمدے اور قالین بچھے ہوئے تھے......دیواروں کے ساتھ گاؤ تکیے سجے تھے اور غالیچے آراستہ تھے......کوہ پیمائی کا سامان...... صاف ستھری رضائیاں اور کمبل......ایک جانب تصویریں اور پوسٹر سجے تھے......رجب شاہ، صدر لغاری سے پرائڈ آف پرفارمنس وصول کرتا ہوا پس منظر میں بے نظیر تالیاں بجاتی ہوئی......پھر مہربان شاہ کے ہمراہ کے ٹو سر کرنے کے بعد صدارتی محل میں ایک لاکھ روپے کا انعام حاصل کرتے ہوئے......جاپانی اور فرانسیسی وغیرہ میں کوہ پیمائی کی کتابیں جن کے ہر دوسرے صفحے پر رجب کا تذکرہ اور تصویر تھی......

لیکن اس کے کمرے کی سب سے زیادہ متاثر کرنے والی زیبائش پہاڑوں کی وہ تصویریں تھیں جو اس کی کچی دیواروں پر قلعی کر کے اُن پر پینٹ کی گئی تھیں......

پاکستان کی تمام بلند ترین اور معروف چوٹیوں کی تصویریں جو نہایت ابتدائی ہنر مندی سے بنائی گئی تھیں اور خوبی یہ تھی کہ ان سب پر رجب شاہ قدم رکھ چکا تھا......

"یہ تصویریں کس نے بنائی ہیں؟"

"میرا ایک بھتیجا ہے گلگت میں......اسے مصوّری کا شوق ہے......اس نے بنائی ہیں"

پہاڑوں کی یہ تصویریں دنیا کی تنہا ترین جگہ کے ایک کمرے میں روپوش تھیں اسی لئے انکی ستائش نہ ہو سکی تھی......

یاک کے پنیر اور گھی میں گندھی ہوئی روٹی کی روایتی شمشالی خوراک سے ہماری تواضع کی گئی......گرم چائے نے ہم سب کو بیدار کر دیا کیونکہ اس سے پیشتر تھکاوٹ ہمارے بدنوں میں گھونسلے بناتی چلی جاتی تھی اور ہم کچھ سوتے تھے کچھ اونگھتے تھے اور کبھی زبردستی آنکھیں کھول کر آس پاس دیکھتے تھے کہ ہم کہاں ہیں......ہم باتیں کرنے لگے......بیدار ہو گئے......

رجب کا یہ وسیع ہال نما کمرہ ہنزہ کے گھروں کی طرح ڈرائنگ روم کم ڈائننگ روم کم بیڈ روم تھا......اگر کسی کو خلوت درکار ہے تو وہ اپنے حصّے کے گرد چھینٹ کی چادریں گرا کر الگ بھی ہو سکتا ہے......

اس کمرے کی ستھری کشادگی اور دیودار کی مہک میں پنیر اور گھی میں نچڑتی روٹی کھانے کے بعد قابل فہم طور پر ہم بھی کچھ کشادہ ہو گئے پاؤں پسارے اور باتیں کرنے لگے......

"رجب آپ نے پچھلی شب ہمیں جانوروں اور درندوں کے قصے تو سنائے لیکن اپنے پہاڑوں کی کوئی کہانی نہیں سنائی......"

"بس صاحب میں بھی شمشال کے ہر بچے کی طرح اپنے باپ کے ساتھ مال مویشی لے کر اوپر شمشال کے درّے میں واقع اپنی چراگاہ کو جایا کرتا تھا......ذرا بڑا ہوا تو ایک بار بیافو گلیشیر کو کراس کر کے ادھر اپنی وادی میں اترا تھا......پھر پورٹر ہوا اور پھر ہائی پورٹر ہو گیا......"

"یہ کتنا ہائی ہوتا ہے شاہ جی؟"

"بہت ہائی ہوتا ہے......" وہ اپنی مضبوط بتیسی کے ساتھ ہنسا "ہائی پورٹر کا اصل کام چوٹی کے دامن میں پہنچ کر شروع ہوتا ہے......پہلے کیمپ ون میں سارا سامان جمع ہوتا ہے پھر ہائی پورٹر اسے اپنے کندھوں پر اٹھا کر کیمپ ٹو تک لے جاتے ہیں......وہاں کی ضرورت کے لئے کچھ سامان چھوڑ کر بقیہ سامان کیمپ تھری لے جاتے ہیں......پھر مشکل ترین مرحلہ شروع ہوتا ہے جب سامان اٹھا کر کیمپ فور یا آخری کیمپ تک چڑھنا ہوتا ہے......کیمپ فور چوٹی کی قریب میں ہوتا ہے اور بلند ترین مقام پر ہوتا ہے......اور یہ بہت سخت جگہ ہوتی ہے......انسان اپنی جیکٹ کا زپ چڑھاتا ہے تو سانس پھول جاتا ہے......اس بلندی پر قدم اٹھانا مشکل ہوتا ہے لیکن ہائی پورٹر سامان اٹھا کر اوپر جاتا ہے......ہائٹ برداشت کرنا بہت ہی مشکل کام ہے......اس کے لئے تگڑا بندہ چاہئے......"

"اچھا......" میں نے سر ہلایا "ادھر لاہور میں ٹیلی ویژن اور ادب سے تو کوئی کمائی نہیں ہوتی رجب......میں تو سوچ رہا تھا کہ یہ ہائی پورٹر والا کام شروع کر دوں...... تو یہ کام میں نہیں کر سکتا......"

رجب میری طبیعت کو سمجھنے لگا تھا اور اس قسم کے فقروں کو بہت انجائے کرتا تھا......

"کر سکتا ہے صاحب...... کیوں نہیں کر سکتا......"

"کیسے؟"

"جیسے آج آپ گرم چشمے کے بعد چڑھائی پر یاک کا دُم پکڑ کر چڑھ گیا تھا...... ویسے...... تو ادھر آپ ہائی پورٹر ہو جاؤ اور ایک یاک ساتھ لے جاؤ...... ویسے تارڑ صاحب ابھی آپ تگڑا بندہ ہے...... کیونکہ آپ دل میں تگڑا ہے...... عمر سے زیادہ فرق نہیں پڑتا...... دل سے پڑتا ہے...... آج سویرے آپ بہت اچھا چلا تھا...... اور قربان کہتا تھا کہ صاحب ہے تو زیادہ عمر کا لیکن چلتا ہم شمشالیوں کی طرح ہے......"

"اور شمشالی کیسے چلتے ہیں"

"دل سے......"

اس کامپلی منٹ نے مجھے خوش کر دیا اور اگر میری دُم ہوتی تو میں ضرور اس پر کھڑا ہو جاتا یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے رعائتی نمبر دے کر پاس کیا گیا تھا......

"اچھا تو جب آپ ہائی پورٹر ہو گئے......"

"جی ہاں...... میں نے پہلا پیک نانگا پربت کیا...... 98میں......"

"جب میں نے تمہیں صبح کی نشریات میں شمشال سے بلایا تھا......"

"جی صاحب...... پھر 90ء میں گشابرم ون پر گیا...... 92ء میں دوبارہ چوٹی پر گیا...... 93ء میں براڈ پیک کو سر کیا...... 95ء میں کے ٹو اور آخری چوٹی ابھی پچھلے برس 98ء میں مشابرم ون کیا تھا......"

"یعنی پاکستان میں آٹھ ہزار میٹر سے زیادہ کی جتنی بھی چوٹیاں ہیں وہ آپ کے قدموں تلے آچکی ہیں...... اور کسی نے ان پانچوں کو نہیں کیا"

"نہیں صاحب...... نذیر صابر نے چار چوٹی کیا ہے ان میں سے...... شیر خان اور مہربان نے تین تین کیا ہے...... میری دلی خواہش ہے کہ ایورسٹ پر بھی پاکستان کا جھنڈا لگاؤں لیکن میرے پاس ٹائم کم ہے...... اڑتالیس برس کا ہو چکا ہوں...... میں نہ کر سکا تو میرا بڑا بیٹا امان انشاءاللہ کرے گا...... بہترین کلائمبر ہے...... کیوں امان؟"

امان نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا...... مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ شمشال کے بہترین کوہ پیاؤں میں شمار ہوتا ہے......

"سائیں ادھر اوپر بلند پہاڑوں میں کبھی کسی جن بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی" ندیم کسی نیم تاریک گوشے میں سے بولا......

"نہیں ایسا کوئی چیز نہیں ہے صاحب...... ایک مرتبہ...... اور اس زمانے کی بات ہے جب میں سردیوں میں کینیڈا والوں کے ساتھ کے ٹو پر گیا تھا فلم بنانے کے لئے...... بعد میں وہ مجھے کینیڈا بھی لے کر گئے تھے...... تب میں اوپر کیمپ فور میں سویا ہوا تھا تو رات کو مجھے محسوس ہوا کہ ٹینٹ کے باہر کوئی چیز چل رہی ہے...... ادھر اتنی ہائٹ پر کون ہو سکتا تھا...... میں تھوڑا ڈر گیا...... لیکن باہر آ گیا دل کو تگڑا کر کے...... غور سے دیکھتا ہوں تو میرے خیمے کے برابر میں برف میں سے ایک بوٹ باہر نکلا ہوا ہے...... میں نے برف کھودا تو بوٹ کے ساتھ ایک ٹانگ بھی تھی...... وہیں پر کھودنا چھوڑ دیا...... یقیناً کوئی مردہ کوہ پیما تھا جو ادھر برف میں دب کر مر گیا تھا...... شائد وہی چل رہا تھا کہ تم نے میرے اوپر ٹینٹ کیوں لگایا ہے تو میں نے وہاں سے ٹینٹ اکھاڑ کر ذرا پرے ہو کر لگا لیا......"

"تو دوبارہ نیند آ گئی......" ایک ہچکی نما سوال کہیں سے آیا......

"آ گئی صاحب...... وہ تو مردہ تھا اس نے ہمیں کیا کہنا تھا...... وہ ادھر سوتا تھا برف میں ہم اپنے خیمے میں سوتا تھا......"

چائے مزید آ گئی...... اور اس نے ہمیں بیدار کرنے کی بجائے پھر سے خوابیدہ سا کر دیا کہ ہم بے حد تھکاوٹ میں تھے اور ہماری ٹانگیں جو پہلے مسلسل متحرک ہونے کی وجہ سے مجبوراً ساتھ دے رہی تھیں اب پتھرانے لگیں......

"سائیں بس یہی شمشال ہے"

"نہیں جناب...... یہ تو شمشال کی دُم ہے...... سنٹرل شمشال تو آگے ہے ابھی...... میں نے کوشش کی تھی کہ آپ کے لئے یہاں سے ٹریکٹر کا بندوبست ہو جائے...... لیکن مالک نیچے پسو گیا ہے اور چابی ساتھ لے گیا ہے......"

"ٹریکٹر...... ادھر شمشال میں کیسے آ گیا؟"

"ادھر ایک مرتبہ ایک مہربان جنرل امتیاز وڑائچ آیا تھا ہم لوگوں نے درخواست کی کہ اگر ادھر ٹریکٹر آجائے تو شمشال کا قسمت بدل جائے...... تو اس نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے اس کا باڈی اور انجن وغیرہ باری باری لایا اور ادھر جوڑ دیا...... آپ بے شک ادھر آج میرے پاس رات کرو کل آگے چلا جانا...... ابھی کچھ فاصلہ ہے اور آپ تھکے ہوئے ہیں......"

"چلیں گے سائیں...... اب پہنچ گئے ہیں تو اب رات ادھر ہی کریں گے" ندیم کی مونچھیں سیدھی ہو گئیں اور وہ خود بھی بالکل سیدھا ہو گیا......

"تو پھر آپ اجازت دو تو میں ادھر ٹھہرتا ہوں...... ایک مدت کے بعد گھر آیا ہوں تو ادھر ٹھہرتا ہوں بچوں کے ساتھ......" رجب نے باقاعدہ اجازت مانگی "آپ شمشال چلو میں کل صبح آپ کے پاس آؤں گا"

"ایک بے رُوح سفر...... مایوسی اور اداسی"

ہم پتھریلی ٹانگوں کو گھسیٹتے اس کمرے سے نکلے...... اس راستے پر آئے جو سنٹرل شمشال کو جا رہا تھا تو سامنے سے ایک سائیکل سوار گھنٹی کھڑکاتا چلا آرہا تھا...... اور وہ اس سائیکل پر یوں سواری کرتا آرہا تھا جیسے اس نے کسی وحشی سانڈھ کو مطیع کر لیا ہے اور اس پر سوار چلا آتا ہے......

بقانے ایک ٹریفک کانسٹیبل کی طرح اسے رکنے کا اشارہ کیا...... حالانکہ اس نے بہر طور رکنا تھا...... اور وہ رکنے کے لئے ہی آیا تھا...... اس نے جانے کس بلندی سے ہمیں سپاٹ کیا تھا اور صرف اپنی شمشال میں عجوبہ سائیکل کی نمائش کرنے کے لئے نیچے آیا تھا...... جیسے پسماندہ گاؤں کا کوئی بچہ اپنی آنکھوں سے پانچ گنا بڑا ایک سیاہ چشمہ پہن کر آپ کی توجہ کا طالب ہوتا ہے لیکن لاپرواہ دکھائی دیتا آپ کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے......

"سائیں یہ سائیکل آپ کی ہے؟"

"ہاں ہمارا ہے...... اور اس کا گھنٹی بھی ہے" اس نے گھنٹی بجانے کا مظاہرہ کیا" اور یہ صرف سائیکل نہیں...... ماؤنٹین بائیک ہے"

"یہ شمشال میں کیسے پہنچ گیا...... پسّو سے چلا کر لایا ہے"

"نہیں...... سر پر اٹھا کر لایا ہے...... ادھر تین چار سائیکل اور بھی ہے......"

"اس پر سوار ہو کر کہاں جاتے ہو"

"کہیں نہیں...... جب شام کو ادھر چلاتا ہے تو سب لوگ دیکھتا ہے...... گھنٹی بجاتا ہے"

اس نے پھر گھنٹی بجا کر ہمیں اسکے وجود کا یقین دلایا اور پھر پیڈل مارتا واپس چلا گیا...... تھوڑی

دور جا کر راستے سے اترا اور اسے سر پر اٹھا کر پتھروں کے پیچھے کسی گھر میں چلا گیا......

"آئیں انکل......" قدرت نے رجب کی مناسبت سے مجھے بھی انکل کے عہدے پر فائز کر دیا "نہیں تو شام ہو جائے گی...... ابھی دور جانا ہے"

رجب کے کھیتوں کی پتھریلی چار دیواری کچھ دیر ہمارے ساتھ چلی...... پھر ایک اور چار دیواری شروع ہو گئی جس کے اندر ریت پانی اور پتھروں میں سفیدے کے نوخیز پتلے دبلے بوٹے ہوا کے زور سے دوہرے ہوتے تھے......

ہماری پتھر ٹانگیں کڑکڑاتی اور چلنے سے انکاری ہوتی تھیں......

یہ ایک بے روح سا منظر تھا...... دائیں ہاتھ پر ایک خشک پہاڑی تھی اور بائیں جانب ذرا گہرائی میں دریائے شمشال کا وسیع پاٹ تھا اگرچہ اس میں دریا بہت کم تھا اور ریتلا پھیلاؤ بہت بڑی رقبے پر تھا...... نہ صرف سفر بلکہ منظر بھی بے روح تھا......

راستہ ختم نہ ہوتا تھا......

شمشال پہنچ کر بھی شمشال نہ پہنچنا ایک عجیب عذاب تھا......

سامنے ایک طویل فاصلے پر ایک قدرے سرسبز پہاڑی تھی جس پر ایک قلعی شدہ مکان کے آثار تھے اور کہا جاتا تھا کہ سنٹرل شمشال اس کے عقب میں واقع ہے لیکن ہم چلتے جاتے تھے اور بے حال ہوتے جاتے تھے لیکن یہ پہاڑی ہمارے نزدیک نہ آتی تھی......

یہ ایک بے روح سفر اس لئے بھی تھا کہ گرم چشمہ میں ہمیں یقین دلایا گیا تھا کہ اس کٹ ڈور دوئمین بلندی کے پار شمشال ہے...... اور اس کے پار آتے ہیں تو لگتا ہے کہ ابھی ابتدائے عشق ہے...... مرکزی شمشال تو آگے ہے...... چنانچہ ہم ذہنی طور پر تو شمشال پہنچ گئے تھے لیکن جسمانی طور پر نہیں پہنچے تھے...... اسی لئے ہر قدم بوجھ لگتا تھا...... ادھر رجب بھی اپنے گھر میں ٹھہر گیا تھا اور مجھے عادت ہو چکی تھی کہ وہ ایک دلائی لاما کی طرح شانت ہو کر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا جاتا ہے اور میں اس کے قدموں پر قدم رکھتا چلتا جاتا ہوں...... اب وہ میرے آگے آگے نہیں چل رہا تھا تو میرا خود کار رجبی نظام گڑبڑ ہو گیا تھا اور میں ذرا بے سمت سا ہو گیا تھا......

وہ پہاڑی جو ایک طویل فاصلے پر نظر آتی تھی اور قریب نہ آتی تھی ایک سیدھے سپاٹ

ریتلے پتھریلے راستے پر چلتے چلتے بالآخر قریب آ ہی گئی......

"یہ اوپر امین آباد کا گاؤں ہے تارڑ صاحب......"

"یہ شمشال ہے"

"یہ بھی شمشال ہے لیکن سنٹرل شمشال ذرا آگے ہے...... ذرا اوپر دیکھیں"

اوپر امین آباد کے چند کھیتوں اور دو چار مکانوں کے عقب میں سے ایک گلیشیر جھانک رہا تھا اور اس میں سے جو نالہ برآمد ہو رہا تھا وہ نیچے اتر کر دریائے شمشال کی خشک گزرگاہ میں شاخیں بناتا ہوا ہمارے راستے میں حائل ہو رہا تھا......

اسے ادویر نالہ کہا جاتا ہے

گلیشیر کے برابر میں جو خشک چٹانیں تھیں ان کے عقب میں سے ایک نہائت ہی دل کش برف سے لدا ہوا پہاڑ طلوع ہو رہا تھا...... یہاں سے...... امین آباد کے دامن میں صرف اس کی چوٹی دکھائی دے رہی تھی...... اس کا مکمل حسن سامنے نہ آتا تھا......

"قدرت یہ کونسی چوٹی ہے"

"اسے شمشال وہائٹ ہارن کہتے ہیں......"

شمشال کا سفید سینگ...... وہائٹ ہارن...... سوئٹزرلینڈ کے قصبے زرمٹ کے اوپر یورپ کی سب سے خوش شکل چوٹی میٹرہارن تھی اور اس کی شباہت ایک مڑے ہوئے دانت کی طرح تھی......

مجھے یقین ہے کہ کسی سوس کوہ پیمانے ہی اسے شمشال وہائٹ ہارن کا نام دیا تھا......

میٹرہارن کی یاد میں......

ہم امین آباد کے دامن سے اتر کر دریائے شمشال کی گزرگاہ میں چل رہے تھے اور ہمارے آگے ادویر نالے کی مختلف شاخیں اچھلتی اور منہ زور ہوتی نیچے جا رہی تھیں دریا میں شامل ہونے کے لئے...... ہم ان کو ٹاپتے گئے لیکن اس کی مرکزی شاخ کی تندی میرے بس میں نہ تھی اور یہاں پھر مہربان کی مہربان سواری مجھے دوسرے کنارے پر لے گئی......

دریا کی ریتلی گزرگاہ میں بہتے نالے کے پار ہو کر ہم دائیں جانب ہو گئے......

"تارڑ صاحب...... کبھی یہ علاقہ بھی ہماری وادی کا ایک سرسبز اور آباد حصہ

تھا...... یہاں اب صرف ریت اور پتھر ہیں...... 1962ء میں اوپر شمشال کے درّے سے بہت برف پگھلنے پر بہت پانی نیچے اترے اور ہمارے مکان اور کھیت اس میں بہہ گئے...... ہماری وادی پہلے سے بھی مختصر ہو گئی......"

دائیں جانب...... ذرا بلندی پر کھیتوں کی باڑیں دکھائی دیں...... کچھ منڈیریں ابھرتی تھیں...... ہم ان کے عین نیچے اوپر جو کچھ تھا اس سے بے خبر ان کے دامن میں ذرا گہرائی میں چل رہے تھے...... کہ یکدم ان منڈیروں پر سے چند بچوں نے جھانکا......

ان کے چہرے یکدم نمودار ہوئے تو ہم خوفزدہ ہو گئے...... کہ یہ کہاں سے آگئے ہیں......

کیونکہ ہمیں ان کی توقع نہ تھی......

پھر وہ بچے جو تعداد میں کل چار تھے ہمارے سروں کے اوپر منڈیروں سے جھانکتے ان پر بھاگتے "پکچر پکچر" کا شور مچانے لگے......

ایک بچہ جو بہت ہی بچہ تھا اور چند روز پیشتر چلنا سیکھا تھا لڑھکتا ہوا کہتا "پکچر......" اور بقیہ بچے اسے سنبھالتے نظر میں رکھتے ہنستے چہلیں کرتے اپنے بوسیدہ لبادوں سے ناکیں پونچھتے شور مچاتے ہمیں دیکھ کر خوش ہوتے "پکچر پکچر"

قدرت نے رک کر اوپر دیکھا اور انہیں اپنی زبان میں ڈانٹا لیکن ان کی بھاگ دوڑ اور "پکچر پکچر" کی رٹ ختم نہ ہوئی......

نانگا پربت کے ٹاپ میدان میں جب ہم داخل ہوئے تھے تو وہاں بھی چرواہوں کے بچوں نے "میٹھی میٹھی" کے شور کے ساتھ ہمارا استقبال کیا تھا...... لیکن وہاں تو منظر اور تھا...... نانگا پربت کی سفید حیرتیں اور ایک انجانی وادی کا وسیع طلسم ہمارا منتظر تھا...... اور یہاں کیا تھا؟...... کچھ بھی نہ تھا......

میں اتنے برسوں سے شاہ حسین جولاہے کی طرح اپنے تصوّر کی کھڈی پر شمشال کا جو کھیس بُن رہا تھا...... داستانوں...... سفری کتابوں...... دور افتادگی کی کہانیوں کے تانے بانے سے اس پر رنگ رنگ کے گل بوٹے اور نقش بُن رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ ایسے نقش نہ کسی نے دیکھے نہ سنے...... یہ بیل بوٹے تو وہی دیکھتے ہیں جو وہاں تک پہنچتے ہیں...... اور میں مدتوں یہ

کھیس خیالی بُنتا رہا...... میں پہلے بھی تو ایسے کھیس بُنتا رہا تھا......

فیری میڈو کے جنگل کے ہرے بھرے سحر انگیز کھیس...... شاہ گوری کے بدن کے سفید اور نیلے گل بوٹوں والے کھیس...... جھیل کرومبر کے نیلے ڈیزائن کے...... پانیوں کی روانی والے...... اور سنولیک کے چٹے دودھ کھیس...... ایسے سفید جیسے چاندنی میں کوّا بھی سفید ہو جاتا ہے ایسے براق کھیس...... اور جب میں نے ان وادیوں اور جنگلوں کو دیکھے بغیر ان کے خیالی کھیس بُنے...... اور پھر ان وادیوں اور جنگلوں میں پہنچا تو انہیں ان خیالی کھیسوں سے کہیں بڑھ کر سوہنے اور شاندار پایا...... اور میں ان کھیسوں کو اپنی سٹڈی میں لے آیا...... گرمیوں میں اپنی کرسی کی گدی میں پسینے کی دھاریں جذب کرتے اور سردیوں میں ٹھٹھرتے ہوئے...... میں انہیں اپنے سامنے بچھاتا تھا اور انہیں دیکھ دیکھ کر ان سفروں کے قصّے قلم بند کرتا تھا......

لیکن یہاں اک عجب سانحہ ہو گیا تھا......

میں نے شمشال کا جو کھیس ایک عرصے تک اپنی کھڈی میں ٹانگے لٹکائے...... نیم تاریکی میں...... سب سے الگ ہو کر...... جولاہا ہو کر...... کہ جولاہے اسی لئے تھوڑے سے سادہ ہوتے ہیں کہ وہ دنیا جہان سے کٹ کر اپنی کوٹھڑی میں کھیس بُنتے رہتے ہیں اور انہیں باہر کی کوئی خبر نہیں ہوتی...... وہیں قید رہتے ہیں...... لاعلم رہتے ہیں...... تو میں نے شمشال کا جو کھیس بُنا تھا وہ یہاں پہنچ کر...... اُدھڑنے لگا تھا...... اس کے دھاگے لٹکنے لگے تھے اور وہ ایک تھرڈ ریٹ ہوٹل کی راہداری میں مدتوں سے بچھے کسی غالیچے کی طرح بدرنگ اور بوسیدہ نکلا تھا......

میں لاہور واپس جا کر اسے اپنی سٹڈی میں بچھا کر...... اسے دیکھ کر رنگوں اور بوٹوں کا کوئی سفری قصہ بیان نہیں کر سکتا تھا......

یہ کیسا شمشال تھا......

یہ کیسا بدرنگ اور بوسیدہ کھیس تھا......

"پکچر پکچر" بچے منڈیر سے جھانکتے...... ناکیں پونچھتے شور مچاتے ہمارے اوپر بھاگتے چلے جاتے تھے......

اس لمحے ایک عجیب سا خیال آیا...... بہت ہی عجیب سا خیال...... کہ اتنے دشوار اور جان لیوا راستوں اور شگاف دار پلوں پر سے گذر کر یہ چھوٹے چھوٹے بچے یہاں شمشال میں کیسے پہنچ گئے...... یہ یقیناً آسمان سے تو نہیں ٹپک پڑے...... یہاں آئے ہیں تو چل کر آئے ہوں گے تو کیسے آئے ہوں گے...... اور فوراً ہی میں نے اپنی دانش پر ماتم کیا...... اور یہ ماتم پہلی بار تو نہیں ہو رہا تھا کہ میری دانش ایسی تھی کہ ہر روز ایک کربلا بپا کرتی تھی...... بھلا انہوں نے کہاں سے آنا ہو گا...... بابا یہ یہیں پیدا ہوئے ہوں گے...... بلکہ ہوئے ہوں گے نہیں...... ہوتے ہوں گے...... جیسا کہ دنیا بھر میں ہوتے ہیں......

"پکچر پکچر......" ان کی ان تھک گردان ختم ہونے میں نہ آتی تھی اور ہم ان کے سروں کے نیچے چلتے تھے......

اس وادی میں...... سال بھر میں...... محدودے چند سیاح ہی قدم رکھتے ہوں گے اور وہ یہاں پہنچ کر فوری طور پر اپنے کیمرے نکال کر ان اولین شمشالی بچہ لوگ کی تصویریں اتارنے لگتے ہوں گے...... اسی لئے یہ بچہ لوگ حیران ہو رہے تھے کہ یہ کیسے اجنبی ہیں کہ سر جھکائے چلتے جاتے ہیں اور اپنے کیمرے ہم پر مرکوز نہیں کرتے......

"پکچر پکچر......"

راہبر' بیگ' مہربان...... ہمارا بوجھ اٹھائے' سر جھکائے ایک منڈیروں کی جانب اٹھتی ہوئی پگڈنڈی پر اُٹھے...... اوپر گئے اور پھر اوجھل ہو گئے......

"انکل...... ادھر سے اُوپر جائیں گے......" قدرت رکا۔ اپنے رک سیک کو کمر پر کھسکا کر اُسے سیدھا کیا اور پھر اُس پگڈنڈی پر پاؤں جما کر اوپر منڈیر تک پہنچا...... پھر اپنا ہاتھ نیچے کیا تاکہ میں اسے تھام کر اوپر آسکوں...... اس کے ہاتھ میں رجب کی گرفت تو نہ تھی' جوانی کی نرمی مگر قوت تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے آپ کو سنبھالتا اوپر آگیا۔

"شمشال کا زرد جھماکا...... سرسوں بھری وادی اور چینی شہزادیاں"

اوپر آگیا تو یکدم ایک جھماکا سا ہوا۔ میں اپنے آپ کو تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میرے ساتھیوں کے چہرے زرد ہو گئے۔ ابھی وہ ڈھلتی دھوپ میں تھے اور ابھی ایک بہاریہ زردی میں ان کا رنگ بدل گیا۔ وہ پیلاہٹ کے روپ میں رنگے گئے کیونکہ ہم سب ایک ناقابل بیان پیلاہٹ کے منظر میں آگئے تھے۔ جیسے کسی سٹیج پر اداکاری کرتے ہوئے روشنیاں تمام کی تمام زرد ہو جائیں تو اداکار بھی زرد ہو جاتے ہیں۔ ایک وسیع زرد منظر تھا' جو پھیلتا جاتا تھا۔ شمشال وہائٹ ہارن پر سورج ڈوبتا تھا اور زردی میں نہائی ہوئی ایک وادی میری نظروں کے سامنے ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی مانند زندہ ہو رہی تھی۔ زندہ ہو رہی تھی اور اس میں زندگی کا شور تھا' آوازیں تھیں' کھیتوں کی منڈیروں پر بھاگتے ہوئے بچے تھے اور یہ کھیت سرسوں کے تھے۔ کوئی درخت نہ تھا۔ کوئی جھاڑی نہ تھی جو اس منظر میں رکاوٹ ہوتی۔ صرف سرسبز کھیت تھے اور ان میں سرسوں پھولتی تھی اور ان کھیتوں میں جو شمشالی لڑکیاں جھکی تھیں' وہ سر اٹھا کر ہمیں دیکھتی تھیں تو وہ بھی زرد تھیں۔ جیسے چینی شہزادیاں ہوتی ہیں اور زرد ہوتی ہیں تو اس کھیس میں پیلے پھول کاڑھتی تھیں جسے میں بدرنگ اور اُدھڑا ہوا سمجھ بیٹھا تھا۔

دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں پوشیدہ' سرسوں کی زردی میں رنگی ہوئی ایک وادی...... جس میں زندگی تھی۔

یہاں سب سے بڑی حیرت ہی یہی تھی کہ یہاں پہاڑوں کے اندر...... چین کی سرحد کی قربت میں ایک وادی تھی' پوشیدہ...... جس میں زندگی تھی۔

خواتین' جو خوش شکل اور خوش لباس تھیں۔ قدیم طرز کی ٹوپیوں میں' کھیتوں میں کام کرتی اور اپنے دور افتادہ دیار میں اجنبیوں کی آمد سے پُر تجسس ہوتیں۔ اپنے آپ کو اس

وادی کی مانند پوشیدہ بھی رکھتیں اور پھر ظاہر ہو کر ہمیں بھی تکتیں۔ کھیتوں میں پانی لگاتے...... گوڈی کرتے اور رات کے چولہے کے لیے سرسوں کا ساگ بھی توڑتی۔ خوش شکل اور خوش لباس حیرتیں......

ایک مختصر اور دنیا جہان سے چھپی ہوئی جنت ارضی...... جو زرد تھی۔

ایک پوشیدہ راز جس کا چہرہ...... جب میں نے اسے دیکھا تو زرد تھا۔

قدرت ہمارے آگے آگے چل رہا تھا اور کھیتوں میں کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کو سلام کر رہا تھا۔ وہ اس وادی کا بیٹا تھا اور ایک مدت کے بعد واپس آیا تھا۔

کبھی کھیت میں جھکی کوئی عورت اپنی ٹوپی درست کرتے' لباس سنبھالتی اٹھتی اور قدرت کے پاس آکر ذرا جھکتی' اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے چومتی اور پھر گلے لگا کر حال پوچھتی۔

وادی کے بلند کناروں پر جن کے نیچے دریا کی گزرگاہ تھی' پتھریلے گھر جمع تھے۔ مختصر صحن تھے اور ان میں پھلدار درخت تھے۔

وادی کے کھیتوں کے درمیان کوئی آماجگاہ نہ تھی۔ درخت بھی نہ تھے۔ البتہ ایک دور سے نظر آتی خوش نما عمارت تھی جو کہ مقامی جماعت خانہ تھا۔

میں نے ایک عرصے سے پانی نہیں پیا تھا اور میرا حلق پہاڑوں کی بلندی سے خشک ہو رہا تھا۔ "قدرت پانی مل سکے گا؟"

اس نے سر ہلایا اور پگڈنڈی سے ہٹ کر ایک مکان کی طرف گیا جو شاید اس کے سسرال کا تھا۔ اس نے کسی کو پکارا تو اس کی بیوی قدرت ایسے ایک خوش شکل بچے کو اٹھائے یکدم دروازے میں سے نکلی اور ہمیں دیکھ کر جھجک گئی۔ اس کی آنکھوں میں جدائی کی پیاس تھی جسے بجھانے کے لیے اس نے بچے کو آگے کیا۔ قدرت نے اسے اٹھا کر لپٹایا اور چوما اور پھر اپنی بیوی سے کچھ کہا اور بار بار کہا۔ وہ اسے پانی لانے کو کہتا تھا اور تاکید کرتا تھا کہ گلاس صاف ستھرے ہوں۔ یہ ہم نے اس کے لہجے سے جان لیا۔

پانی سرد اور اچھے ذائقے والا تھا اور ہم اس کے گھونٹ بھر کر جو نڈھال تھے' اب کچھ نہال ہو گئے...... ہماری آنکھیں کھل گئیں۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ شمشال ان موسموں میں پنجاب کی طرح بسنتی ہو جاتا ہے...... پہلے

پیراہن اوڑھ لیتا ہے۔

یہ چین کی قربت میں تھا' اس لیے بھی زرد تھا۔

چنانچہ یہ زرد چینی شہزادیوں کے لبادے تھے جو سرسوں کی صورت شمشال کے کھیتوں میں ہر سُو بچھے ہوئے تھے۔

سورج شمشال وہائٹ ہارن کی سفیدی اور سردی کے اندر تحلیل ہو کر بجھتا جاتا تھا اور سرسوں کے کھیتوں کی زردی شوخ ہوتی جاتی تھی۔

یہ زرد جھلک منظر عجیب تھا۔ اس کی سرد مہک میں ایک تنہا مہک تھی جو ہر سُو اڑتی پھرتی تھی......

مجھے شرمندگی ہوئی کہ میں نے شمشال کے کھیس کو بے رنگ سمجھا تھا۔

میں اگر دنیا کی تنہا ترین جگہ پر خوشی تلاش کرنے آیا تھا تو اس لمحے وہ مجھے مل گئی تھی۔

لیکن ایک اور یکتا مسرت میری منتظر تھی۔

جب ہم کھیتوں کی منڈیروں پر چلتے تھے...... شمشال کی وادی کے کھیتوں میں کام کرنے والوں اور چوکور روشندانوں سے جھانکتے وہاں کے باسیوں کی نظروں کے فوکس میں تھے اور مسرت کے ان لمحوں میں ڈوبتے ابھرتے' چلتے جاتے تھے تو میں نے دیکھا کہ گندم کے ایک ہرے بھرے کھیت کے کنارے چند لوگ کھڑے ہیں۔

ہم ان کے قریب پہنچے تو ان میں سے ایک شخص آگے آیا۔ ڈھلتی دھوپ میں اور سرسوں کی زردی میں اس کا چہرہ بھی زرد مسکراہٹوں سے روشن ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گوٹے کناری کا ایک چمکیلا ہار لٹکتا تھا۔ وہ آگے آیا اور ہار میرے گلے میں ڈال دیا

"ہم آپ کو شمشال میں خوش آمدید کہتے ہیں۔"

"شکریہ......" میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے سوا اور کیا کہوں۔

"ہر برس یہاں تک خبر پہنچتی تھی کہ اس بار آپ آ رہے ہیں اور ہم انتظار کرتے تھے۔ اس بار آپ واقعی پہنچ گئے لیکن ہمیں اصل خوشی اس بات کی ہے کہ آپ یہاں تک ہم شمشالیوں کی طرح پہنچے یعنی پیدل چل کر...... خوش آمدید......"

ان بھلے لوگوں میں گائیڈ عزیز اور سکول ٹیچرز کے علاوہ اہل شمشال کے کچھ نمائندے

تھے۔ کچھ نوجوان طالب علم تھے۔

یہ چمکیلا بھڑکیلا ہار اگر کوئی لاہور میں میرے گلے میں ڈالنے کی کوشش کرتا تو میں تشدد پر اتر آتا کہ یہ بہت ہی چمکیلا اور بھڑکیلا تھا۔

لیکن یہاں شمشال میں...... یہ ایک اعزاز تھا جسے وصول کرتے ہوئے میں نے اس لمحے کی نسبت زیادہ فخر محسوس کیا جب صدر پاکستان نے حسن کارکردگی کا تمغہ میرے گلے میں ڈالا تھا۔ یہ صدارتی ایوارڈ ایک ایسا اصطبل تھا جس میں عربی گھوڑے اور خچر ساتھ ساتھ باندھے جاتے ہیں اور دن بہ دن خچروں کی تعداد ہوتی چلی جاتی ہے لیکن اس بلند پہاڑوں میں گم نامعلوم اور فراموش کردہ وادی میں ایسا اعزاز ہر کسی کو نہیں ملتا۔ صرف ایسے خچروں کو ملتا ہے جو اپنی ہٹ دھرمی سے وہاں پہنچتے ہیں اور پھر عربی گھوڑے ہو جاتے ہیں۔

"آپ تھکے ہوں گے۔ ابھی ریسٹ ہاؤس جا کر آرام کریں، ہم شام کو آئیں گے۔"

ایک بھرے بدن کی خاتون حیرت سے تک رہی تھی کہ یہ اجنبی کون ہیں جنہیں ہماری وادی میں خوش آمدید کہا جا رہا ہے۔

"قدرت...... گیسٹ ہاؤس کہاں ہے، کتنی دور ہے؟" اور یہ سوال میں متعدد بار پوچھ چکا تھا۔

قدرت نے پھر وہی جواب دیا "بہت تھوڑا دور ہے۔ وادی کے آخر میں ہے۔ کھیتوں کے اختتام پر۔ تھوڑا دور ہے۔"

میں نے اس دوران فیصلہ کر لیا تھا کہ وادی میں...... کسی کھیت کے کنارے کیمپ کرنا مناسب نہیں۔ یہاں آبادی ہے، بچے ہیں، خواتین ہیں اور ان کے درمیان ایک خیمہ نگاہوں کا مرکز بنا رہے گا اور ہمیں دیگر مسائل بھی ہوں گے۔ اس لئے رجب کے مشورے کے مطابق ریسٹ ہاؤس ہی مناسب رہے گا۔

ہم چلتے گئے۔

وادی کے آخر میں...... گندم کی ہریاول اور سرسوں کی زردی کے آخر میں ایک راستہ بلند ہوتا تھا۔ ہم سر جھکا کر اس پر چڑھتے گئے اور ذرا اوپر مجنون خان ہمارا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے گھر کی پشت پر دو کمروں اور ایک برآمدے کا اس کا ٹورسٹ گیسٹ ہاؤس تھا جس کے آگے گندم کا ایک چھوٹا سا کھیت...... وادی سے بلند تھا۔

"میں دنیا کی تنہاترین جگہ پہنچ گیا تھا"

شام ہونے والی تھی۔

مجنون...... ایک دھیمے مزاج کا سکول ٹیچر تھا۔

ہم برآمدے میں گئے اور اس نے اپنے گیسٹ ہاؤس کے دونوں کمروں کے دروازے کھول دیئے۔ پہلے کمرے میں دو بستر تھے۔ فوم کے گدّے اور ستھری رضائیاں تھیں۔ ایک کھڑکی تھی جو وادی پر کھلتی تھی۔ فرش پر یاک کے بالوں کے سیاہ اور سفید نمدے تھے۔

اور ایک غسل خانہ تھا جس میں پانی کا ایک ڈرم تھا اور ایک حیرت انگیز شے تھی یعنی ایک کموڈ تھا۔

ایک ایسی دور افتادہ وادی میں ایسی سہولتوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر ایک کموڈ تو سکس سٹار سہولت تھا۔

"یہ یہاں...... یہاں کیسے آ گیا مجنون صاحب؟"

"صاحب یہ کموڈ...... یہ تو صاحب پیٹھ پر بوجھ کر کے ادھر تک لایا ہے۔"

دوسرے کمرے میں ایک بستر تھا اور ایک روشندان تھا۔

مجنون حقیقی معنوں میں ایک سمارٹ شخص تھا۔ اس کی صحت تو قدرے مجنونانہ تھی لیکن وہ تازہ شیو شدہ تھا اور استری شدہ قمیض اور پتلون میں ملبوس تھا۔

"اس کا کرایہ کیا ہو گا؟" میرے اندر کا سیاح ذرا احتیاط پسند تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا صاحب......" وہ انکساری سے بولا۔ "آپ اگر پیدل ہماری وادی میں پہنچ گیا ہے تو آپ ہمارا مہمان ہے۔"

"پھر بھی...... صرف معلومات کی خاطر......"

"ادھر تو سال بھر میں پانچ' سات ٹورسٹ سے زیادہ نہیں پہنچتا۔ ہم ان سے کمرے کا تین سو روپے لیتا ہے لیکن آپ مہمان ہیں۔"

مجھے تسلی ہو گئی کہ اگر ہم کسی وقت مہمان نہیں بھی ہوتے تو یہ کرایہ افورڈ کر سکتے تھے۔ ویسے مجنون کے گیسٹ ہاؤس کی عافیت کے لیے...... دنیا کی تنہا ترین جگہ میں۔ فوم والے بستروں' ستھرے کمبلوں اور ایک کموڈ کے لیے یہ کرایہ تو مونگ پھلی کے دانوں کے برابر تھا اور پھر برآمدے میں بیٹھیے تو پوری شمشال وادی نظروں کے سامنے بچھتی تھی اور وہاں اس روز آپ تیس کلو میٹر سے زیادہ پہاڑی مسافت طے کر کے بھی پہنچے ہوں۔

پورٹروں نے ہمارا سامان برآمدے میں ڈھیر کر دیا۔

میں نے اپنا سلیپنگ بیگ کھول کر بستر پر بچھا دیا اور کھڑکی کھول دی۔ اگر اس لمحے میں اس پر دراز ہو جاتا تو فوری طور غتر بود ہو جاتا' اس لیے میں نے اپنے جوگرز اتار کر چپل پہنی اور باہر آکر برآمدے میں بیٹھ گیا۔

شمشال کی مختصر وادی اندھیرے میں جا رہی تھی۔ کہیں کہیں بلب روشن ہو رہے تھے۔ شمشال میں ایک ٹریکٹر اور دو چار بائیسکلوں کے علاوہ کسی حد تک بجلی بھی تھی۔

کسی حد تک اس لیے کہ امین آباد گلیشیر کے دہانے پر ایک چھوٹا سا بجلی گھر بھی تھا۔ گرمیوں میں اوپر گلیشیر پگھلتا تو نالہ رواں ہوتا اور وہ بجلی گھر بھی رواں ہو جاتا اور بجلی کی سپلائی شروع ہو جاتی اور جونہی سرما کا آغاز ہوتا اور ہر شے منجمد ہو جاتی تو بجلی گھر بھی بیکار ہو جاتا اور اہل شمشال سردیوں میں مکمل تاریکی میں چلے جاتے۔

لیکن ابھی موسم گرما کا آغاز ہو رہا تھا۔

کہیں کہیں بلب روشن ہو رہے تھے۔ یہ اکا دکا ستارے تھے جو شمشال کی اترتی رات میں اس کی گندم اور سرسوں میں کہیں کہیں ٹمٹما رہے تھے۔

مجنون نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ گیسٹ ہاؤس بجلی سے بھی آراستہ پیراستہ ہے' برآمدے کا اکلوتا بلب روشن کر دیا۔

"مجنون بھائی...... فی الحال مجھے اندھیرے میں رہنے دو۔ تمہارے بلب سے ہم روشن

ہو جاتے ہیں اور وادی دکھائی نہیں دیتی۔"

مجنون نے جھک کر "جی سر" کہا اور بلب گل کر دیا۔

شمشال کی پوری وادی پھر سے ٹمٹمانے لگی۔

وہ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے کے آگے بچھی ہوئی تھی...... جیسے صرف میرے لیے نمائش کے لیے سجا دی گئی ہو۔

سرسوں کی زردی بجھ چکی تھی۔ گندم کے بوٹے ہریادل سے نیم سیاہی میں جا رہے تھے۔ ان کے درمیان میں ایک شمشالی عورت پشت پر لکڑیاں اٹھائے جنگل سے اتر کر اپنے پتھریلے گھروندے کو لوٹ رہی تھی۔ وہ کسی بلب کی زد میں آتی تو دکھائی دیتی اور پھر اندھیرے میں گم ہو جاتی۔

وادی پر...... ایک مہارشی کی طویل تپسیا کے بعد اس کی روح میں جو شانتی گھلتی ہے' ویسا سکون اتر رہا تھا۔ اس پر تخلیق کے روز اول کی پوتر تا شبنم کی مانند بے آواز گرتی تھی۔

اور یہ میرے وجود میں بھی گرتی تھی...... بے آواز......

میں بالآخر شمشال پہنچ گیا تھا۔

میں دنیا کی تنہا ترین جگہ پر پہنچ گیا تھا۔

میں اپنی تھکاوٹ بھول گیا تھا...... میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔

"مجنون گیسٹ ہاؤس اور ایک شبِ شمشال"

گیسٹ ہاؤس کے مختصر چوبی برآمدے میں اب وہ تنہا بلب پھر سے روشن ہو چکا تھا۔

رات ہو چکی تھی۔

وہ بھیگتی تھی...... سرد ہوتی تھی......

اور محفل جمی تھی......

بقاء ایک سگھڑ کوہ نورد...... برآمدے کے ایک کونے میں اپنا باورچی خانہ قائم کر کے اُس سٹوو کو جلانے کی سعی کر رہا تھا جو بار بار بھڑکتا تھا اور فوراً ہی بجھ جاتا تھا۔ قدرت بھی سٹوو پر جھکا کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے کسی پرزے میں کوئی نقص، کوئی خلل تھا کہ اس کا شعلہ...... بڑھاپے کے شعلے کی طرح کبھی کبھار بھڑکتا تو تھا لیکن فوراً بجھ جاتا تھا۔

رجب بھی آ چکا تھا...... ٹویڈ کے ایک سمارٹ کوٹ اور نیلی جین میں بانکا بنا ہوا اور اس کی جین کے پائنچے پر "میڈان پیرس" صاف پڑھا جاتا تھا۔

میں نے رجب کو...... جب مجنون نے برآمدے کا بلب گُل کیا تھا، نیچے کھیتوں میں سے گیسٹ ہاؤس کی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔

گیسٹ ہاؤس...... جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے، ذرا بلندی پر واقع تھا، اس لیے اس کے برآمدے سے وادی شمشال جتنی بھی تھی، کوئی ڈیڑھ کلومیٹر چوڑی...... ایک جانب گہرائی میں دریا کی گزرگاہ اور کناروں پر گاؤں کے گھر اور دوسری جانب پہاڑوں کی اونچی فصیل اور لمبائی میں شاید دو کلومیٹر...... اور ہم اس کی آخری حد پر تھے اور یہاں سے وادی کو اپنے قدموں میں بچھا دیکھتے تھے اور یہاں سے ہم وادی کے ہر کھیت پر نظر رکھ سکتے تھے کہ ان میں

کتنی خواتین چارہ کاٹ رہی ہیں...... ساگ توڑ رہی ہیں یا پانی لگا رہی ہیں اور مرد کتنے ہیں جو گوڈی میں مصروف ہیں یا مینڈھیں درست کر رہے ہیں اور کتنے بچے ہیں جو اپنی ماؤں کی گود میں ہُمکتے دودھ پینا چاہتے ہیں...... ہر کچے مکان میں سے جو شمشالی باہر آتا تھا، وہ ہماری نظروں میں آتا تھا لیکن اب نہیں...... جب ابھی شام اترتی تھی اور کچھ نظر آتا تھا اور رجب بھی تبھی آیا تھا...... اسی لیے میں نے اسے دور سے سپاٹ کر لیا تھا...... وہ سر جھکائے نہایت دھیرج سے لمبی لمبی پلانگیں بھرتا چلا آتا تھا جیسے میرے اباجی اپنی طویل قامتی کے وقار کے ساتھ ہمیشہ سر جھکائے چلتے تھے۔

سٹوو کا شعلہ ایک مرتبہ پھر بھڑکا...... اور پھر بجھا نہیں تواتر سے جلتا رہا۔ "چینی چاول بنائیں گے سائیں۔" بقاء جو دم روکے بیٹھا تھا، سٹوو کے جلنے سے خوش ہو گیا "اور اس کے ساتھ رشین سلاد پیش کی جائے گی۔"

عزیز بھی آ چکا تھا...... فارغ البالی کی قربت میں دمکتے ہوئے مہاندرے والا شخص......

مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں واقعی شمشال پہنچ چکا ہوں۔

جس شخص، جس مقام کے بارے میں آپ جتنا زیادہ پڑھتے ہیں، جتنا سوچتے ہیں، جتنے خواب دیکھتے ہیں، اُسے مل کر...... وہاں پہنچ کر بھی یقین نہیں آتا کہ ایسا ہو گیا ہے۔

بے یقینی کی یہی حیرت انگیزی ہے جو کوہ نوردی میں کسی تنہا اور نامانوس مقام کو ایک انوکھا تجربہ بنا دیتی ہے۔ میٹھے پانی کے تالاب میں گرم چشمہ میں چونکہ گمان نہیں ہوتا کہ پانی اتنے شیریں ہو سکتے ہیں...... ان میں بھیگنے سے بدن کے روئیں زندہ ہوتے ہیں...... اس لیے یقین نہیں آتا کہ آپ وہاں پہنچ چکے ہیں۔

اگر یقین آ جائے تو پھر تکبّر بھی آ جائے کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں اور اگر تکبر آ جاتا ہے تو منظر کا حسن رخصت ہو جاتا ہے اور صرف ذات کا غرور باقی رہ جاتا ہے۔

شمشال کا جو کھیس میرے سامنے بچھا تھا، اس میں بجلی کے بلب یوں ٹمٹماتے تھے جیسے اس پر مکیش کا کام کیا گیا ہے۔

"کل اوپریاز غیل کی چراگاہ میں جائیں گے تارڑ صاحب۔"

شمشال کے راستے میں ہم نے طے کیا تھا کہ ہم اس وادی میں کم از کم تین دن تو

ٹھہریں گے اور کسی ایک روز وہاں سے آگے کسی بلند چراگاہ میں جائیں گے۔

"کتنی مسافت ہوگی؟"

"کوئی چار پانچ گھنٹوں میں ادھر پہنچیں گے اور تین چار گھنٹوں میں اتر آئیں گے۔"

"چڑھائی ہے؟"

"ہاں...... ہے۔"

"نہ......"

"آپ کا کیا مطلب ہے کہ "نہ......" آپ بتائیں کیا مطلب ہے؟" رجب ذرا پریشان ہوا کہ بلند چراگاہ میں جانے کا فیصلہ تو ہو چکا تھا۔

"رجب شاہ...... ہم کہیں نہیں جائیں گے۔ یار بہت تھک چکے ہیں۔ اسی گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھ کر شمشال کو دیکھیں گے۔ کہیں نہیں جائیں گے۔ سب یہیں بیٹھے رہیں گے۔"

"میں سمجھتا ہوں صاحب......" اس نے حلق سے ایک تجربہ کار گہری آواز "آہم" ایسی نکالی "میں پہلے سے جانتا تھا کہ آپ بہت تھک جائیں گے۔ یہاں تک آتے آتے...... یہی بہت ہے کہ آپ یہاں پہنچ گئے۔"

"انسان کو لالچ نہیں کرنا چاہیے رجب۔ خاص طور پر ایک کوہ نورد کو...... وہ جہاں بھی پہنچتا ہے' اس کے آگے بہت سے ممکنات ہوتے ہیں۔ وہ کہاں تک جائے گا۔ اسے لالچ نہیں کرنا چاہیے......"

"ہاں صاحب۔ ہم کوہ پیا بھی اس اصول پر عمل کرتے ہیں۔ اگر چوٹی کے قریب پہنچ کر ہمت کم ہو جائے' جواب دے جائے اور زندگی جانے کا خطرہ ہو...... بے شک چوٹی سامنے نظر آتی ہو لیکن اس کے باوجود ہم لالچ نہیں کرتے کہ وہاں پہنچ جائیں۔ ہم کہتے ہیں کہ زندہ رہیں گے تو پھر واپس آسکتے ہیں...... تو آپ بھی جب دوبارہ آئیں گے تو پھر آگے جا سکتے ہیں' لالچ نہیں کرنا چاہیے۔"

"ابھی یہاں سے آگے بھی کوئی مقام ہے سائیں" ندیم ایک اندھیرے گوشے میں سے باہر آگیا۔ وہ ایسے موقعوں پر ہمیشہ کسی اندھیرے گوشے میں سے ہی باہر آتا

تھا۔ "سائیں میں تو سمجھتا تھا کہ یہ دنیا کا آخر ہے...... آگے بھی کچھ ہے؟"

"آگے تو ہمارا زندگی ہے......" رجب ایک مرتبہ پھر اپنے مضبوط دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "آگے شمشال پاس ہے جہاں ہماری چراگاہیں ہیں۔ اس وقت شمشال کے آدھے لوگوں سے زیادہ لوگ اُدھر اوپر ہیں۔ اسی لیے شمشال میں کوئی مویشی نظر نہیں آتا۔ کوئی گائے' بکری' یاک نظر نہیں آتا۔ دو چار گائے ہوگا' صرف چائے کے دودھ کے لیے باقی سب اوپر جا چکا ہے۔"

"یہ کب اوپر جاتے ہیں؟"

"مئی کے مہینے میں ہمارے لوگ قافلوں کی صورت میں اوپر جانے لگتے ہیں۔ یہاں بہت میلہ لگتا ہے' خوشی ہوتی ہے۔ یاک اور دوسرے مویشی ہانکتے ہوئے لوگ...... بوجھ اٹھائے...... اپنے بچوں کو اٹھائے روانہ ہوتے ہیں اور تین روز میں اوپر پہنچتے ہیں۔ اکتوبر کے مہینے تک اوپر بیٹھتے ہیں اور پھر سردیوں کا آغاز ہو جاتا ہے تو ان کی واپسی ہوتی ہے اور ان کی واپسی پر بھی بہت رونق ہوتی ہے۔ بہت جشن ہوتا ہے۔"

"اگر میں کبھی مئی کے مہینے میں ادھر آجاؤں تو کیا کسی یاک قافلے کے ہمراہ اوپر جا سکتا ہوں؟"

"ہاں' کیوں نہیں۔ آپ ضرور آؤ...... میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"اور راستہ کیا ہے؟"

"راستہ......" رجب نے کچھ دیر اپنی ٹھوڑی پر کھجلی کی۔ "تھوڑا مشکل ہے...... لیکن آپ کو یاک پر بٹھا کر لے جائے گا...... جدھر سے یاک کاروان جاتا ہے' ادھر کا راستہ تھوڑا مشکل ہے اور جدھر سے دو چار لوگ اکیلا جاتا ہے' وہ مختلف ہے اور بہت زیادہ دشوار ہے۔"

"راستہ تھوڑا مشکل ہے...... کتنا مشکل ہے؟"

شمشال سے واپسی پر...... گلگت میں آصف کے گھر ایک محفل میں' میں نے جان موک سے تذکرہ کیا' کم اونیل کا خاوند اور "لونلی پلینٹ" کی پاکستان ٹریکنگ گائیڈ کا مصنف......

"راستہ کتنا مشکل ہے؟" میں نے اس سے دریافت کیا کہ شمشال درے تک کا راستہ کتنا

مشکل ہے......

"تم نے پہلے دن روڈ کیمپ کے بعد کی چڑھائی کو کیسا پایا؟"

"نہایت خوفناک......"

"تم اسے......اس راستے کی خوفناکی اور خطرناکی کو دس میں سے کتنے نمبر دو گے؟"

"یقیناً دس میں سے سات یا آٹھ نمبر دوں گا۔"

جان موک ہنسنے لگا "تو پھر شمشال پاس کا راستہ تمہارے سکیل میں ہی نہیں آسکتا......"

"لیکن رجب شاہ کہتا تھا کہ یہ راستہ یاک پر سوار ہو کر طے کیا جاسکتا ہے۔"

"نہ ان شمشالیوں کی باتوں میں نہ آنا۔ جہاں ہموار میدان ہوگا' وہاں وہ آپ کو یاک پر بٹھا دیں گے اور جہاں استرے کی دھار پر چلنا ہوتا ہے تو وہاں تو صرف آپ کو ہی چلنا ہوتا ہے اور ان جگہوں پر تو بیچارے یاک بھی مشکل سے چلتے ہیں اور کبھی گر بھی جاتے ہیں۔ یاک تو سنبھل بھی جاتے ہیں' انسان ان راستوں پر سنبھل نہیں سکتا......اگر وہ شمشالی نہیں ہے تو......"

لیکن اس کے باوجود میں نے خواہش کا ایک بُوٹا اپنے اندر لگا لیا کہ اگر میں کبھی پھر سے جوان ہو گیا تو درہ شمشال کا سفر ضرور کروں گا۔

میں اس قسم کے بوٹے اکثر اپنے اندر لگاتا رہتا ہوں۔

اور بے شک ان میں سے بیشتر پروان نہیں چڑھتے لیکن کوئی ایک بُوٹا ہوتا ہے جو جوان ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر......یہی شمشال کا بوٹا۔

تو بوٹے لگانے میں کیا حرج ہے؟

"تارڑ صاحب......آپ شمشال پاس پہنچ کر دنیا بھول جائیں گے۔" قدرت نے میرے بوٹے کو کچھ کھاد مہیا کی۔ "ادھر اوپر جو ہماری چراگاہ ہے' شورت یوئی نام کی......وہاں سرسبز میدان ہیں اور پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر اور وہاں جھیلیں ہیں۔ منگلیک سر اور کور سر کی چوٹیاں ہیں اور دنیا کی سب سے بڑی تنہائی ہے......آپ دوبارہ یہاں نہیں آئیں گے۔ جانا ہے تو ابھی آگے چلے جائیں......"

ابھی ہم نے صدق دل سے فیصلہ کیا تھا کہ کوہ نوردوں کو لالچ نہیں کرنا چاہیے اور ابھی ہم پھر سے بے ایمان ہو رہے تھے۔ درہ شمشال کا لالچ غلبہ پا رہا تھا اور دل ہی دل میں حساب کتاب ہو رہا تھا کہ اگر ہم شمشال میں دو دن قیام کریں اور پھر تین دن میں شمشال پاس اور پھر واپسی......کیونکہ شمشال آنا اور پھر شمشال پاس نہ جانا تو زندگی کو گویا بیکار کرنا تھا لیکن اس میں ایک بنیادی رکاوٹ تھی۔ ہم سب کی فنانشل پوزیشن ایسی نہ تھی کہ ہم مزید چھ سات روز کے لیے پورٹر ہائر کر سکتے اور نہ ہی ہمارے لیے اتنے دنوں کی خوراک تھی ورنہ دیوانگی کوہ نوردی اس آتشِ شمشال پاس میں بھی بے خطر کود پڑتی۔

لیکن میں نے شمشال کی اس رات میں اس امکانِ آتشِ شمشال پاس کو مکمل طور پر خارج نہیں کیا......اسے سنبھال کر رکھا۔ کیا پتہ کوئی صورت نکل آئے۔ کون جانے کوئی سبیل بن جائے۔

قدرت سٹوو بھڑکا کر پھر آتشِ شمشال پاس بھڑکا کر......تھوڑی دیر کے لیے نیچے گاؤں میں چلا گیا تھا۔ اس نے اپنے عزیزوں سے ملنا تھا' جہاں خوشی کی آمد ہوئی تھی وہاں اس خوشی میں شریک ہونا تھا اور جہاں اس کی عدم موجودگی میں غمی نے ڈیرے ڈالے تھے' وہاں کسی کے لیے دعا کرنی تھی اور اپنی بیوی کی جدائی کو بھی وصل میں بدلنا تھا۔

مجنون خان بہت کم بولتا تھا۔ شاید مجنون ہمیشہ کم بولتے ہیں اور اگر کبھی پکارتے ہیں تو صرف لیلیٰ لیلیٰ پکارتے ہیں اور مجنون کی لیلیٰ تو یہ پڑوس میں رہتی تھی کہ گیسٹ ہاؤس سے ملحقہ اس کا آبائی شمشالی طرز کا گھر تھا۔

عزیز کسی پاکستانی کوہ نورد کے قصے بیان کر رہا تھا جو سنولیک کی جانب سے ایک نہایت دشوار ٹریک پر سفر کرتے' اس کی راہبری میں شمشال اترا تھا اور ایک نہایت برفانی اور تنہا وسعت میں جہاں موت ان دونوں کو پکارتی تھی' اس نے بلند آواز میں چیخنا شروع کر دیا تھا اور رونا شروع کر دیا تھا اور کہا تھا کہ میں تو فرشتوں کو آوازیں دے رہا ہوں کہ میں مرنے والا ہوں' میری مدد کو آؤ۔

مجھے اپنی ٹی شرٹ میں خنکی محسوس ہونے لگی اور میں نے ٹریک سوٹ کی جیکٹ پہن کر زپ چڑھالی۔

قدرت بھی واپس آ گیا۔

وہ چین کیا گیا تھا کہ چینی گندم کا شیدا ہو کر آ گیا تھا۔

وہ شیدا ہوا تو کچھ اور بھی شیدائی ہو گئے۔

وہ ہوا کافر...... تو ہم بھی کافر ہو گئے۔

یہ شمشال میں میری پہلی شب تھی لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سدا سے یہیں مقیم ہوں...... ہمیشہ سے اس گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھتا آیا ہوں۔ برآمدے کا تین تختوں والا چھوٹا سا گیٹ اسی طرح بند نہیں ہوتا کھلا رہتا ہے۔ یونہی ہر شب محفل جمتی ہے اور بقاء ایک کونے میں رات کے کھانے کی تیاری کرتا ہے تو یہ ایک اور شب تھی...... پہلی شب نہیں تھی...... یہی محسوس ہوتا تھا۔

"سائیں بقا......" ندیم حسب عادت ایک اور تاریک گوشے میں سے برآمد ہوا۔

"سائیں تارڑ صاحب ہمیشہ کہتے ہیں کہ آپ کے رک سیک میں سے دنیا کی ہر شے برآمد ہو سکتی ہے......"

"سائیں تارڑ جب موڈ میں ہوں تو اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں۔" بقاء نے پریشر ککر کا ڈھکن اٹھا کر چاولوں کا معائنہ کیا کہ وہ مناسب حد تک چینی ہو رہے ہیں یا نہیں......

"لیکن تم بتاؤ کس شے کو دل چاہ رہا ہے؟ چورن پیش کروں۔ ملتانی حلوہ کھانے کو جی چاہ رہا ہے یا قمیض کا بٹن ٹوٹ گیا ہے' اسے ٹانکنے کے لیے سوئی دھاگہ درکار ہے۔"

"سائیں موسیقی درکار ہے۔" ندیم اٹھا اور بمشکل اٹھا اور بقاء کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ "سائیں شمشال کے جادو میں اگر موسیقی کا سحر تیرنے لگے تو نشہ دو آتشہ ہو جائے گا۔"

"کیا سنو گے؟"

"سائیں کوئی ریشماں...... کوئی استاد جمن...... کوئی اپنی آواز...... بندوبست ہو سکتا ہے؟"

بقاء کی مونچھیں ایک جذبۂ تفاخر میں پھڑکیں لیکن اس نے چہرے پر ایک مصنوعی عاجزی اختیار کر لی۔ "کوشش کرتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے رک سیک کی ایک پاکٹ میں

سے اپنا میوزک سسٹم برآمد کیا۔ چھوٹے چھوٹے سپیکر برآمدے کے کونے میں فٹ کیے...... کوئی تیس چالیس کیسٹیں نکال کر ان کا معائنہ کیا اور پھر ان میں سے ایک کو پلیئر میں دھکیل کر کندھے اچکاتے ہوئے کہا "اب پتہ نہیں اس میں کیا ہے......"

وادیٔ شمشال میں استاد جمن کا راج ہو گیا...... یار ڈاہڈی عشق آتش لائی ہے...... سانوں لگ گئی بے اختیاری......

"جیو بقاء بھائی......" ندیم بے اختیار ہو کر شاید بقاء کو ایک بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا لیکن اس نے مونچھیں پھڑکا کر کہا "پرے پرے......"

یہ کیسے لوگ ہیں......

کنکورڈیا کے راستے میں پائیو کی شام میں ریشماں آ گئی...... وے میں چوری چوری۔

سکردو روڈ پر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی "چن کتھاں گزاری آ رات وے" کی شکایت کرتا تھا۔

سنولیک کے راستے میں مانگو میں سلیم رضا "جان بہاراں" الاپتا تھا۔

اور یہاں شمشال کی رات میں استاد جمن کی گہری اور درد انگیز آواز ہے کہ......

"عشق تو گدا گر کر دیتا ہے' بے اختیار کر دیتا ہے۔"

یہ کیسے لوگ ہیں...... جن کی صدائیں ان وادیوں اور برفانی ویرانوں تک جاتی ہیں۔ جن کے وجود سے بھی وہ واقف نہیں ہوتے اور وہاں وہ راج کرتے ہیں...... ان کی صدائیں پائیو' مانگو اور شمشال کو اپنی راجدھانی بنا لیتی ہیں اور انہیں خبر تک نہیں ہوتی کہ ہمارا راج کن خطوں میں ہے...... وہ ایسے لوگ ہیں۔

اور ہم کیسے لوگ ہیں کہ ان لوگوں کی توقیر نہیں کرتے۔ ٹیلی ویژن ایوارڈز کی تقریب میں ریشماں ہر کس و ناکس کی منتیں کر رہی تھی کہ سائیں ان سکورٹی والوں نے میرا کیمرہ چھین لیا ہے۔ کہتے ہیں سکورٹی کا معاملہ ہے' مانگتی ہوں تو دھکے دیتے ہیں۔ تارڑ جی مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ تصویر کیسے اتارتے ہیں۔ میری بیٹی نے دیا تھا کہ اماں ادھر بٹن دبانا تو فوٹو بنے گا۔ میں نے سکورٹی والوں کی منت سماجت کی تو انہوں نے کہا کہ جناب سکورٹی کا مسئلہ ہے۔ پوری دنیا میں یہ تقریب ٹیلی کاسٹ ہو رہی ہے۔ بہرحال آپ کہتے ہیں تو کیمرہ واپس کر

دیتے ہیں لیکن یہ عورت کیمرہ لے کر کیوں آئی تھی؟ یہ الگ بات کہ اس تقریب میں اسلام آباد کے ایک معزز سیاستدان اور ایم این اے کے غنڈے دندناتے ہوئے آتے ہیں اور فائرنگ شروع کر دیتے ہیں اور انہیں فائرنگ کرنے دی جاتی ہے۔ وہ توڑ پھوڑ کرتے ہیں تو ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ سکورٹی ایک کونے میں کھڑی رہتی ہے۔ اسی ریشماں کو کینسر ہو جاتا ہے اور وہ دہائیاں دیتی ہے کہ سائیں......

ہم ایسے لوگ ہیں۔

چنانچہ استاد جمّن وادیٔ شمشال کی شب پر راج کرتا تھا۔

"سائیں میں تھوڑا رقص کر لوں...... "ندیم جھوم رہا تھا" مجھے حال پڑنے کو ہے......"

ندیم میں منافقت نہ تھی' ابھی وہ تجربہ کار نہیں ہوا تھا۔ اس لیے اپنے دل کی کیفیت بے دریغ بیان کرتا تھا۔ اس کیفیت میں حال تو مجھے بھی پڑنے کو تھا لیکن میں خرانٹ اور تجربہ کار تھا' اپنے جذبات کو دبا کر ناصح بن سکتا تھا۔ "آرام سے بیٹھ کر سنو...... بیٹھ جاؤ۔"

"بیٹھتا ہوں سائیں......" وہ ایک تاریک کونے میں روپوش ہو گیا۔

قدرت کا رف اور کھُف چہرہ بلب کی روشنی میں سرخ ہو تا تھا۔

رجب...... سر جھکائے صرف تب بولتا تھا' جب ہم اسے بلاتے تھے۔

مجنون...... خوش تھا کہ نیچے شمشال ویلی نیند میں تھی اور ہم جاگتے تھے۔

نعمت کریم جو اس گیسٹ ہاؤس کا خادم اعلیٰ تھا' کھیتوں کی تاریکی میں سے اوپر آیا۔

"صاحب کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"خوشی کی تلاش ہی دراصل خوشی ہے"

اور یہ لوگ...... بہت سارے تھے۔

شمشالی نہیں تھے...... کوہ نورد...... نوجوان اور دمکتے ہوئے چہروں والے...... زندگی کی شاندار سٹیج پر پہلی انٹری دینے والے لوگ۔ ان کی آمد سے برآمدہ اور اس کے آگے تاریکی میں گم جو کھیت تھا' بھر گیا۔ بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجھے شرمندگی ہوئی کہ مہمان آئے ہیں اور میں انہیں کہیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا۔

یہ فیصل آبادی کوہ نوردوں کی ایک جماعت تھی۔ صرف ایک بلب کی روشنی میں سب کی پہچان ممکن نہ تھی۔ ان میں سے ایک شاہد تھا جو ان کو شمشال پاس لے جانے کے بہکاوے میں بہکا لایا تھا۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو میرے شمال کے سفرناموں کے شائق تھے اور ان کے بہکاوے میں یہاں تک آ گئے تھے۔

انہوں نے اپنی مہم کا جو پوسٹ کارڈ مجھے دیا' اس سے معلوم ہوا کہ ان میں ذیشان' احسن' عابد' ناصر اور عبدہ بھی تھے۔ وہ شمبر بھی خان کے گھر میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور ان کے ہمراہ بختاور اور رحمت اللہ بھی تھے۔

"ہم سب کل سویرے شمشال پاس کے لیے روانہ ہو رہے ہیں اور وہاں منگلیک سر نام کی ایک چوٹی کو سر کرنے کی کوشش کریں گے۔"

منگلیک سر...... یہ نام میں نے کہیں سن رکھا تھا۔ کہیں پڑھا تھا۔

شاید انہوں نے میرے چہرے سے اس الجھن کو پہچان لیا "سر...... ہم نے شمشال کے راستے میں ایک پتھر پر آپ کے لیے ایک پیغام لکھا تھا۔"

تو یہ وہی کاریگر لوگ تھے جنہوں نے دریائے شمشال کے پہلے پل کے پار ایک پتھر پر

"HELLO CHACHA TARAR, RELAX......MAGLIK SAR EXPO, 99 FSD 15.6.99 11.A.M"

تحریر کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس پل کو اگر چاچا تارڑ پار کرتے ہیں تو انہیں شاباش کی ضرورت ہو گی۔

"اس پیغام کا شکریہ...... اور آپ نہیں جان سکتے کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی لیکن میرا خیال تھا کہ آپ لوگ اب تک آگے شمشال پاس کو جا چکے ہوں گے۔"

"ہم راستے میں گرم چشمہ میں ٹھہر گئے تھے۔ اتنا خوبصورت مقام تھا کہ وہیں ٹھہر گئے تھے اور نہاتے رہے تھے۔ انشاء اللہ کل روانہ ہوں گے۔ شمبر خان کا بیٹا ہمارے ساتھ جا رہا ہے۔"

"میں آپ کے لیے دعا کروں گا...... آپ وہاں جا رہے ہیں جہاں جانے کی میں صرف خواہش کر سکتا ہوں۔"

ان میں سے ایک نوجوان قدرے کچا اور ناتراشیدہ تھا اور میں اس کے سوالوں کو محظوظ ہوتے ہوئے ایک مسکراہٹ کے ساتھ وصول کرتا تھا۔

"کیا آپ واقعی ان جگہوں پر جاتے ہیں جہاں کے آپ سفرنامے لکھتے ہیں۔"

"نہیں...... میں گھر بیٹھے یہ سب کچھ تخیل کی مدد سے لکھتا ہوں...... مثلاً میں شمشال نہیں آیا لیکن اس کے باوجود یہاں کا سفرنامہ لکھوں گا۔"

لاہور واپسی پر میں نے اخباروں میں ایک چھوٹی سی نیوز آئٹم دیکھی "وادیٔ شمشال سے آگے درّہ شمشال میں واقع منگلیک سر نامی چوٹی فیصل آباد کے چند نوجوانوں نے سر کر لی۔" اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بھی ان کے اس بلند فخر میں شامل تھا۔ پھر عبدہ نے خاص طور پر میرے ہاں آ کر اس مہم کی کچھ تصویریں مجھے دکھائیں۔ ان میں سے ایک تصویر ایسی تھی جس نے مجھ پر دہشت طاری کر دی۔ ایک ایسا تنگ چٹانی درہ تھا جس کی چٹانیں نیچے دریائے شمشال میں گرتی تھیں اور ان پر کچھ چیونٹیاں چمٹی ہوئی تھیں جو فیصل آبادی کوہ نورد تھے، میں نے اس تصویر کو دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے لالچ میں آ کر درہ شمشال کا سفر

اختیار نہیں کیا۔

ان نوجوانوں نے چونکہ صبح سویرے شمشال سے نکلنا تھا، اس لیے وہ اسی ایستادہ حالت میں مجھ سے اجازت لے کر چلے گئے۔

بقا کے چینی چاول شاید پورے چین کے لیے تیار ہو رہے تھے...... تیار ہی نہیں ہو رہے تھے۔ استاد جمن کی عشق آتش اگرچہ بہت دیر سے سرد ہو چکی تھی لیکن ندیم ابھی تک سر جھکائے جھوم رہا تھا...... پھر وہ یکدم سر بلند ہوا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بہت دیر سے غور سے دیکھتا رہا اور تب بولا "تارڑ صاحب...... اب تو یہ فضول سا ہار اتار دیں۔"

میں ابھی تک اور جان بوجھ کر شمشال کا وہ چمکیلا استقبالیہ ہار پہنے ہوئے تھا۔

مجھے ہر قسم کے ہاروں سے چڑ تھی۔ میں نے اپنی شادی پر بھی کسی قسم کا کوئی بھی ہار پہننے سے انکار کر دیا تھا اور سرخ گلابوں کا ایک عام سا ہار صرف اس لیے مجبوراً گلے میں ڈالا تھا کہ دیگر باراتیوں میں سے دولہا میاں کی پہچان ہو سکے اور والدہ صاحبہ کی دیرینہ آرزو کی آبدیدہ تکمیل ہو سکے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اکلوتے ماموں جان نے نہایت اہتمام سے ایک گھٹنوں پر دستک دیتا ہوا نویں نکور نوٹوں کا ہار مجھے پہنا دیا تھا جسے میں نے ایک مناسب وقفے کے بعد اتار کر میز پر رکھ دیا تھا...... قبلہ ماموں جان ایک عرصے تک مجھ سے شدید ناراض رہے...... اور ہاروں سے شدید طور پر الرجک ہونے کے باوجود یہ چمکیلا اور عامیانہ سا ہار میں ابھی تک گلے کا ہار بنائے ہوئے تھا۔ صرف اس لیے کہ یہ دنیا کی تنہا ترین جگہ پر پہنچنے کی خوشی میں مجھے پہنایا گیا تھا۔

"سائیں جب سوئیں گے تو پھر اسے اتاریں گے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

بالآخر ڈنر سرو ہو گیا۔

چینی چاولوں میں اگرچہ گاجریں، گوبھی اور مٹر وغیرہ بھی تھے...... سویا ساس اور چلّی ساس بھی استعمال کیا گیا تھا لیکن وہ بہت زیادہ چینی پھر بھی نہ ہو سکے تھے کیونکہ گلگت میں خرید کردہ چاولوں کی کوالٹی نہایت معمولی تھی اور وہ سینہ تان کر کھڑے ہونے کی بجائے ڈھے گئے تھے اور چینی، کھیر یا دلدل کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ البتہ سپیشل سلاد نہایت کھٹی میٹھی اور خوش ذائقہ تھی۔ بقاء ہاتھ اٹھا کر منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا، صرف فریاد کرتا تھا کہ میری محنت رائیگاں گئی...... اور ہم اس کی ڈھارس بندھاتے تھے کہ ہم چین کی قربت میں ہیں، شاید چینی

لوگ اسی قسم کے چاول کھاتے ہیں۔

"میں چلتا ہوں صاحب۔" رجب اٹھ کھڑا ہوا۔ "کل آؤں گا۔"

"سائیں رات کے اس پہر فرمان آباد تک پیدل جائیں گے۔" ندیم فکر مند ہو گیا۔

"آتے جاتے رہتے ہیں صاحب..... ادھر نہ برف ہے نہ چڑھائی ہے۔ صرف چلنا ہے تو یہ معمولی بات ہے...... ٹیکسی تو ادھر نہیں ملے گی۔"

وہ برآمدے سے اترا۔ ڈھلوان پر سر جھکائے چلتا ہوا نیچے وادی میں چلا گیا۔ کوئی بلب کسی کھیت کی منڈیر پر آتا تو رجب کا پروقار بدن اور جھکا ہوا سر نظر آتا اور پھر تاریکی میں گم ہو جاتا۔

قدرت نے بھی اجازت چاہی اور تھکے قدموں سے نیچے چلا گیا۔

مجنون نے بھی نہایت عاجزی سے رخصت طلب کی...... وہ اتنی دیر تک جاری رہنے والی محفلوں کا عادی نہ تھا اور اپنے گھر چلا گیا۔

ہم تنہا رہ گئے۔

برآمدے کے ایک کونے میں ہمارا سامان' رک سیک' نیلے ڈرم کارٹن اور کچن۔ ایک بلب کی روشنی۔ کھلا ہوا پھاٹک...... سامنے تاریکی میں گم گندم کے بوٹے۔ نیچے وادیٔ شمشال کی سیاہ رات میں دو چار ٹمٹماتے ہوئے بلب۔ سردی کی ایک لہر...... ہوا کا کوئی جھونکا جو بلندیوں سے اترتا تھا اور ہم تنہا......

اور پہلی بار...... اپنے گھر سے دوری...... بہت دوری کا احساس...... اور اداسی کی ایک لہر...... جو وادیٔ شمشال کے رات کے لبادے میں روپوش گندم کے سبز اور سرسوں کے زرد کھیتوں پر تیرتی فرمان آباد تک جاتی تھی۔ جس کے راستے میں رجب شاہ سر جھکائے چلتا جاتا ہوگا اور وہاں سے گرم چشمہ تک میٹھے پانی کے تالاب تک جس کے پانیوں پر ایک رام چکور کے پھڑ پھڑاتے پروں کا ارتعاش تھا۔ پھر زیارت...... وہاں سے روڈ کیمپ...... پسّو...... کریم آباد...... گلگت اور وہاں سے اگر پرواز جائے تو اسلام آباد...... اور تب جا کر اپنے لاہور...... اپنے گھر...... اتنی دوری......

میں دنیا کی تنہا ترین جگہ پر خوشی تلاش کرنے آیا تھا۔

کیا وہ مجھے مل گئی؟

اگر خوشی مجھے کسی ایک جگہ پر مل جاتی تو میں اتنا در بدر کیوں ہوتا؟

اتنا خوار کیوں ہوتا؟

اس ایک جگہ پر دائمی خوشی میں ہمیشہ کے لیے قیام کیوں نہ کر لیتا؟

کسی شاہ گوری' جھیل کرومبر۔ ٹاپ میدان یا سنو لیک پر قیام کیوں نہ کر لیتا؟

اس لیے...... کہ خوشی کبھی نہیں ملتی۔

آپ در بدر ہوتے ہیں اور یہ کبھی نہیں ملتی۔

وادیٔ شمشال میں بھی نہیں۔

دنیا کی تنہا ترین جگہ پر بھی نہیں۔

تو پھر یہ کہاں ملتی ہے؟

اگر مجھے علم ہوتا تو میں اس مقام پر ٹھہر نہ جاتا...... یوں در بدر کیوں ہوتا؟

خوشی کی تلاش ہی دراصل خوشی ہے۔

اور یہ تلاش سانس کے آخری تار تک جاری رہتی ہے۔

بس یہی خوشی ہے۔

"صبح شمشال میں...... لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری"

شمشال اگرچہ خود ایک خواب تھا لیکن اس شب یہ خواب در خواب ہوا۔

مجھے خواب بہت کم آتے ہیں اور اگر آتے ہیں تو نہایت بے تکے اور مہمل خواب آتے ہیں۔

میں نے ایک عرصہ پہلے شاہ گوری کو خواب میں دیکھا تھا۔

پھر "سنولیک" ٹریک کے دوران میں نے بیافو گلیشیر پر ایک ہوٹر بجاتی پولیس جیپ کو دیکھا تھا جو مجھے آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار کرنے آئی تھی۔

درہ ہیسپر کی چوٹی کے نیچے اپنی سفید سوزوکی کو دیکھا تھا اور میری بیگم مجھے ڈانٹتی تھی کہ بزدل وہاں اوپر کیا کر رہے ہو' نیچے آؤ اور گھر چلو۔

بلندیوں پر اسی قسم کے خواب آتے ہیں۔

اور شمشال کی پہلی شب میں مجھے کیا خواب آیا......

میں ایک ہجوم میں ہوں جو میری موجودگی سے لاپرواہ چلتا جاتا ہے اور میں لوگوں کو روک کر کہہ رہا ہوں کہ صاحب سماجی بھلائی کا کام ہے 'کچھ مدد کیجئے...... راہِ خدا کچھ عنایت کیجئے...... اپنی نیک کمائی میں سے کچھ دیجئے۔ اللہ کے واسطہ دریائے شمشال پر جو پُل ہیں 'ان میں لکڑی کے چند تختے لگوا دیجئے۔ وہاں تختوں کے درمیان جو خلا ہیں' انہیں پُر کروا دیجئے۔ زیادہ نہیں تیس چالیس تختوں سے کام چل جائے گا...... میں نے جب شمشال سے واپس جانا ہے تو پھر انہی پلوں پر سے گزرنا ہے۔ چند تختوں کا سوال ہے سخی بابا اور کوئی سخی داتا میری مدد کو نہیں آتا۔

بس یہی خواب تھا جس کے اندر میں تختوں کی بھیک مانگ رہا ہوں۔ جب میرے کانوں میں دور سے آنے والی مترنم آوازیں گانے لگیں "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" بس یہی میری تمنا تھی کہ بس میری واپسی سے پہلے پہلے دریائے شمشال کے پلوں میں جہاں جہاں شگاف ہیں 'ان میں مخیّر حضرات تختے لگوا دیں۔ یقیناً یہ میرے دل کی آواز تھی جو گا رہی تھی اور میری تمنا تھی جو دعا بن کے لبوں پہ آ رہی تھی......

لیکن میں اپنے سلیپنگ بیگ میں سر لپیٹے یہ مترنم آوازیں سن رہا تھا اور پوری طرح بیدار تھا۔ خواب میں نہ تھا...... میں نے سلیپنگ بیگ میں سر نکال کر باہر دیکھا۔ اوپر شہتیروں والی ایک چھت...... چھوٹا سا کمرہ...... دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے میرا رک سیک...... پانی کی بوتل...... میرا خیمہ...... میرے جوگرز پیچیدہ اور پرانی حالت میں اور برابر کے بستر پر بقاء کی مونچھیں سانس کی آمد و رفت سے تیز ہوا کی زد میں آنے والی گھاس کی طرح دوہری ہو رہی تھیں۔ یہ وہی لمحہ تھا جب آپ کسی بھی مقام پر بیدار ہوتے ہیں تو پہلے لمحے کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ میں کہاں ہوں اور پھر اگلے لمحہ جواب آ گیا...... شمشال!

لیکن یہ لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا کہاں سے آ رہی ہے۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اندھے شیشوں اور سبز پینٹ کی کھڑکی کے کواڑوں کو دھکیل کر کھولا اور ذرا اونچا ہو کر باہر دیکھا۔ وادیٔ شمشال صبح میں تھی۔ دریا کے پار شمشال پاس کو جو راستے جاتے تھے' وہ ہلکی دھند میں تھے۔ سرسوں کی زردی اوس میں بجھی ہوئی تھی اور گندم کے بوٹے ہریاول سے نچڑتے تھے...... ان کے درمیان میں ایک پتھریلی چاردیواری کے احاطے میں چند کمرے تھے اور سامنے صحن میں چند ٹھگنے درختوں کے قریب بیس پچیس بچیاں قطار بنائے سکول کے پہلے پیریڈ سے پیشتر نہایت مگن ہو کر "لب پہ آتی ہے......" الاپ رہی تھیں۔

دور افتادہ شمشال کی سویر میں اس دعا کو سن کر میرا بدن کھل اٹھا۔ یہ سراسر غیر متوقع آوازیں تھیں۔ اس دعا کے بول مجھے بچپن میں بھی لے جاتے تھے اور لاہور بھی لے جاتے تھے۔ اس دنیا جہان سے بیگانی بے تعلق وادی کے اندر برفوں اور چٹانوں کی پاکیزگی اور سختی رکھنے والی آوازیں...... اور ان کا تلفظ ہم سے تو بہت بہتر تھا۔ لب پہ آتی ہے...... گا رہی تھیں تو گویا اس کے مصرعے شمشال' گلگت' اسلام آباد' لاہور اور کراچی کو گرہیں دیتے باندھتے

جاتے تھے...... ایک ہی دعا کے بندھن میں سب بندھتے جاتے تھے۔ یہ میرے لیے ایک خوش آمدیدی نغمہ بھی تھا اور یہ صدا بھی کہ تم اگرچہ بہت دور افتادہ ہو...... بلند پہاڑوں میں گم ہو لیکن اپنے وطن میں ہو......

میں نیپال گیا تو وطن سے دوری کی اداسی نے مجھے گرفت میں لئے رکھا حالانکہ کھٹمنڈو سے میں اگر چاہتا تو پانچ چھ گھنٹے کے اندر اندر لاہور پہنچ سکتا تھا جب کہ یہاں سے' شمشال سے۔ اگر بہت ہی بھاگ دوڑ کرتا تو لاہور پہنچنے میں کم از کم پانچ روز تو لگ جاتے اور اس کے باوجود میں یہاں زیادہ محفوظ اور پرسکون محسوس کرتا تھا' آسودہ محسوس کرتا تھا۔ لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری' کی وجہ سے......

ابھی کھیتوں میں ویرانی تھی۔ صرف دو شمشالی تھے جو کدالوں کی مدد سے پانی کا رخ بدل کر اسے اپنے کھیتوں کا راستہ دکھا رہے تھے۔ چند مکانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور ہریاول اور زردی کی اس وادی کے کھیتوں کے درمیان سکول کی ایک بچی کتابوں کا بستہ سنبھالتی' اندھا دھند بھاگتی سکول کی طرف جا رہی تھی کہ وہاں دعا شروع ہو چکی تھی اور اسے دیر ہو گئی تھی۔

ادھر میں نے گیسٹ ہاؤس کی بلند کھڑکی سے دیکھا کہ دعا ختم ہو گئی ہے۔ ایک مختصر خاموشی کا وقفہ آیا اور پھر بچیوں نے مؤدب کھڑے ہو کر "پاک سرزمین" کا آغاز کر دیا...... جونہی یہ بول سکول کے صحن سے باہر شمشال کی مختصر وادی میں گئے تو کھیتوں میں اندھا دھند بھاگتی بچی تک بھی پہنچے' وہ انہیں سن کر ٹھٹکی اور انہیں قدموں پر منجمد ہو کر سر جھکا کر مؤدب کھڑی ہو گئی۔ قومی ترانے کی دھن اور آواز نے اپنے وطن کے ایک حصے میں سانس لینے کے احساس پر ایک اور مہر ثبت کر دی اور اس بچی کی تعظیم نے مجھے مسرت کے ساتھ حیرانی سے بھی دوچار کیا۔

یہاں پہاڑوں کی اس علیحدگی میں اس بچی کو حب الوطنی کا کوئی درس رٹایا نہیں گیا تھا' اسے یہاں کھیتوں میں ٹوکنے والا کوئی نہ تھا' اسے دیکھنے والا کوئی نہ تھا اور اس کے باوجود وہ کشور حسین کی تصویر بنی جہاں تھی' وہیں ساکت ہو گئی تھی۔

میں نے ایک کسان کو بھی دیکھا جو ترانے کی آواز سن کر اپنا بیلچہ اپنی کمر کے ساتھ ٹکا کر سیدھا کھڑا ہو گیا تھا۔

لاہور یا اسلام آباد کے کسی بچے یا عام شخص پر شاید کشور حسین کا یہ اثر نہ ہوتا اور اس کے باوجود شمشال کے باشندے ابھی تک پاکستانی نہیں ہیں۔ آئینی طور پر انہیں کوئی حقوق حاصل نہیں ہیں اور وہ تکنیکی طور پر اس ملک کے باسی نہیں ہیں۔

سکول کے صحن میں قومی ترانے کا اختتام ہوا تو وہ بچی جو بُت بنی کھڑی تھی' یکدم حرکت میں آئی اور سکول کی جانب بھاگنے لگی۔

کسان نے اپنا بیلچہ تھاما اور ایک منڈیر پر جھک گیا۔

”شمشال میں سمندری بگلا کہاں سے آ گیا تھا“

تلا ہوا انڈہ جس کا بدن ابھی سلگ رہا تھا اور کناروں سے اس کی سفیدی سرخی میں بدلتی اور کڑکڑاتی تھی...... حُسن کا ایک ماسٹر پیس تھا۔ دیسی گھی سے زندہ ہوتی اس کی سفیدی کے درمیان شمشال کی سرسوں ایسا زرد ایک گرم سورج تھا جس کا اندرون نرم اور دہکتا تھا۔

انڈہ میری مرغوب غذا ہوا کرتا تھا لیکن کچھ عرصہ پہلے میرے بچوں نے اس پر پابندی لگا دی تھی کہ ابو اس میں کولیسٹرول بہت ہوتا ہے اور آپ کا بلڈ پریشر بھی ہائی ہے۔ چنانچہ مجھے مہینے میں ایک بار درخواستیں پیش کرتے' منت سماجت کرتے کبھی ایک انڈے کی اجازت مل جاتی تھی اور وہ بھی بے روح اور بے رنگ ربڑ کی خصلت والا برائلر مرغی کا برائے نام انڈہ لیکن وادیٔ شمشال میں مجھے میرے بچے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں عینی کی ہدایت کے مطابق باقاعدگی سے بلڈ پریشر کی گولی نگلتا تھا اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ اس ٹریک کے دوران انڈوں کے معاملے میں' میں کھل کھیلا تھا۔ شمشال پہنچتے ہی میں نے ایک عادی شرابی کی طرح جو صحرائے گوبی عبور کرنے کے بعد جو پہلا شخص اسے ملتا ہے' اس سے سلام دعا نہیں کرتا بلکہ پوچھتا ہے کہ یار ادھر کچھ پینے کو مل جائے گا۔ میں نے مجنون سے پوچھا یار ادھر انڈہ مل جائے گا؟

اور یہ مجنون تھا جس نے ہمارے لیے آج کی صبح نہایت دیسی انڈوں کا بندوبست کر دیا تھا۔ اپنے گھر میں دیسی گھی کے پراٹھے بنوا کر لایا تھا اور اب ایک تلا ہوا انڈہ جس کا بدن ابھی سلگ رہا تھا اور اسے بقا کی امور خانہ داری نے سلگایا تھا اور فرائی کیا تھا' میرے پراٹھے پر ایک زرد سورج کی طرح بہار دیتا تھا۔

اسے نوش کرنے کے بعد میں نے رب کا شکر ادا کیا کہ شمشال کا سفر صرف اس انڈے کے لیے بھی جائز ٹھہر سکتا تھا اور پھر ایک اور انڈے کی فرمائش کر دی۔

ہم سب گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں شمشال کی پہلی صبح میں ناشتہ کر رہے تھے۔

نیچے کھیتوں میں کوّے اڑتے تھے۔

لیکن یہ شمشالی کوّے کچھ اور طرح کے تھے۔ ان کے بدن متناسب تھے...... ان کی آوازیں بھی سماعت پر گراں نہیں گزرتی تھیں اور چونچیں شاید سرسوں میں ٹھونگیں مارنے سے زرد ہو گئی تھیں۔ ان کی اڑان میں ایک دلکش آہستگی تھی۔

وہ کسی ایک کھیت میں اترتے اور پھر وہاں سے بلند ہو کر تادیر فضا میں جھولتے رہتے۔ یہ غشپ پرندوں کی طرح لینڈ سکیپ کو اپنی پرواز سے زندہ کرتے تھے۔ شاید یہ کوّے نہ تھے لیکن شمشالی انہیں اسی نام سے پکارتے تھے۔

گیسٹ ہاؤس کے عین نیچے جو راستہ تھا' اس پر کچھ عورتیں اپنے بچوں کو پشت پر پوٹلیوں میں باندھے لکڑیاں اٹھائے ہوئے گزر گئیں۔

میں نے اپنا دوسرا فرائی انڈہ...... دوسرا دیسی گھی کا پراٹھا اور چائے کا تیسرا مگ ختم کیا تو میری آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی اور شمشال کے کھیتوں میں گندم کی جوہری فصل تھی' اس کا ایک ایک بوٹا صبح کی ہلکی زرد کرنوں میں الگ الگ نظر آنے لگا اور ان میں کام کرنے والی خواتین کے پیراہن مزید شوخ ہو گئے۔ ان کے سروں پر جو روایتی ٹوپیاں تھیں' ان کی کڑھائی کے دھاگے نمایاں ہو گئے اور انہیں سردیوں کی طویل اور تاریک راتوں میں ایک دیئے کی روشنی میں جن انگلیوں نے کاڑھا تھا' ان کی پوروں کا لمس بھی مجھے محسوس ہونے لگا۔

رجب آ چکا تھا۔

مہربان نہایت مہربانی اور انکساری سے آس پاس منڈلا رہا تھا۔

نعمت کریم نئی پتلون پہن کر اسے ایک جہازی سائز کے بکل والی بیلٹ سے کس کر اور بال بنا کر آیا تھا۔

اور مجنون ہرگز مجنون نہ لگتا تھا اور اس کے رخسار تازہ شیو سے رگڑے ہوئے دمکتے تھے۔

”صاحب۔ ادھر دولت امین ہماری وادی کا پہلا شخص تھا جو تعلیم یافتہ ہوا اور شمشال

کے لوگوں [illegible] جانب راغب کیا۔ سکول میں ہیڈ ماسٹر ہے۔ وہ بولتا تھا کہ صاحب کو ادھر ہمارے سکول میں لے کر آؤ۔ آپ کے لائق تو نہیں لیکن بچہ لوگ خوش ہو گا۔"

"نہ صرف بچہ لوگ خوش ہو گا بلکہ ہم بھی خوش ہو گا مجنون...... چلو۔"

سکول کے چند سادہ کمروں کے آگے جو ڈھلوان تھی' وہاں دولت امین اپنے شمشالی مشقتی چہرے اور پہاڑوں کی سختی والی مسکراہٹ کے ساتھ ہمارا منتظر تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک اور ہار میرے گلے میں ڈالا اور پھر ایک سفید اونی ٹوپی میرے سر پر سجادی۔ "خوش آمدید تارڑ صاحب......"

ہیڈ ماسٹر کے چھوٹے سے کمرے میں سکول کے مدرس جمع تھے۔ دیواروں پر قائداعظم اور علامہ اقبال کی تصاویر آویزاں تھیں۔ نقشے اور چارٹ تھے جن میں بتایا گیا تھا کہ ہر برس شمشال میں کتنے اور کن کن قوموں کے سیاح آئے تھے۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ نہایت چھوٹے چھوٹے بچوں نے ایسی کمیٹیاں بنا رکھی تھیں جو نہایت اہم موضوعات کے بارے میں تحقیق کرتی تھیں۔ مثلاً شمشال کے موسم' زراعت' جنگلات' معیشت' معاشرہ' لوک میلے' سیاحت اور دیگر تقریبات۔

دولت امین نے مجھے شمشال کی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں گرانقدر معلومات مہیا کیں جو یہ سفرنامہ تحریر کرتے ہوئے بے حد معاون ثابت ہوئیں۔

یہ وہ ذریعۂ تعلیم تھا جو ایک بچے کو اس کی مٹی اور موسموں کے قریب لے آتا ہے۔

ہر بچہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور اگر وہ کسی ایک نئے پھول' بھونرے یا پرندے کو دیکھتا ہے تو فوراً اس کی تفصیل نوٹ کرتا ہے کہ یہ بھی ہماری وادی میں پایا جاتا ہے۔

کمرے دو تین ہی تھے۔ ہر کمرے میں دو دو کلاسیں پڑھ رہی تھیں۔ ایک کلاس کا بلیک بورڈ شمالی دیوار پر اور دوسری کلاس کا بلیک بورڈ جنوبی دیوار پر...... ایک ہی کمرے میں۔ بچے شمال کی سادگی اور عسرت کی مثالیں تھے لیکن ان کے چہرے ذہین اور روشن تھے۔ لڑکوں کے سکول سے فارغ ہو کر ہم نیچے وادی میں اترے اور لڑکیوں کے اس سکول میں گئے جس کے صحن سے آج صبح لب پہ آتی ہے کی صدا سنائی دی تھی لیکن ہم نے دیر کر دی تھی اور بچیاں تادیر انتظار کرنے کے بعد گھروں کو لوٹ گئی تھیں البتہ ہیڈ ماسٹر اور دیگر اساتذہ

موجود تھے۔ یہاں نصاب ذرا مختلف تھا۔ ان بچیوں کو مال مویشی' آبادی' روزمرہ کی زندگی' پھولوں اور پودوں کی سائنس کے علاوہ زمین کی اقسام کے بارے میں بتایا جاتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں جہاں بچیوں کے سگھڑپن کے نمونے آویزاں تھے' وہاں دو حنوط شدہ پرندے بھی لٹکتے تھے۔

"یہ جو پرندہ ہے' چھوٹا سا نیلے رنگ کا...... اسے ایک بچی نے کھیت میں سے اٹھایا اور اس کی ڈرائنگ بنائی...... اور یہ دوسرا بگلا ہے۔"

"بگلا...... شمشال میں بگلا کہاں سے آگیا؟"

"معلوم نہیں...... ایک بچی کو ملا تو وہ اسے یہاں لے آئی۔"

عام بگلے تو کالا شاہ کاکو اور مریدکے کے کھیتوں میں خاص طور پر دھان کے پانی میں ڈوبے ہوئے کھیتوں میں تو اترتے تھے لیکن یہ شکل سے سمندری بگلا یعنی سی گل دکھائی دیتا تھا۔ ادھر اس وادی میں جو سمندر سے اتنی ہی دور ہے جتنا کہ سمندر اس سے...... ایک سی گل کہاں سے آگیا۔ اگر یہ سی گل ہے تو...... شاید یہ لونگ سٹون سی گل تھا جو اپنی پرواز میں حدوں کے پار جانا چاہتا تھا۔

یہ حدوں کے پار ہوا تو ادھر شمشال میں آگرا۔

حدود سے پار نکلنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔

وہ بے جان ہو کر......

اپنے بدن میں بھس بھروا کر کہیں آویزاں ہو جاتے ہیں۔

لیکن جو حدود کے پار نہیں جاتے' ان کا انجام بھی تو مختلف نہیں ہوتا۔

ان میں تو کوئی بھس بھی نہیں بھرتا۔

تو پھر حدود کے پار جانے کی سعی کیوں نہ کی جائے۔

شمشال بھی تو حدوں کے پار ایک وادی تھی۔

اور ہم اپنے اپنے شہر سمندروں کو تیاگ کر...... حدوں کو پار کر کے یہاں پہنچ گئے تھے۔

"شمشال میں مرگ"

مہربان کا ایک گھر تھا۔

بلندی پر اٹکا ہوا...... خورد پن گلیشیر کے ادھر جہاں شمشال کی وادی اختتام کو پہنچتی تھی۔ اس کے گھر کے آگے گیسٹ ہاؤس کی طرح پتھروں کی ٹھگنی چار دیواری کے اندر ایک کھیت تھا جس میں سرسوں کے چند چھینٹے تھے' دو چار درخت تھے اور ان کے آگے ایک اور دیوار تھی جو اس گھر...... اس کھیت کو وادئ شمشال میں گرنے سے روکتی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد رجب نے کہا تھا "صاحب مہربان کا بہت خواہش ہے کہ آپ اس کے گھر چلو......"

میں جانتا تھا کہ کوہستانی علاقوں میں جب کوئی محبت کا مارا شخص آپ کو اپنے گھر مدعو کرتا ہے تو وہ گھر آپ کے ہمسائے میں نہیں ہوتا...... اگلی گلی یا آبادی میں بھی نہیں ہوتا بلکہ کہیں اور ہوتا ہے جہاں تک پہنچتے پہنچتے آپ خلاص ہو سکتے ہیں۔ "مہربان کا گھر کتنی دور ہے؟"

"ادھر نزدیک ہے صاحب۔"

رجب کہتا تھا کہ نزدیک ہے تو پھر نزدیک ہی ہوگا۔

وہ اتنا نزدیک تو نہ تھا لیکن اتنا دور بھی نہ تھا کہ ہم چلتے چلتے بدحال ہو جاتے۔ وادی کے آخر میں ایک باغ میں سے گزر کر تھوڑی سی چڑھائی اور پھر بلندی پر براجمان...... ایک گھر۔

"صاحب چائے پیئے گا؟" مہربان ہم سے بہت خوش تھا۔

"نہیں۔" رجب نے جواب دیا۔ "اپنی گائے کا دودھ پلاؤ۔"

وہ ہنستا ہوا چلا گیا اور ہم اس دیوار پر بیٹھے اپنے آپ کو نیچے گرنے سے بچاتے ہوئے قدموں میں بچھی وادی کو دیکھنے لگے۔

"صاحب' میں جانتا ہوں کہ آپ ادھر آکر خوراک کے معاملے میں تھوڑا مایوس ہوئے ہیں۔ آپ کو پسّو میں سب لوگ بتاتے تھے کہ شمشال پہنچو گے تو ادھر بہت دودھ ہے مکھن ہے اور لسّی ہے لیکن وہ لوگ شمشال نہیں آتے۔ وہ نہیں جانتے کہ ان دنوں شمشال کا سارا مال مویشی اور یاک وغیرہ اوپر جا چکا ہے۔ ادھر صرف دو چار گائے باقی ہے جو چائے کے دودھ کے لیے رکھتا ہے۔ مہربان کے ہاں بھی گائے ہے' اسی لیے میں نے بولا کہ دودھ پلاؤ۔"

مہربان دودھ سے بھری ایک فلاسک اور چند پیالیاں لے کر آ گیا۔

دودھ واقعی بے حد مزیدار تھا اور ہم اس دیوار پر اپنے آپ کو سنبھالتے دودھ کے گھونٹ بھرتے اور ہر گھونٹ میں ہریاول اور تازگی مہکتی تھی وادی کو دیکھتے تھے جو ہمارے قدموں میں بچھی ہوئی تھی۔ وہ پاپلر کے درختوں کے درمیان میں سے فرمان آباد میں رجب کے گھر تک دکھائی دیتی تھی۔ ہموار اور ایک مختصر تصویر کی طرح۔ کہیں ہریاول ہی ہریاول تھی اور کہیں اس ہریاول میں سرسوں کے زرد قالین بچھے ہوئے تھے۔ کچے گھروں میں کھڑکیوں کی مہین آنکھیں تھیں جو کھلتی تھیں...... اور لوگ تھے' کھیتوں میں' گھروں کو جاتے ہوئے...... جماعت خانہ کا رخ کرتے ہوئے اور بچے کھیتوں میں بھاگتے تھے لیکن یہاں اوپر تک ان کی آوازیں نہیں پہنچتی تھیں۔ وادی گونگی لگتی تھی۔ یوں بھی شمشال کے بیشتر باشندے اوپر چراگاہوں میں جا چکے تھے اور اب انہوں نے اکتوبر میں ہی لوٹنا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ وادی میں کسی اشد ضروری کام کی غرض سے نیچے بھی آ جاتے تھے لیکن کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ انہیں نیچے آنا پڑتا تھا بلکہ انہیں کندھوں پر اٹھا کر نیچے لایا جاتا تھا۔ اگر آپ درہ شمشال کی بلند چراگاہ میں چلے گئے ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مرگ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔

مہربان کے بلند گھر سے جہاں سے وادی شمشال کا پورا منظر بچھا ہوا نظر آتا ہے' وہاں سے ایک منظر دکھائی دیا تھا۔

یہ منظر ہمیں دکھائی نہیں دیا' ہمیں بتایا گیا کہ یہ ایسے دکھائی دیا تھا اور وہ ایسے ہی دکھائی دیا ہو گا۔

وادیٔ شمشال سے پرے...... خورد پین گلیشیر کی جانب...... دریائے شمشال کے کنارے جو پتھروں کی دنیا ہے اور اس کے پانی چٹانوں سے جا ٹکراتے ہیں تو وہاں دریا پر جو ایک پل ہے' نیم شکستہ اور اس کے پار کوئی راستہ دکھائی تو نہیں دیتا' صرف یوں لگتا ہے جیسے وہ پل چٹانوں سے ٹکرا کر ختم ہو جاتا ہے تو اس چٹانوں میں گم راستے سے ایک قافلہ اترتا ہے۔ تین روز کی مسافت کے بعد درّہ شمشال کی چراگاہوں سے ایک قافلہ اپنے گھر اپنے شمشال میں داخل ہونے کے لیے اترتا ہے۔ اپنے راستوں سے واقف...... آہستگی سے قدم اٹھاتا...... خاموش ماتمی سناٹے میں گم۔ جب وہ قافلہ اس پل کے پار آکر وادی میں پہلا قدم رکھتا ہے تب عورتیں چادروں سے اپنے چہرے ڈھانپ کر بین کرنے لگتی ہیں۔

ان کے درمیان کسی چارپائی پر نہیں کیونکہ اوپر درے میں چارپائی نہیں ہوتی۔ غالباً درختوں کی شاخوں سے بنے ہوئے کسی پالنے...... کسی سٹریچر پر...... ایک لاش ہے جسے اٹھائے ہوئے وہ وادی میں داخل ہو رہے ہیں۔

جیسے پنجاب کے دیہات میں دستور ہے کہ خواتین پہلے تو کھیتوں میں' نہر کنارے' پگڈنڈیوں پر خاموشی سے چلتی آتی ہیں لیکن جونہی وہ بستی نظر آتی ہے' جہاں وہ کسی مرگ پر افسوس کرنے آئی ہیں تو وہ چہرے ڈھانپ کر بلند آواز میں بین کرنے لگتی ہیں۔

ایسے شمشالی خواتین بھی آہ وزاری کر رہی تھیں۔

اس مرگ قافلے کو دیکھ کر وادی کے لوگ بھی پُل کی جانب بڑھتے ہیں تاکہ ان لوگوں کے کندھوں کو کچھ آرام دیا جائے جو اس میت کو پچھلے تین روز سے اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

یہ سوگواری کا ایک عجیب منظر ہے جو ہم نے دیکھا نہیں' ہم سے بیان کیا گیا۔

شمشال کی تنہا اور بلند وادی میں ایک جنازہ گزر رہا ہے۔ ایک لاش کو کاندھا دیا جا رہا ہے؟ عورتیں بین کر رہی ہیں۔ سرسوں کے کھیتوں اور منڈیروں پر چلتے ہوئے مرد جب کاندھا بدلتے ہیں تو سفید چادر میں ایک مردہ بدن بھی پہلو بدلتا ہے۔

قدرت نے اس موت کو ہمارے لیے یوں بیان کیا "پروین زوجہ محبت علی۔ اپنے مال

مویشی اور یاکوں کے ہمراہ اوپر گوجراب کی چراگاہ میں گئی تھی۔ پروین بھی ان شمشالی خواتین میں سے ایک تھی جو ہر سال اپنے مال مویشی کو ہانک کو ماہ مئی میں اوپر چراگاہوں تک لے جاتی تھی اور پھر خزاں کے موسم میں گھی اور پنیر بنا کر وادی کو واپس آتی تھی لیکن پروین دمے کے مرض میں مبتلا تھی۔ وہ اس کے علاج کے لیے صعوبت برداشت کر کے گلگت بھی گئی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اسے گلے کا کینسر تھا لیکن وہ اپنی بیماری کی پرواہ کیے بغیر اوپر چراگاہوں میں چلی گئی تھی کیونکہ یہی رواج تھا۔ سب لوگ ان موسموں میں اوپر جاتے ہیں تو وہ یہاں رہ کر کیا کرتی۔ چراگاہوں کی بلندی کی وجہ سے اس کی صحت پر برا اثر ہوا۔ اسے سانس کا عارضہ تھا اور بلندی پر سانس کا بہت پرابلم ہوتا ہے۔ اسے اپنی چھوٹی سی بچی کو بھی سنبھالنا ہوتا تھا۔ وہ کسی یاک کو ہانکتے ہوئے یا دودھ بلوتے اور مکھن نکالتے ہوئے منہ کھول کر ہانپتی ہوئی نڈھال ہو جاتی۔ چراگاہ میں موجود دوسرے لوگوں نے اس کی خراب صحت کی اطلاع نیچے شمشال میں روانہ کی اور گاؤں سے اس کے عزیز و اقارب اور چند رضاکار تین دن کی بجائے دو دن میں اوپر پہنچ گئے۔ اسے اٹھایا اور جب وہ اسے واپس لا رہے تھے تو 4800 میٹر بلند درّے بوئے سَم میں پروین کا دمہ شدت اختیار کر گیا۔ وہ بلندی برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ اس کی موت کی اطلاع گاؤں تک آئی تو خواتین میں کہرام مچ گیا۔ مردوں کو ایسے حالات سے ہمیشہ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لیے غم ناک ہونے کے باوجود وہ بندسر کے مقام تک پہنچ گئے اور وہاں سے میت کو احترام سے نیچے لایا گیا۔"

پروین کی میت وادیٔ شمشال کے کھیتوں میں سے گزرتی۔ ایک آہ وزاری کرتا ہجوم......

شمشال میں موت!

یہ منظر ہمیں دکھائی نہیں دیا...... ہمیں بتایا گیا تھا...... قدرت نے بھی بتایا تھا کہ یہ ایسے دکھائی دیا اور وہ ایسے ہی دکھائی دیا ہو گا۔

کہتے ہیں کہ آپ کسی بھی بستی میں جڑیں تب پکڑتے ہیں جب وہاں آپ کی موجودگی میں ایک بچے کی پیدائش ہوتی ہے یا ایک مرگ ہوتی ہے۔

پروین کی موت نے وادیٔ شمشال میں ہماری جڑیں گہری کر دی تھیں۔

"بلبل کی صدا...... میں اپنے گاؤں کولوٹ رہی ہوں"

اور اس شام ہم بھی سوگواری میں تھے۔

پروین کو شمشال کے پتھریلے قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔

ہم اس کی موت سے الگ نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ لاہور کا گلبرگ یا کراچی کا ڈیفنس نہیں تھا کہ ہمسائے میں موت ہو جائے تو خبر تک نہیں ہوتی۔ آپس میں جڑی ہوئی مختصر بستیوں اور وادیوں میں یہ ایک اجتماعی سانحہ ہوتا ہے اور وہاں کے درخت' کھیت اور ہوائیں بھی مرگ سے متاثر ہوتی ہیں۔

"ہم لوگ تین روز تک مرنے والے کا سوگ کرتے ہیں اور پھر چوتھے روز کھیتوں میں کام کرنے کے لیے چلے جاتے ہیں......" قدرت بتا رہا تھا۔

"آپ جماعت خانہ میں بھی تو جمع ہوتے ہیں؟"

"ہاں...... ہم وہاں "چراغ نامہ" پڑھتے ہیں۔ پتھر کا ایک چراغ جلا کر مرنے والے کی روح کے ثواب کے لیے چراغ نامہ سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔"

رات تھی۔

گیسٹ ہاؤس کی چھت سے لٹکا اکلوتا بلب کبھی بجھتا تھا اور کبھی نیم روشن ہو کر ٹمٹماتا تھا اور اس کے نیچے برآمدے مین ہم چپ اور رنجیدہ بیٹھے تھے۔

ہم پروین کو جانتے نہ تھے' نہ کبھی اس کی شکل دیکھی تھی لیکن...... اس کی ناگہانی موت نے ہم پر گہرا اثر کیا تھا۔ ہم اسے اپنے تصوّر میں...... مئی کے مہینے میں جب اسے اس کے گھر والے روکتے تھے کہ تمہیں دمے کا عارضہ ہے' اوپر بلندی بہت ہے اور سانس نہیں آئے

گا...... دیکھتے تھے لیکن وہ اپنی قدیم روایت سے انحراف نہیں کر سکتی تھی۔ سینکڑوں برسوں سے اس کے لوگ ماہ مئی میں اپنے یاک لے کر اوپر چراگاہوں کی طرف سفر کرتے تھے' وہ کیسے اس ایک موسم میں پیچھے رہ جاتی۔ وہ بوئے سَم کے درے کے پار اتری اور شمشال پامیر میں اپنے مال مویشی کی نگرانی کرنے لگی...... پنیر اور گھی بنانے لگی لیکن اس کا دل جانتا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر...... اپنے شمشال نہیں پہنچے گی۔

اور وہ جانتی تھی کہ اگر وہ مر گئی تو وادی کے لوگ اور اس کے عزیز تو غم میں ڈوبیں گے لیکن یہ وہ یقیناً نہیں جانتی تھی کہ کچھ دور دیسوں سے آئے ہوئے آشفتہ سر آوارہ گرد بھی مجنون کے گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں ایک شام اس کے لیے رنجیدہ ہوں گے اور اس کے لیے دعائے مغفرت کریں گے۔

گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے اس اجنبی خاتون کے حوالے سے مجھے واخی زبان کے ادب کی معروف صنف "بلبلیک" یاد آ رہی تھی یعنی بلبل کی صدا...... اسے صرف خواتین ہی گاتی ہیں۔ اس صنف میں بلند و بالا چراگاہوں میں موسم گرما کے دوران جو تجربات اور جذبات جنم لیتے ہیں' ان کا اظہار کیا جاتا ہے اور اس کا آغاز یہ کہہ کر کیا جاتا ہے کہ "میں ایک بلبلیک گانے لگی ہوں۔"

جب وہ بلند چراگاہوں کی جانب جانے کے لیے اپنے گھر بار اور دیہات چھوڑتی ہیں تو جدائی اور شوق کی کیفیت ان نغموں میں بیان کرتی ہیں۔ جب کبھی کسی عورت کو کسی دور افتادہ چراگاہی ڈیرے پر ٹھہرنا پڑتا ہے تو وہ کسی اونچی چٹان کی کگر ڈھونڈتی ہے جہاں سے نیچے وادی پر نظر ڈالی جا سکے۔ وہ اس وقت اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اپنی تنہائی کا اظہار کرتی ہے اور محبت' دوست احباب' فطرت' جدائی اور موت جیسے موضوعات پر نغمہ سرا ہوتی ہے۔ بلبلیک عام طور پر جذباتی اور غمگین نوعیت کی ہوتی ہے۔

کیا پروین بھی بلبلیک گا کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی تھی......؟

واخی ثقافت کی ابتداء تو پاکستان اور تاجکستان کے درمیان افغانستان کی پٹی واخان سے ہوتی ہے لیکن واخی لوگ چینی' ترکستان اور پاکستان میں بھی ایک الگ ثقافت رکھتے ہیں۔ سابین فیلمی نے اپنی کتاب "THE VOICE OF THE NIGHTINGALE" میں

واخی ادب اور ثقافت کا بھرپور تجزیہ کیا ہے۔

وہ کونسی اسی بلبلیک ہے جس میں پروین کے جذبات اور تجربات کا اندازہ ہوتا ہے۔

بلند[1] درے سے
تمہاری جھلک کتنی پیاری ہے
مجھے تمہارا جلوہ پسند ہے' سردار کے بیٹے!

پہاڑ کی ڈھلوان پر تیز پروا چلتی ہے
اتنی آہیں نہ بھر
بلند آہنگ گریہ تو غم کی علامت ہے!

سوتی کپڑے پر زرد کشیدہ کاری ہے
سورج طلوع ہو رہا ہے
جب سورج چڑھ رہا ہوگا تو میرا بھائی روانہ ہوگا

باغ میں سیب پکے ہوئے ہیں
جب میں باغ میں ٹہلتی ہوں
خزاں پہاڑوں اور میدن تک پہنچ چکی ہوگی!

بالائی سے بھری پیالی
موت کا ذکر ہو تو تم مردہ ہو
اور تمہاری بہن تمہارے لیے بلبلیک گا رہی ہے!

میں گلے میں زرد پھول پہنے ہوئے ہوں
یہ دن بہت شاندار ہے

---

1 اردو ترجمہ: سہیل احمد صدیقی

میں اپنے گاؤں کو لوٹ رہی ہوں
میری ننھی آنکھیں ماں باپ کو آتا دیکھیں گی!

میں چٹان پر چڑھ چکی ہوں
نیچے دیکھتے ہوئے
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بہت بلند ہو چکی ہوں!

بلند درّے۔ پہاڑ کی ڈھلوان۔ بلند آہنگ گریہ۔ خزاں پہاڑوں اور میدان تک پہنچ چکی ہوگی۔ موت کا ذکر ہو تو تم مردہ ہو۔ میں چٹان پر چڑھ چکی ہوں اور میں اپنے گاؤں کو لوٹ رہی ہوں...... یہ سب اظہار ایسے ہیں جن میں شمشال کی چراگاہوں اور پروین کی مرگ کی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔

جب رات زیادہ تاریک ہوئی تو ہم نے برآمدے کے ٹمٹماتے ہوئے بلب کو گل کر دیا اور اپنے کمروں میں چلے گئے۔

اگرچہ ہم پروین کے لیے رنجیدہ تھے لیکن اپنے گھروں سے اتنی دوری کے احساس سے بھی خوفزدہ تھے۔ شمشال میں موت بھی ہو سکتی تھی' یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔

"تمام جانور پریوں کی ملکیت ہوتے ہیں"

رنج کی اس کیفیت میں اگلے روز میں نے کچھ نہ کیا۔ شمشال کے بارے میں شمشال نیچر ٹرسٹ کا جو معلوماتی کتابچہ تھا' اس کی ورق گردانی کرتا رہا۔ اس میں جو کچھ درج ہے' وہ ہمیں اس وادی کے رہن سہن کی قربت میں لے کر جاتا ہے۔

"شمشال ایک زراعت پیشہ اور مویشی پالنے والوں کی آبادی ہے۔ اس کے نفوس کی تعداد گیارہ سو کے لگ بھگ ہے۔ شمشال کے علاقے کا کل رقبہ 2700 مربع کلو میٹر ہے جس میں بے شمار بلند برفانی چوٹیاں' گلیشیر اور چراگاہیں موجود ہیں۔ ان میں سے نو چوٹیاں سات ہزار میٹر سے بھی زیادہ اونچائی پر ہیں اور دس ایسے گلیشیر ہیں جن کی لمبائی دس کلو میٹر سے زیادہ بنتی ہے۔ شمشال کے مویشیوں کے علاوہ ان علاقوں میں آئی بیکس' نیلی بھیڑ' جنگلی گدھے' برفانی کوّے' خرگوش' مرغابیاں' بھیڑیے اور برفانی چیتے بھی پائے جاتے ہیں۔ شمشال کی مختصر وادی میں گندم اور جو کاشت کیے جاتے ہیں اور ان کے علاوہ آلو' مٹر' پھلیاں' سیب اور خوبانی بھی ملتے ہیں۔ ہر گھرانہ اپنی ضرورت کے مطابق سبزیاں بھی اگاتا ہے۔ ان کے علاوہ ہر خاندان کی ملکیت میں بھیڑ' بکریوں' گائیوں اور یاکوں کے ریوڑ ہیں اور ان کی آمدنی کا بیشتر حصہ گھی' مکھن' پنیر اور دودھ کی فروخت سے حاصل ہوتا ہے۔ یاکوں کی فروخت اور ان کے بالوں سے بنے ہوئے نمدے بھی اضافی آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ شمشال میں مویشیوں کی دیکھ بھال زیادہ تر عورتیں اور لڑکیاں کرتی ہیں جو کئی مہینوں تک بلندی پر واقع تین چراگاہوں میں رہائش پذیر ہوتی ہیں۔ شمشال میں بقیہ ہنزہ سے الگ واخی زبان بولتے ہیں اور اس وادی کی دور افتادگی کے باعث یہ زبان اپنی اصلی تاریخی حالت میں محفوظ

ہے۔ 1995ء کے ایک سروے کے مطابق شمشال میں تقریباً ساڑھے چار ہزار بکریاں' ڈھائی ہزار بھیڑیں' ایک ہزار یاک' چار سو گائیں اور بتیس گدھے تھے۔

تاریخی واقعات' گیتوں' اور کہانیوں کی صورت میں سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں اور ان کے کچھ حصے ڈرامے کی صورت میں میلوں ٹھیلوں اور تقریبات پر پیش کیے جاتے ہیں۔ ہم جنگلی حیات کی بقا پر یقین رکھتے ہیں' اس لیے بے دریغ شکار سے گریز کیا جاتا ہے۔ شکار ہمیشہ اجتماعی طور پر کیا جاتا ہے اور اسے سب گھرانوں کے ساتھ بانٹ لیا جاتا ہے۔ گاؤں میں صرف خاص موقعوں پر شکار کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ صرف عمر رسیدہ جانوروں کو مارا جائے اور ایک شکاری مہم میں صرف ایک جانور کو ہلاک کیا جاتا ہے اور وہ بھی بچوں کی ماں نہ ہو یا حاملہ نہ ہو۔ پچھلے دو برس سے مکمل طور پر پابندی عاید ہے' سوائے ان مردوں کے لیے جو پامیر کی بلندیوں پر ہوتے ہیں اور وہاں ان کی خوراک کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہوتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تمام جانور پریوں کی ملکیت ہوتے ہیں اور ہم انہیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمیں فخر ہے کہ قراقرم کے یہ علاقے صرف اہل شمشال کی تاریخ کے حوالے سے پاکستان میں شامل ہوئے۔ ایوب خان کی سوانح "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں درج ہے کہ "ہم نے شمشال پاس کے دوسری جانب واقع کئی سو مربع میل پر پھیلی ہوئی چراگاہوں کا سوال چینیوں کے سامنے اٹھایا۔ ہم نے چینی نمائندوں پر ثابت کر دیا کہ یہ علاقے سینکڑوں برسوں سے اہل شمشال کی چراگاہیں رہے ہیں اور اگر انہیں ان علاقوں میں جانے سے روک دیا گیا تو وہ ایک بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ چینیوں نے کہا کہ وہ سنکیانگ میں اس دعوے کی تصدیق کرنے کے بعد فیصلہ کریں گے اور بالآخر انہوں نے ان علاقوں پر ہماری ملکیت تسلیم کر لی۔"

شمشال کے مردوں کا شمار دنیا کے بہترین کوہ پیماؤں میں ہوتا ہے۔ ان میں رجب شاہ' مہربان شاہ' شامی خان' محبت شاہ' عزیز اللہ بیگ' فرزار خان' مکافات شاہ' دولت قاضی' سید احمد' بختاور شاہ' امان اللہ اور قدرت اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

پچھلی صدی میں سری کول سے ایک مبلغ تشریف لائے جن کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے ہم نے اسماعیلی عقیدے کو اختیار کیا اور ابھی تک اس کی پیروی کرتے ہیں۔

"میں شمشال میں ہوتا تو گداگر ہوتا"

شمشال ابھی تک سوگ میں تھا۔

مرد سر جھکائے وادی کے کناروں پر دریا کی گزرگاہ کے کناروں پر جو پتھریلے گھروندے اور کچے کمرے اور سادہ گھر تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ تھے' وہاں سر جھکائے آہستگی سے چلتے تھے۔

عورتیں کچھ سیاہ چادروں میں لپٹی تھیں۔ وہ سروں پر پلاسٹک کے روٹی دان اور دیگچے اٹھائے کھیتوں کے درمیان چلتی ہوئی مرگ والے گھر کی جانب جاتی تھیں۔

کھیتوں میں ویرانی تھی۔

قدرت بھی اس گھر کے سوگ میں شامل ہو کر اوپر ہمارے ہاں گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں آیا تھا۔

"پورا وادی افسوس کے لیے آرہا تھا اور اپنے ساتھ برادری کے لیے دودھ اور کھانا وغیرہ لاتا ہے۔"

"اور تین روز کے سوگ کے بعد لوگ اپنے کھیتوں میں جائیں گے۔"

"جی ہاں۔"

"قدرت......ادھر موسم سرما تو بہت شدید ہوتا ہوگا۔" میں زندگی کی جانب واپس آیا۔ کہتے ہیں کہ جب کسی موت کے افسوس کے لیے جمع ہونے والی خواتین میں سے کوئی خاتون اٹھتی ہے کہ میں نے اپنے بچے کو دودھ پلانا ہے تو گویا زندگی کا اعلان کرتی ہے کہ میں جاری وساری ہوں۔ کچھ ایسے میں نے قدرت کو زندگی کی جانب لانے کے لیے یہ سوال کیا۔

"ہاں۔"

"بہت برف گرتی ہے۔"

"نہیں۔ کبھی تو سردیاں بالکل سوکھی نکل جاتی ہیں۔ وادی میں صرف تیز ہوائیں چلتی ہیں اور برف کا ایک گالا بھی نہیں اترتا۔ ہواؤں کے گرد کے بگولے اٹھتے ہیں اور پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں اور یہاں سے اس برآمدے میں نیچے نہ ہریاول نظر آتی ہے اور نہ کسی قسم کی کوئی زندگی...... ہر جانب مٹی اڑتی نظر آتی ہے۔ کھیت ویران ہو جاتے ہیں۔"

"آپ لوگ اگرچہ خوراک کے معاملے میں کسی حد تک خود کفیل ہیں لیکن میں نے نوٹ کیا ہے کہ پورے شمشال میں کوئی ایک بھی دکان نہیں ہے۔ اگر بری فصل کی وجہ سے یا کسی حادثے کے باعث آپ کے پاس خوراک ختم ہو جائے تو پھر آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ہم نے اجتماعی کاوش سے ایک خزانہ بنا رکھا ہے۔ اسے ہم عوامی خزانہ بولتے ہیں۔ اس میں خوراک کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ کسی کے پاس خوراک ختم ہو جائے تو خزانے سے مہیا کر دی جاتی ہے اور جب اگلے برس فصل تیار ہوتی ہے تو وہ اتنی خوراک واپس کر دیتا ہے۔ اگر وہ خاندان یا شخص واپس کرنے کے قابل نہ ہو تو بھی اس کی قیمت وصول نہیں کی جاتی۔"

مجنون بھی قریب ہی براجمان تھا اور حسب معمول نہایت ستھرا اور شیو شدہ تھا۔

"سائیں ادھر کونسا ایسا نائی ہے جس سے آپ اتنی رگڑی ہوئی شیو بنواتے ہیں۔" ندیم نے پوچھا۔

"ادھر تو نائی نہیں ہوتا جناب۔ ہم خود بناتے ہیں۔"

"اور بال کہاں سے کٹواتے ہیں؟"

"وہ بس......" مجنون ہنسنے لگا۔ "ہم خود ہی ایک دوسرے کی حجامت بنا لیتے ہیں یا پھر کوئی نیچے پسو یا گلگت جاتا ہے تو ادھر سے بال کٹوا کر آتا ہے۔"

"سائیں نائی نہیں ہے۔ دکان نہیں ہے سودا خریدنے کو تو......ادھر موچی تو ہوگا۔ درزی' لوہار' ترکھان تو ہوں گے کہ وہ بھی نہیں ہیں۔"

"وہ بھی نہیں ہیں صاحب...... یہ سب کام ہم خود ہی کر لیتے ہیں۔ اپنے جوتے خود گانٹھتے ہیں۔ خواتین درزی کا کام کر لیتی ہیں اور باقی کام بھی گزارے کے موافق کر لیتے ہیں۔"

شمشال شاید دنیا کی واحد کمیونٹی تھی جہاں پیشوں کی سپیشلائزیشن نہیں تھی اور ہر فرد اپنی روزمرہ زندگی کے اسباب خود ہی پیدا کرتا تھا اور خود ہی سنبھالتا تھا۔

میں اگر شمشال میں ہوتا تو کتنا لاچار ہوتا...... بھوکا مر جاتا' ننگے پاؤں پھرتا اور چیتھڑوں میں ملبوس ہوتا۔ گداگر ہوتا...... چونکہ میں نے شمشال میں ابھی تک کسی گداگر کو نہیں دیکھا تھا' اس لیے وادی کا واحد گداگر ہوتا اور گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں میرا نام درج ہوتا۔

میرے نزدیک شمشال کی پوترتا کو صرف ایک شے داغدار کر رہی تھی اور یہ لکڑی کے وہ ٹیڑھے میڑھے آسرے یا کھمبے تھے جن کے ساتھ بجلی کی ایک اکلوتی تار جھولتی تھی اور کھیتوں کے اوپر اور وادی میں جھولتی بہت بری لگتی تھی۔ "اس بجلی کا آپ کو کیا فائدہ ہوا ہے؟"

مجنون بولا "اچھا لگتا ہے صاحب...... لوگ گلگت سے جاپانی مشینیں لاتا ہے اور چلاتا ہے۔ ابھی تو ہمارا ٹیلی ویژن خراب ہے۔ کوئی مکینک کبھی آئے گا تو ٹھیک کرے گا۔ وہ بھی بجلی سے چلتا ہے۔ ادھر بجلی نہیں تھا تو پھر سات بجے سو جاتا تھا۔"

"اچھا نہیں تھا؟"

"نہیں صاحب...... اب ہم کھیتوں میں بلب جلا کر رات کو بھی کٹائی کر سکتا ہے۔ یاک چلا کر بجلی کی روشنی میں گندم نکال سکتا ہے۔ ادھر دن میں گرمی ہو جاتا ہے تو کام نہیں ہوتا اور جب بجلی نہیں تھی تو رات بھی ضائع ہو جاتا تھا۔ اندھیرے میں کیا کرتا اور سب سے اچھا بات ہے کہ رات کے وقت بچے سکول کا کام کر سکتے ہیں' کتاب پڑھ سکتے ہیں۔"

بجلی کے دفاع میں یہ سب سے موثر آرگومنٹ تھا۔ بچے اپنی کتابیں پڑھ سکتے ہیں' علم حاصل کر سکتے ہیں۔

"اور مجنون بجلی تو صرف گرمیوں کے چند روز کے لیے ہوتی ہے۔ جب نالہ ادویر ختم ہو جاتا ہے اور بجلی گھر نہیں چلتا تو پھر کیا کرتے ہیں؟"

"پھر اپنی لالٹینیں اور دیئے جلاتے ہیں اور اگلی گرمیوں کا انتظار کرتے ہیں۔"

بقاء جو شمشال کی غذائی صورتحال سے قدرے رنجیدہ تھا اور مجنون کے دیسی انڈوں کے بعد تھوڑا پرامید ہوا تھا' کہنے لگا "سائیں ہمیں تو یہ بتاؤ کہ ادھر مرغی تو مل جائے گی ناں۔

ہم ادھر ملتانی کڑھائی گوشت بنائے گا۔"

"مرغی تو ادھر نہیں ہوتی۔"

"یار مرغی تو دنیا بھر میں ہوتی ہے' ادھر کیوں نہیں ہوتی؟"

"نہیں ہوتی۔"

"نہیں ہوتی تو اس کا انڈہ کدھر سے آ جاتا ہے؟"

"چند ایک گھریلو مرغی ہوتا ہے...... زیادہ نہیں ہوتا۔"

"آخر کیوں زیادہ نہیں ہوتا؟"

"یہ فصل کا ستیاناس کرتی ہے صاحب۔ اس لیے نہیں پالتا اور نہیں رکھتا۔ ویسے بھی جب زیادہ لوگ اوپر پامیر چلے جاتے ہیں تو ادھر ان کا رکھوالی کون کرے؟"

"عجیب لوگ ہیں۔" بقاء نے مونچھیں پھڑکا کر کہا "مرغی کڑھائی کے بغیر ہی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"بہت ہی عجیب لوگ ہیں سائیں۔" ندیم نے نہایت دانشمندی سے اپنا جانگلوس سر ہلایا۔

"ہمارے ہاں تو معزز لوگ اپنی شیو خود کرنا توہین سمجھتے ہیں تو میں نے ادھر آتے ہی پوچھا کہ نائی وغیرہ کہاں ہے تو پتہ چلا کہ نہیں ہے...... میں پہلے سے دریافت کر چکا تھا بلکہ میں نے آج مہربان سے کہا کہ یار گولڈ لیف کا ایک پیکٹ تو لا دو تو وہ کہنے لگا کہ ادھر تو کوئی دکان نہیں ہے۔ میں نے کہا یار سگریٹ کی دکان تو ہو گی تو وہ بولا "ادھر تو صاحب کوئی سگریٹ پیتا ہی نہیں۔ سائیں تارڑ یہ کیسے لوگ ہیں' سگریٹ نہیں پیتے...... کسی قسم کا سگریٹ نہیں پیتے۔"

اور یہ بھی ایک عجوبہ تھا۔ شمشالیوں کو شاید تمباکو کی دریافت کا علم ہی نہ تھا۔ یہاں کہیں بھی "نو سموکنگ" کا بورڈ آویزاں کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے بھی دو دن کا پیدل سفر کر کے پسو جا کر سگریٹ کا پیکٹ خریدنے سے بہتر ہے کہ انسان سگریٹ نہ ہی پیئے۔

مجنون کے گیسٹ ہاؤس نے ہمیں نکما کر دیا تھا۔ ہم رات گئے تک اس کے برآمدے میں محفل جمائے بیٹھے رہتے' باتیں کرتے رہتے۔ بقا ٹین بند کوفتوں کو قید سے آزاد کرتا' ان

میں فرائی شدہ آلو ڈالتا اور مجنون کے گھر سے آئی ہوئی روٹیوں کے ساتھ پیش کر دیتا۔ ایک روز جب لنچ کے بعد ہم اونگھنے کے موڈ میں تھے تو ایک وحشت ناک خیال آیا...... ہم شمشال میں دوراتیں گزار چکے تھے۔

یہ ہمارا آخری دن تھا...... آنے والی شب یہاں ہماری آخری شب تھی۔

ہم شمشال کو اس دنیا کی طرح اپنا ابدی گھر سمجھ بیٹھے تھے لیکن...... ایک مدھم کوچ کا نقارہ سنائی دینے لگا تھا۔ ہمیں کل سویرے یہاں سے نکلنا تھا۔ ٹریکٹر کے مالک کو پیغام پہنچ چکا تھا کہ وہ ہمیں شمشال کی اس مرسیڈس میں سوار کر کے یہاں سے رجب شاہ کے گھر تک چھوڑ آئے تاکہ ہم چھ کلومیٹر کے پر مشقت اور پر آزمائش سفر سے بچ جائیں۔

ہم کوچ کے نقارے کی مدھم آواز سن کر ہراساں ہوئے اور اونگھتے ہوئے بیدار ہو گئے اور پھر نیچے شمشال کی وادی میں اتر گئے۔

کھیتوں میں ابھی تک اداسی تھی۔

پامیر کی چراگاہوں میں جو جوان مرگ ہوئی تھی' اس کی سیاہی ہریاول پر اثر انداز ہوتی تھی۔ ہم کھیتوں سے ذرا اوپر ہوئے تو شمشال کا ایک قدیم قبرستان قدموں تلے آیا۔

بارش اور برفوں سے دھنسی ہوئی قبریں' گڑھوں میں پتھر کی سلیں' ایک پتھریلی چار دیواری جس کے اندر کسی ایک خاندان کے مدفن تھے' بیشتر قبریں سنگلاخ زمین میں محض شگاف' ایک سل کے نیچے ایک کھوپڑی اور چند ہڈیاں دکھائی دیں اور مجھے وادیٔ کالاش کے کھلے تابوت یاد آگئے جن میں سے ایک میں کوئی دولہن ہار سنگھار اور موتیوں اور عروسی لباس میں لیٹی ہوئی تھی اور صرف کاسۂ سر تھا یا چند ہڈیاں تھیں۔

وادی کے آخر میں امین آباد کی وہ پہاڑی تھی جس کے دامن میں سے گزر کر...... اودویر نالہ عبور کر کے ہم شمشال پہنچے تھے۔

امین آباد تک ایک برفانی نالے کے کنارے ایک راستہ بلند ہوتا تھا اور چڑھائی مشکل نہ تھی۔ اوپر پہنچنے پر اور پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے پر ہمیں وادیٔ شمشال کا ایک اور فضائی منظر دیکھنے کو ملا اور اس میں ایک ناقابل بیان کوہستانی سحر اور تنہائی تھی۔

ذرا آگے گئے تو اودویر نالہ ایک گلیشیر کی کوکھ میں سے جنم لیتا نیچے آرہا تھا اور اس کے

دہانے پر شمشال کے بجلی گھر کا مختصر وجود اٹکا ہوا تھا۔

اس نالے کے پار امین آباد کی آبادی تھی جہاں سے رجب کا فرمان آباد نظر آتا تھا لیکن اس نالے پر بھی ایک عجیب واہیاتی شمشالی پل تھا جس کے تختے کہیں تھے اور کہیں نہیں بھی تھے اور مزید "آسانی" یہ تھی کہ دونوں جانب تھامنے کے لیے بھی کسی قسم کا کوئی بندوبست نہ تھا۔ اپنا بیلنس قائم رکھتے ہوئے دونوں ہاتھ بازی گروں کی طرح اٹھائے اس پر سے گزرنا تھا...... اس لیے میں گزرنے سے انکاری ہو گیا۔ یہاں کوئی مجبوری تو نہ تھی کہ اس کے پار جائیں گے تو منزل تک پہنچیں گے تو اپنی متاع جاں خوامخواہ داؤ پر لگانے سے فائدہ۔ اس لیے میں انکاری ہو گیا۔

ایک سگریٹ سلگایا۔ پل کے ادھر نالے کے شور میں ڈوبے ایک پتھر پر براجمان ہوا اور شمشال ہارن کی کنواری برفوں کی سفیدی میں گم ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد ادھر امین آباد کی جانب سے کوئی درجن بھر خواتین اور بچے نمودار ہوئے۔ خواتین نے دیگچے اور خوراک کے برتن اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ سب نہایت اطمینان سے...... بچے اچھلتے کودتے اور خواتین چادروں میں ڈھکی اس میرے نزدیک ناممکن اور ناقابل عبور پل پر سے اپنی رفتار کم کیے بغیر گزر گئے...... یہ خواتین بھی سوگ والے گھر میں کھانا لے کر جا رہی تھیں۔

اس کے بعد مردوں کی ایک پارٹی اتری۔ ستھرے لباسوں میں' چترالی ٹوپیوں میں' اکہرے بدن اور متحرک وجود والے شمشالی مرد...... ہمیں دیکھ کر وہ رک گئے۔

ان میں شمشال کا عمر رسیدہ نمبردار بھی تھا۔ سویٹر اور ایک سفید جیکٹ میں تجربہ کار اور خوش شکل بوڑھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور واخی زبان میں ایک تقریر شروع کر دی۔ ایک سرخ جیکٹ والے نوجوان نے اس کا رواں ترجمہ شروع کر دیا اور باقی لوگ سر ہلا ہلا کر تائید کرنے لگے۔ "نمبردار صاحب۔ شمشال میں آمد پر آپ کے شکر گزار ہیں۔ خوش آمدید کہتے ہیں اور خاص طور پر یہ کہ آپ یہاں تک پیدل پہنچے ہیں۔ آپ مہربانی سے باہر کی دنیا کو ہمارے بارے میں بتایئے اور ان کو اطلاع کریں کہ اس برس پامیر میں زیادہ برف گرنے سے بہت سیلاب آگیا اور ہمارا مال مویشی اور چراگاہ بہہ گیا۔ بہت نقصان ہوا۔ ادھر گلگت میں اگر

تھوڑا سا پانی آتا ہے' ایک موشی مرتا ہے تو حکومت مدد کو آجاتا ہے...... ادھر کوئی مدد کو نہیں آتا...... آپ کچھ کرو۔"

نمبردار صاحب نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ راہبر جو ہمارے ساتھ آیا تھا۔ ایک شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتا تھا۔ ندیم ایک پتھر پر بیٹھا سوٹے لگاتا سر ہلاتا تھا اور میں شمشالیوں کے اجتماع میں گھر ان کے دکھڑے سنتا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کی مصیبتوں کو کم کروں لیکن میرے بس میں کیا تھا سوائے اس کے کہ میں اس کتاب میں ان کا کیس بیان کر دوں۔

نمبردار صاحب اور ان کے درجن بھر ساتھی ہم سے ہاتھ ملا کر...... نیچے شمشال میں مرگ والے گھر کی طرف اتر گئے۔

"شمشال کا قدیم ترین گھر...... رباب کا ایک تار"

وادیٔ شمشال کے کناروں پر ایک کھنڈر تھا۔

باہر سے یہ ایک مسمار شدہ بستی لگتی تھی۔ بارشوں اور برفوں سے زمین بوس ہو جانے والا ایک گھر لگتا تھا۔ ایک بیکار سا کھنڈر لگتا تھا جس میں لوگ اپنے آپ کو فارغ کرنے کے لیے آتے ہیں۔ جس میں مرغیاں گھومتی ہیں یا پوشیدگی کی خواہش والے دل ملتے ہیں۔

لیکن اس کھنڈر کے اندر ایک گھر تھا...... ابھی تک تھا...... پندرہ نسلیں گزر جانے کے باوجود ابھی تک موجود تھا۔ صدیوں پرانا ایک گھر جس کے دروازے کو شاید شمشالیوں کے دادا مامون نے کھولا تھا۔ شاید اس میں رہائش کی تھی۔

یہ وادیٔ شمشال کا عجائب گھر تھا۔

مجنون نے پہلے روز بتایا تھا کہ ادھر شمشال میں ہم نے اپنی صدیوں قدیم ثقافت کو ایک گھر کی صورت میں سنبھال رکھا ہے۔ میں نے جب اسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اس نے کچھ تأمل کیا...... آج نہیں کل...... میں کوشش کرتا ہوں۔ بندوبست کروں گا۔ جانے اس نے کیا بندوبست کرنا تھا لیکن آج اس نے گرین سگنل دے دیا تھا۔

امین آباد سے واپسی پر گاؤں کی آبادی کے آغاز میں ہم اس پتھریلے کھنڈر میں گئے۔ مسمار شدہ دیواروں اور کانٹے دار جھاڑیوں کے اندر گئے اور ایک دیوار میں ایک لکڑی کا چوکھٹا نظر آیا جس کی پیشانی پر "میوزیم" کا لفظ پینٹ کیا گیا تھا۔

رجب نے اس چھوٹے سے چوکھٹے کو دھکیلا اور ہم اس کے پیچھے سر جھکا کر اس کے اندر کی نیم تاریکی میں چلے گئے۔ اندر چھت کے شہتیر سیاہ تھے' جیسے انہیں جلا دیا گیا ہو۔

کھڑکی کے ستونوں' چوکھٹوں اور شہتیروں سے برسوں کی کالک کی تہیں سیاہ جھالروں کی طرح لٹکتی تھیں اور ہمارے چہروں کو چھوتی تھیں۔ لگتا تھا کہ یہ سب کچھ ابھی ہم پر گر جائے گا۔ صدیوں کے بوجھ کی تنہائی مسمار ہو کر ہم پر آن گرے گی۔ طرز تعمیر میں کچھ تبدیلی نہ تھی۔ چھت میں ایک چوکور روشندان' زیارت اور گرم چشمہ کے کمروں کی طرح...... چند نیم منقش ستون' دبیز شہتیر چھت کو سہارتے ہوئے۔ مٹی اور پتھر کی دیواریں لیکن ہر شے کالک اور سیاہی کے دبیز لیپ میں...... کچے فرش پر جو دھول تھی' اس میں بھی کالک تھی۔ یہ وہی کالک تھی جو سینکڑوں برس کے سرمائی دھویں سے' موسم سرما کی شدت میں اپنے چہرے آگ پر رکھنے سے آہستہ آہستہ در و دیوار پر...... ستونوں' چوکھٹوں' چھت کی کڑیوں اور چہروں پر جمتی چلی جاتی ہے اور اس کالک بھری سیاہ دھول کے گھر میں...... یاک کی ایک کھال اکڑی ہوئی صدیوں پرانی...؟ شاید اسے کوئی اوڑھتا تھا یا اس میں مکھن سنبھالتا تھا۔ بڑے بڑے آہنی تسلے...... دودھ بلونے والے گول چوبی سلنڈر...... سنولیک سے واپسی پر ہورو کے گڈریئے' بالکل اس شکل کے چوبی سلنڈروں میں سے مکھن نکالتے تھے۔ ایک رحل' ایک سیاہ محراب کے اندر......

بظاہر فرش پر پڑے ہوئے لکڑی کے سیاہ اور بوسیدہ ڈھکن...... انہیں اٹھایئے تو ان کے نیچے تنور نما سٹور جن میں گندم اور جُو کا ذخیرہ کیا جاتا تھا لیکن اب ان میں مٹی بھری ہوئی تھی۔

ایک کالک زدہ ستون سے...... جس پر کچھ نقاشی بھی تھی جو کالک میں سے بمشکل ظاہر ہوتی تھی...... ایک ترازو جھولتا تھا...... زنگ آلود اور بوسیدہ۔ ایک پلڑا بہت نیچے...... وقت کے بوجھ سے جھکا ہوا۔ اس پر جانے کتنی صدیوں کا بوجھ تھا۔

ہم اس قدیم آماجگاہ کی تاریکی میں اب دیکھ رہے تھے۔ ہمیں عادت ہو رہی تھی۔

ایک کونے میں کھیتوں میں کام آنے والے زراعتی اوزار...... لکڑی کے بیلچے اور کھرپے...... ایک ریڑھی نما لکڑی کا پہیہ جس کے ساتھ کھیت کی مینڈھیں بنائی جاتی تھیں۔ گھریلو برتن جن میں زنگ سے بھرتے ایسے مرتبان تھے جن کی شباہت کاشغر کی لگتی تھی اور پتھر کے ظروف...... ہانڈیاں...... پیالے......

کچی دیوار پر آویزاں اور دھول میں...... فرش کی دھول میں گم بوسیدہ بندوقیں...... جن

کی زنگ آلود نالیوں میں سوراخ تھے اور کاندھوں کی لکڑی میں گھن لگا ہوا تھا اور کپڑا بُننے کی ایک قدیمی کھڈی کے کچھ تانے بانے...... کچھ دھاگے...... ہاتھ کی بنی ہوئی موٹی اون کی جرابیں...... چینی اور ترکستانی برتن۔

لیکن ہر شے پر کالک جمی تھی اور وہ کالک لٹکتی تھی سیاہ چیتھڑوں کی طرح۔

اس قدیم اور بے آباد گھر میں قدم رکھتے ہوئے میں نے اپنے آپ کو ماہر آثار قدیمہ کارٹر کے ہم پلہ محسوس کیا جو فرعون مصر توتن خامن کے مقبرے میں پہلی بار داخل ہوا تھا اور اس نے ہزاروں برس پرانی اس ہوا میں سانس لیا تھا جس میں سے خدام درباری اور شاہی خاندان کے لوگ ممی کو تابوت میں رکھ کر باہر گئے تھے اور جاتی مرتبہ وہ چراغ جسے کوئی خادم بجھا کر گیا تھا' اس کی کالک پر ابھی تک اس کی انگلیوں کے نشان تھے۔

یہ بھی ایک ایسا ہی تہذیب کا مدفن تھا۔ اس میں بھی گئے زمانوں کی ہوائیں ٹھہری ہوئی تھیں اور ہم ان میں سانس لیتے تھے۔

خاک میں آلودہ ایک ٹوٹا ہوا رباب پڑا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے اسے اٹھایا...... اس کا ایک تار اب بھی موجود تھا۔ کیا میں اسے چھیڑ سکتا ہوں؟ اس تار کو آخری بار کس نے چھیڑا ہو گا۔ کب' کہاں کس کے لیے چھیڑا ہو گا۔ صدیوں پہلے پامیر کی بلند چراگاہوں میں کوئی نہ کوئی اسے لے کر گیا ہو گا تاکہ اسے چھیڑنے سے اس کے دل کی مراد پوری ہو جائے کیونکہ مرادیں...... شمشال کی خواتین بھی تو انہی چراگاہوں میں زندگی کرتی تھیں۔

اگر میں اس رباب کے اکلوتے تار کو چھیڑتا ہوں تو کیا میرے دل کی مراد بھی پوری ہو جائے گی۔ میں نے آہستگی سے اس پر انگلی رکھ کر اسے چھیڑا' تھوڑی سی دھول اٹھی لیکن کوئی آواز نہ آئی۔

یہ قدیم گھر ایک عجوبہ تھا۔ ایک حیرت تھی۔

میرا تو یہ خیال تھا...... اور ایک اور خام خیال تھا کہ میں پہاڑوں میں گمشدہ ایک وادی دریافت کرنے جا رہا ہوں۔ شاید ایک نیم تہذیب یافتہ' تمدن سے نا آشنا وادی...... لیکن اس عجائب گھر کے کالک میں لتھڑے ہوئے نیم تاریک مختصر گھر میں پوشیدہ ظروف نے...... ایک رحل نے جس پر کبھی قرآن رکھا جاتا تھا' بڑے بڑے تسلوں اور دیگچوں نے' فنجانوں اور ابتدائی

زرعی اوزار نے‘ایک کھڈی‘ایک ترازو نے اور اس رباب نے ثابت کر دیا تھا کہ یہاں انسانی تہذیب اپنے محدود دائرے میں مکمل تھی۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ ایک تاریخی اور بڑے شہر کے باسی ہوں‘ تبھی ایک تہذیب اور ثقافت کے مالک ہوتے ہیں...... بلکہ آپ اتنے الگ تھلگ اور دور افتادہ ہونے کے باوجود ایک اعلیٰ تمدن کے امین بھی ہو سکتے ہیں۔

شمشالیوں نے قابل قدر طور پر اپنی مختصر تہذیب کے آثار کو سنبھال رکھا تھا۔

”مجنون...... یہ تو ایک خزانہ ہے لیکن یہ سب کچھ یہاں بے آسرا اور بے ترتیب پڑا ہے۔ راکھ ہونے کو ہے۔ اسے ترتیب اور نگہداشت کی ضرورت ہے۔ مثلاً یہ کپڑا بُننے کی کھڈی جو ٹوٹی پڑی ہے اور اس کے ساتھ جو پارچہ ہے‘کسی متروک نمونے کا‘اسے اگر احتیاط سے بحال کر کے نمائش کیا جائے۔ پتھریلی ہانڈیوں کو چولہوں پر رکھا جائے‘ظروف کو سجایا جائے...... صفائی کی جائے۔ روشندان سے جو بارش اور برف گرتی ہو گی‘اس کا سدّباب کیا جائے تو انہیں دیکھنے والوں پر بھی اثر ہو گا اور یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی ہو جائیں گے...... ایسا کام کوئی ماہر آثار قدیمہ یا عجائب گھر ترتیب دینے والا شخص کر سکتا ہے۔“

”آپ کا آئیڈیا تو اچھا ہے تارڑ صاحب...... ہم کوشش کریں گے‘آپ بھی کوشش کریں۔“

”پروفیسر دانی صاحب سے میری دوستی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”انہی سے گزارش کروں گا کہ فارغ وقت میں کبھی شمشال ہو آئیے۔“

”لیکن دانی صاحب تو سنا ہے کہ آپ سے بھی زیادہ عمر کے ہیں۔“

مجھے یہ ”آپ سے بھی زیادہ“ کچھ زیادہ پسند نہ آیا۔

”ویسے وہ مجھ سے کہیں جوان اور متحرک ہیں۔ انہیں اگر علم ہو جائے کہ اس دور افتادہ وادی میں ایک صدیوں پرانا گھر ہے اور اس عہد کا سامان بھی پڑا ہے تو اسی کے پیٹے میں ہونے کے باوجود واکنگ سٹک ٹیکتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے۔“

”ویسے تارڑ صاحب۔“ رجب نے سر ہلایا ”ان سے بہتر چیزیں لوگوں نے گھروں میں سنبھال رکھی ہیں۔ یہاں اس لیے نہیں رکھتے کہ کوئی اٹھا کر نہ لے جائے۔ یوں بھی ادھر بارش وغیرہ اندر آتی ہے۔ اگر باقاعدہ میوزیم بن جائے تو لوگ وہ چیزیں بھی یہاں رکھ دیں

گے۔ آپ نے کریم آباد میں دربار ہوٹل میں جو ہنزہ کی پرانی چیزیں سجی دیکھی ہیں‘وہ بھی ادھر شمشال سے گئی ہیں۔“

ماحول اثر انداز ہوتا ہے تو قصے کہانیاں یاد آنے لگتے ہیں۔ جس ہوا میں آپ سانس لیتے ہیں‘اس کی قدامت میں گئے زمانوں کی داستانوں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگتی ہیں۔ میں جب سے اس گھر میں داخل ہوا تھا‘تب سے مجھے شمشال کی وہ کہانی یاد آ رہی تھی جو درّہ شمشال کی گلابی سویر میں جیپ میں سفر کرتے ہوئے رجب شاہ نے شروع کی تھی اور پھر ڈرائیور اسحاق کے کہنے پر کہ روڈ ڈینجرس ہے‘انکل ذرا چپ کرو‘وہ ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے رجب سے درخواست کی کہ وہ قصہ مکمل کرے۔

”وہ......“ اس نے حسب عادت ٹھوڑی کھجائی ”کدھر تک بیان کیا تھا؟“

”جب مامون شاہ کے گھر ایک بزرگ کی دعا سے بیٹا شیر خان پیدا ہوتا ہے اور پھر جوان ہو کر شمشال پاس کے سفر کو جاتا ہے...... اور ادھر چینی لوگوں کے ساتھ پولو کھیلتا ہے۔“

”ہاں ہاں......“ رجب نے سر ہلایا۔ ”تو پھر ایسا ہوا کہ وہ اکیلا شمشال پامیر میں ”شورت“ پہنچا تو موجودہ چین کی سرحد سے چھ گھڑ سوار ایک بغیر سینگ چار سالہ خوش گائے یعنی یاک کے ساتھ اس سے ملے۔ شیر نے سوال کیا کہ یہ میرا علاقہ ہے‘آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ انہوں نے بھی یہی سوال پوچھا کہ نہیں یہ تو ہمارا ایریا ہے۔ آپ یہاں کیوں آیا ہے۔ اسی طرح سے کچھ لمبے بحث و مباحثہ کے بعد آخر فریقین ایک معاہدے پر راضی ہوئے اور وہ چھ غیر ملکی گھوڑوں پر سوار ہوئے اور اپنا چار سالہ یاک دادا شیر علی کو دیا...... آپ جانتے ہو کہ دوڑنے میں گھوڑے اور یاک کا کوئی مقابلہ نہیں لیکن اس کے باوجود شیر علی کو اپنی قوت پر بھروسہ تھا اور فیصلہ یہ ہوا کہ اگر چینی لوگ یا غیر ملکی گیند کو شمشال کی جانب لے جاتے ہیں تو یہ سارا علاقہ ان کا ہو جائے گا اور اگر شیر علی گیند کو موجودہ چین کی سرحد کے پار لے جائے تو یہ تمام علاقے موضع رسکم تک جو پاک چین سرحد پر واقع ہے‘شیر علی کی ملکیت ہو جائیں گے۔ قدرت کا کرنا کیا ہوا کہ شیر علی کا یاک بہت تیز بھاگا اور ان کے گھوڑوں کو لِت دی اور وہ گیند سرحد پار لے گیا۔ چنانچہ وہ معاہدہ کے مطابق اس ساری سرزمین پر قابض ہوا۔ اس کے بعد شیر نے اس سے تعاون کا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے میرا خونی رشتہ قائم

ہو۔انہوں نے شیر کو اپنی بیٹی دے دیا۔

پھر شیر کے پانچ بیٹے پیدا ہوئے۔ ان کے نام تھے بختی' باقی' پہلوان' ولی اور حوض...... ہم ان کی اولاد میں سے ہیں...... بس یہ کہانی ہے۔"

"گویا اس علاقے کو پاکستان میں شامل کرنے کا اصل کریڈٹ آپ کے دادا کے بیٹے شیر خان یا شیر علی کو جاتا ہے۔"

"ہاں صاحب۔" رجب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن رجب...... دولت امین نے تمہارے اس دادا کا نام مامون سنگھ کی بجائے ماموسنگ یا ماموشاہ بتایا ہے۔"

"وہ پڑھے لکھے ہیں۔انہوں نے ٹھیک بتایا ہوگا۔ سب لوگ اپنے حساب سے نام لیتے ہیں۔"

شمشال کی داستانوی تاریخ کہیں رقم نہیں کیونکہ واخی زبان کا کم از کم اس علاقے میں کوئی رسم الخط رائج نہیں۔ یہ تحریر میں نہیں آتی البتہ ماسٹر حقیقت ان لوگوں میں سے تھے جو چاہتے تھے کہ اپنی زبان کے لیے ایک رسم الخط اپنایا جائے۔ ان کی قبر پر اسی رسم الخط کا کتبہ آویزاں ہے۔ چونکہ شمشال کی تاریخ نسل در نسل بیان ہوتی چلی آئی ہے' اس لیے مامون شاہ کا بنیادی قصہ تو ایک ہی ہے لیکن کہیں کہیں روایت مختلف ہو جاتی ہے۔ مظفر الدین' دولت امین اور استاد محمد خالق اس قصے کو یوں بیان کرتے ہیں:-

"کہتے ہیں شمشال کا گاؤں تقریباً چار سو برس پیشتر ماموسنگ نے آباد کیا تھا جو ہنزہ بلتت کے ایک گاؤں برونگشیل کا رہنے والا تھا اور وہ بروشکی تھا۔ جب وہ شمشال میں آباد ہوا تو شاہ شمس ان کے گھر تشریف لائے اور ان کی دعا سے اس کے ہاں اولاد ہوئی۔ وہ ایسے کہ جب وہ اس کی بیوی خدیجہ کے جھونپڑے میں آئے تو خدیجہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر بزرگ کے قدموں میں پھیلایا اور ایک ٹوٹے ہوئے پتھر کے برتن میں بھیڑ کا دودھ ڈال کر چولہے پر رکھ دیا۔ بزرگ نے اپنے عصا مبارک سے اس برتن کو چھوا تو وہ ثابت اور سالم ہو گیا اور پھر اس کی دعا سے اولاد ہوا۔ جب وہ شمشال میں آیا تو اتفاقاً اس نے زمین میں ایک کنواں دریافت کیا جس کے دہانے پر ایک بھاری پتھر رکھا ہوا تھا۔ اس نے پتھر بڑی مشکل سے ہٹایا تو اس میں سے پانی ابلنے لگا اور ان خشک نہروں میں بہنے لگا جو کسی قدیم زمانے میں یہاں سے گزر کر پامیر

اور ترکستان جانے والے مسافروں نے بنائی تھیں یعنی وہاں ایک نہری نظام موجود تھا جو برباد ہو چکا تھا۔ اسی طرح وہاں اجڑے ہوئے کھنڈر تھے جن میں لوگ رہا کرتے تھے۔ اس کے بیٹے شیر خان نے سریقول کی ایک واخی لڑکی سے شادی کی جس کے بطن سے کئی بیٹے پیدا ہوئے اور ان میں سے تین قبیلوں نے جنم لیا یعنی غازی قاطور' بختی قاطور اور باقی قاطور۔ شیر خان کے پولو میچ کے بعد پندرہ نسلیں گزر چکی ہیں۔ پچھلی صدی میں سریقول سے ایک مبلغ تشریف لائے اور انہوں نے ہمیں اسماعیلی فرقے میں شامل ہونے کی دعوت دی اور ہم آج تک اسماعیلی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔"

ہم شمشال کے نیم تاریک گھر میں اس وادی کے ماضی کی سرگوشیاں سنتے تھے۔

صدیوں پرانی اس آماجگاہ کی چھت میں جو چوکور روشندان تھا' وہاں سے مٹی کے باریک ذرّوں پر سوار روشنی کی کرنیں اترتی تھیں اور کالک کی جھالریں انہیں جذب کر کے تاریک کر دیتی تھیں۔ یہی روایت تھی کہ مامون سنگھ یا ماموسنگ چار سو برس پیشتر اس وادی میں اترا تھا تو اس وقت بھی یہاں بے آباد گھروں کے کھنڈر موجود تھے۔ چنانچہ یہ گھر شاید چھ سات سو برس کی برفوں اور طوفانی ہواؤں کو جھیل چکا تھا۔

طاقچے میں پتھر کا چراغ تھا جو معلوم نہیں کتنی صدیاں پہلے روشن ہوا تھا۔

اس بڑے تسلے میں جو دو ٹکڑے ہو چکا تھا' جانے کب اور کن مہمانوں کے لیے دعوت کا اہتمام ہوتا تھا۔

اس ترازو پر کسی نے کیا تولا ہوگا؟

ان زنگ آلود...... اور ان پر منقش بیل بوٹے کب کے زنگ سے بھر چکے تھے۔

صراحیوں میں کس نے کونسی شراب انڈیلی ہوگی۔

اور جو فنجان تھے' ان میں پامیر کی کسی بوٹی کو کشید کر کے کیسا مشروب بنایا گیا ہوگا۔

تنور نما سٹورز میں کونسی اجناس کا ذخیرہ ہوگا؟

اور...... اس رباب کو آخری بار کس نے چھیڑا ہوگا؟

"رجب......"

اور رجب چونک گیا کیونکہ میں بہت دیر بعد بولا تھا۔

"یار میرا جی چاہتا ہے کہ ہم آج کی رات...... شمشال میں اپنی آخری رات اس گھر میں گزاریں۔"

"سائیں کیا کہتے ہو......" اب ندیم چونکا "ادھر تو بھوت پریت ہوں گے لیکن سائیں ہم تیار ہیں۔ جان پر کھیل جائیں گے آپ کے لیے۔"

"کیا کریں گے صاحب......" رجب تجربہ کار اور بلندیوں پر پاگل ہو جانے والے کوہ پیماؤں کا عادی اور ان پاگلوں کی باتیں نہایت تحمل سے سننے والا۔ ان سے اختلاف نہ کرنے والا اور نہ ہی حقارت سے مسکرانے والا۔ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا "کیا کریں گے صاحب...... ادھر تو بے آرامی ہو گی۔ ادھر تو سینکڑوں برسوں سے کسی نے جھاڑ پونچھ نہیں کیا...... دھوئیں کی کالک لٹکتی ہے۔ فرش پر مٹی ہے۔ ٹائلٹ بھی نہیں ہے...... ادھر کیا کرے گا۔"

"ہاں ادھر کیا کرے گا......" میں فوراً ایک آؤٹ کر گیا "یونہی مذاق میں بولتا تھا۔"

لیکن میں جانتا تھا کہ ادھر کیا کرے گا۔

ادھر بھی وہی کرے گا جو زمانوں پہلے غرناطہ کے الحمرا کے ایک بُرج میں رات بسر کر کے کیا تھا۔

صدیوں سے بجھا ہوا، پتھر کا چراغ جلائے گا، لکڑی کے بوسیدہ اور راکھ آلود پیالے میں کوئی مشروب ڈال کر پیئے گا اور رباب کا ایک تار چھیڑ کر کئی سو برس پیچھے چلا جائے گا اور کیا کرے گا۔

ہم باہر آئے تو ہماری آنکھیں چندھیا گئیں۔ شمشال کے کھیتوں کی سرسوں ہمیں ذرہ بھر نہ بھائی کیونکہ اس میں شوخی اور تیزی بہت تھی اور ان کھیتوں کے درمیان کبڑے کھمبوں سے جھولتی بجلی کی تار کو دیکھ کر ہم نے جان لیا کہ ہم زمانے کی کھوہ سے نکل کر موجود میں آ چکے ہیں...... ہمارے بالوں میں کالک کے چند ریشے لٹکے ہوئے تھے۔

"سائیں ادھر رات رہنے کا آئیڈیا برا نہ تھا......" بقا بالآخر بولا اور اس کی مونچھوں میں بھی کالک کے ذرے اٹکے ہوئے تھے۔

ایک بجھا ہوا چولہا تھا جسے ہم روشن کر سکتے تھے اور اس پر رات کا کھانا تیار کر سکتے تھے۔ پتھر کے چراغ تلے جو فرش تھا، وہاں جھاڑو دے کر اپنے سلیپنگ بیگ بچھا سکتے تھے۔

آئیڈیا برا نہ تھا۔

"پامیری ہیرو یاک اور للین روڈ"

میں نے اور بقاء نے "یاک سرائے" کے سفر کے دوران اتنے یاک دیکھ لیے تھے کہ وہ ہمارے لیے عمر بھر کے لیے کافی تھے...... بلکہ سرپلس تھے۔

لیکن یہ عجیب وقوعہ ہے کہ دنیا میں کچھ جانور ایسے ہیں جنہیں دیکھنے سے جی نہیں بھرتا...... وہ ہمیشہ ناکافی لگتے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے چند لمحوں بعد ہی آپ انہیں پھر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ کسی من چاہے چہرے کی طرح...... مثلاً ایک بلونگا یعنی بلی کا بچہ، ایک کتورا یعنی کتے کا بچہ، ایک بندر بھی...... کوئی بڑا اسارا براؤن بھالو...... میں نے اگرچہ کبھی پانڈا نہیں دیکھا لیکن یقیناً ایک پانڈا بھی...... اور ایک یاک تو ہر صورت میں۔

یاک یا خوش گاؤ اگرچہ ایک بھینسے کی ذرا تہذیب یافتہ شکل ہے۔ گھنے اور لٹکتے ہوئے بالوں کی وجہ سے ذرا ہیرو سا لگتا ہے۔ ایک پامیری دلیپ کمار سا لگتا ہے...... کچھ فلسفی اور بہت زیادہ ہپی لگتا ہے اور اسے جتنی بار بھی دیکھا جائے، کم لگتا ہے۔

شمشال کی تصویر یاک کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

اگرچہ ہمیں پیشگی اطلاع مل چکی تھی کہ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق شمشال میں ایک ہزار کے لگ بھگ جو یاک ہیں، وہ سب کے سب چراگاہوں کو کوچ کر چکے ہیں اور وہاں گھاس چرتے ہیں اور یاکنیوں کے ساتھ یاک مستیاں کرتے ہیں لیکن پھر بھی دل یاک یاک کرتا تھا کہ بندہ شمشال جائے اور یاک یاترا نہ کر سکے۔

آج سویرے مجنون نے ہمیں نوید دی کہ نیچے دریا کے کنارے دو یاک ہیں...... کیوں ہیں؟ درہ شمشال میں کیوں نہیں ہیں...... بیمار ہیں...... افسردہ ہیں۔ ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے

نیچے آ گئے ہیں تو ادھر وادی میں کیوں ہیں۔ اس کا خاطر خواہ جواب نہ مل سکا۔

عجائب گھر سے نکلنے کے بعد ہم گیسٹ ہاؤس لوٹنے کی بجائے کھیتوں میں سے نیچے دریا کنارے ایک چھوٹی سی چراگاہ میں چلے گئے۔

تو وہاں یاک تھے......

اور دو ہی تھے......

اور یہ وادیٔ بروغل کے اس آخری خارش زدہ یاک کی طرح نہیں تھے جس پر سوار ہو کر میں نے مہابھارت کے ایک سورما کی مانند دور افق پر دیکھتے ہوئے ایک تصویر کھنچوائی تھی جب کہ ایک بچے نے یاک کو سنبھال رکھا تھا کہ کہیں یہ دیوانہ شخص گر نہ جائے۔

بلکہ یہ یاک......

نہایت صحت مند اور ہٹے کٹے تھے اور جب سے پیدا ہوئے تھے' کسی ہیئر ڈریسر کے پاس نہیں گئے تھے۔ اگرچہ کچھ پوستی سے تھے اور ہمیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے...... سوئے سوئے سے تھے۔

ان یاکوں کے پس منظر میں ایک پتھریلی چار دیواری میں گھرا ایک باغ تھا...... کچھ درخت تھے۔ نیلے پہاڑوں پر برف تھی۔ دھند تھی اور پاپلر کا ایک درخت تیز ہوا سے دوہرا ہوتا تھا۔ مجنون اور قربان نے ان یاکوں کو خواب خرگوش سے بیدار کیا تو وہ نہایت بیزاری سے اٹھے تو یہ حضرات اچھل کر ان پر سوار ہو گئے اور ان کی باگیں کھینچ کر انہیں درختوں کی ہری شاخوں سے زدوکوب کرتے ہوئے یاک سواری کے جوہر دکھانے لگے۔ یاکوں کی دُمیں مورچھل کی طرح ہلنے لگیں اور وہ شدید ناراضگی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔

مجنون اور قربان ان پر اتنے سکون سے سواری کرتے تھے جیسے کسی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھے ہوں۔

پھر فوٹو سیشن شروع ہو گیا۔

جیسے آئفل ٹاور' اہرام مصر' تاج محل یا دیوار چین کے سامنے کھڑے ہو کر تصویر کھنچوانا ایک سیاح کا مذہبی فریضہ ہوتا ہے۔ ایسے شمشال میں یاک کے ساتھ تصویر نہ ہو تو یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ آپ وہاں گئے تھے۔

سب سے پہلے بقا بھائی نے جرأت کی۔ تصویر کھنچ گئی تو اس نے یاک کو کوئی ملتانی گدھا سمجھ کر باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور یاک ڈھیل پا کر روڈیو کے کسی بھینسے کی طرح اچھلنے لگا۔ بقاء پہلے ہی جھٹکے کی تاب نہ لا کر دھڑام سے نیچے آ گرا...... یہ اس کی کم اور ہماری زیادہ خوش بختی تھی کہ اچھلتے ہوئے یاک کے پاؤں اس کے بدن پر براجمان نہ ہوئے اور وہ بال بال بچ گیا حالانکہ یاک کے بال بہت ہوتے ہیں۔

اس وقوعے کے بعد میں نہایت محتاط ہو گیا بلکہ انکاری ہو گیا لیکن یاک کے مالک شفاء صاحب نے مجھے ذاتی گارنٹی دی کہ آپ کے ساتھی نے چونکہ باگیں ڈھیلی چھوڑ دی تھیں تو یاک کو غلط فہمی ہو گئی کہ اب اسے بگٹٹ بھاگنا چاہیے تو آپ بس باگیں کھینچ کر رکھیں تاکہ یاک کو غلط فہمی نہ ہو...... کوئی پرابلم نہ ہو گی۔ اس گارنٹی سے میری تشفی تو نہ ہوئی لیکن اہل شمشال کے سامنے اپنا امیج برقرار رکھنے کے لیے بادل نخواستہ تیار ہو گیا۔ البتہ یاک پر سوار ہونے سے پیشتر میں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے' ہم سوار ہو جاتے ہیں لیکن کیا مضائقہ ہے اگر اس یاک کی باگیں آپ ہی تھامے رکھیں۔ علاوہ ازیں میرے وجود کو دونوں جانب سے مجنون اور مہربان سہارا دیں بلکہ مضبوطی سے پکڑے رکھیں۔ اتنی مضبوطی سے کہ اگر یاک اس دوران میری ٹانگوں میں سے نکل بھی جائے تو وہ مجھے بدستور مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور ہوا میں معلق رکھیں' گرنے نہ دیں۔

ان آسان سی شرائط کے قبول ہونے پر میری تصویر آسانی سے اتر گئی۔

البتہ جب ندیم یاک پر سوار ہوا' سوار تو خیر کیا ہوا اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر ڈنڈا ڈولی کر کے اسے سوار کیا گیا تو اس غریب کی حالت دیدنی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مجنون اور مہربان کے بدنوں میں اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے۔ یاک کی نکیل شفا نے جکڑی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ایک منجمد گھگھیائی ہوئی ہنسی تھی اور خوف سے تیر ہوتی مونچھیں تھیں۔ اسے جب یاک سے اتار لیا گیا تب بھی وہ اس گھگھیاتی ہوئی مسکراہٹ میں برقرار رہا اور اس کی مونچھوں کو نیچے آتے ایک عرصہ لگا۔

میں تھک چکا تھا اور گیسٹ ہاؤس جا کر آرام کرنا چاہتا تھا۔

"صاحب آپ اوپر چراگاہوں میں تو نہیں جا سکے لیکن نیچے دریا پر اس پل کو تو دیکھ لیں

جہاں سے ہم لوگ درہ شمشال کو جاتے ہیں۔"

یاکوں سے فارغ ہو کر ہم نیچے دریا کی گزرگاہ پر اترے...... وادیٔ شمشال کے آخری کنارے پر پہنچے...... پتھروں اور ریت میں چلتے ہوئے پانیوں کا شور بلند ہوا کان بہرے کرنے گا۔ جیسے اس دریا کا وجود پہلے نہ تھا' ابھی ابھی ظہور میں آیا ہے اور اس پر ایک شمشالی پل تھا۔ وادیٔ شمشال سے جدائی کا پل۔

وہ بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ ان خطوں میں ہوا کرتا ہے۔ پر شور جھاگ اڑاتے پانیوں کے اوپر جھولتا ہوا...... تختوں کی بچت کرتا ہوا اور یہ پل سیدھا ایک چٹان سے جا ٹکراتا تھا اور اس کے آگے مجھے تو کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔

لیکن اس پل پر سے ہر برس سینکڑوں شمشالی خواتین اور بچے اور یاک اطمینان سے گزرتے تھے اور اپنی پامیری چراگاہوں کو جاتے تھے۔

کہتے ہیں کہ پندرہ بیس برس پیشتر اس پل کے دونوں جانب جو رسّے تھامنے کے لیے' وہ یاک کے بالوں سے بنائے جاتے تھے اور الجھ جاتے تھے اور ٹوٹ بھی جاتے تھے اور تختے بھی اتنے کم تھے کہ لوگ جمپ لگا کر ہی گزرنا پڑتا تھا۔ پھر کوئی نیک دل جرمن مائیکل نام کا آیا اور اس نے پانچ ہزار ڈالر عنایت کیے کہ اس پل کو اہل شمشال کے لیے محفوظ بنا لیا جائے۔

اگر یہ "محفوظ" پل تھا تو سابقہ پُل جانے کیسا تھا؟

پُل کے پار ایک چٹان پر "لِلین روڈ" لکھا ہوا تھا جو مائیکل کی بیوی کا نام تھا۔

یہ لِلین روڈ درّہ شمشال کو جاتی تھی۔

میں چند قدم آگے گیا' پل کے تختوں کو احتیاط سے پھلانگتا گیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اس لِلین روڈ پر جو شمشال پامیر کو جاتی ہے' ایک قدم رکھ کر لوٹ آؤں گا تاکہ سند رہے لیکن پل کے درمیان میں پہنچ کر میں نے نیچے دریا کی جانب دیکھ لیا اور پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور میں ڈولتا ہوا واپس آ گیا۔

اس پل پر سے واپس آ جانا اور درہ شمشال تک نہ جانا اس کا مجھے رنج ہوا۔

بائیں جانب خوردپین گلیشیر کی سفید چادر کا ایک حصہ دھند میں سے دکھائی دے رہا

تھا۔ اس علاقے کا نام غمِ غم تھا۔

وقت نے اور عمر نے مجھے گھیر لیا تھا...... اور گھیر کر مارا تھا۔ نہیں تو میں مرنے والا نہیں تھا۔

جیسے اٹھارہ برس پیشتر ہنر بیگ کے گھر میں ایک شب تذکرہ ہوا تھا کہ صاحب میں آپ کو شمشال لے جاؤں گا تو اسی طور میں نے بھی اپنے آپ سے بات کی' ڈھارس دی' تذکرہ کیا کہ یار تارڑ تم فکر نہ کرو' رنجیدہ نہ ہو' میں تمہیں کبھی نہ کبھی درہ شمشال کی بلند چراگاہوں تک لے جاؤں گا۔ شاید ویاگرا کی طرح پہاڑوں پر چڑھنے کی بھی کوئی گولی تب تک دریافت ہو جائے۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

شفاء بار بار کہہ رہا تھا "صاحب آپ اگلے برس آؤ...... مئی کے مہینے میں آؤ اور شمشال والوں کے قافلے کے ہمراہ اوپر چراگاہوں میں چلو۔ ادھر سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر بہت گھاس ہے۔ جھیل ہے۔ دودھ اور مکھن ہے۔ گھی اور پنیر ہے۔ شکار ہے...... اور کیا چاہیے۔ آپ اگلے برس آؤ اور چلو......"

تم اگلے برس کی بات کرتے ہو......
یہاں کل کس نے دیکھا ہے۔ آئے کہ نہ آئے۔
اگر آئے تو مجھے کیسا پائے۔
کسی بیماری کے جال میں...... لاچار...... بستر میں بندھا ہوا۔
نیم معذور...... کسی وہیل چیئر میں قید...... کیا پتہ......
اگر کل آئے تو مجھے کیسا پائے......
چلو...... کل کو آنے تو دو...... پھر دیکھا جائے گا۔

"شمشال کا رانگلا کھیس مکمل ہوتا ہے...... شبِ آخر"

شمشال کا رانگلا کھیس مکمل ہو چکا تھا۔

گرچہ کپاس کے عام کھیسوں میں صرف سفید' سیاہ اور بھورے چار خانی نقش ہوتے ہیں لیکن میرے شمشالی کھیس میں رنگ رنگ کے رنگ تھے۔

میں نے اپنے تصور میں شمشال کا جو کھیس بُنا تھا' یہ اس جیسا بالکل نہ تھا' سراسر مختلف تھا۔ کوئی اور تھا۔ اس لیے کہ تصور کے تانے بانے اپنے ہوتے ہیں' وہ کبھی بھی حقیقت کے ساتھ میل نہیں کرتے۔ اسی لیے شمشال کی حقیقت کا کھیس بالکل جدا تھا...... لیکن یہ ایک رانگلا کھیس تھا۔ ہیر کے پلنگ کی مانند اس میں جدائی' وصل اور حسن کے سو رنگ تھے۔

اور یہ کھیس کیسے مکمل ہوا......

پسّو سے روانگی پر اُس سویر اِس کے دھاگے بالکل کورے تھے۔ ان میں بہت ساری گنجلیں تھیں' بکھیڑے تھے۔ اگرچہ میں انہیں نہایت تندہی سے الگ الگ کرنے کی سعی کرتا تھا لیکن یہ دھاگے الجھتے جاتے تھے۔ میں ان سے کیسے ایک کھیس بنوں گا۔ میرا دل چھوٹا ہوتا تھا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ یہ کھیس اُدھڑ جائے گا یا بُنا جائے اور کیسے......

میں شاہ حسین کی طرح ایسا جولاہا نہ تھا جو کل کائنات کی رمزیں سلجھا کر ان سے اپنا پیراہن تخلیق کر لیتا تھا۔

میں اسی اُدھیڑ بن میں تھا' پھر ہماری جیپ اس سویر میں درہ شمشال میں داخل ہوئی تو روز ریڈ سٹی آف پیٹرا نے ایک سادہ اور کورے دھاگے کو گوڑھا گلابی کر دیا۔ گلاب رنگت

چٹانوں کی اس سادہ دھاگے کی پوروں اور گانٹھوں میں رچ گئی...... یوں پہلا دھاگہ رنگا گیا۔

روڈ کیمپ کے آگے دریائے شمشال کے اوپر چٹانوں میں جو راستہ ایک سیاہ فیتے کی طرح بل کھاتا کہیں آسمان ہوتا تھا اور کہیں کھائی میں گرتا تھا' اس پر رجب کے سہارے جب میں چڑھتا تھا تو میرے تن بدن میں خوف اور موت کا جو سلیٹی رنگ پھوٹتا تھا' اس میں ایک کورا دھاگا ڈوبا...... سفیدی سے سلیٹی رنگ میں ہوا...... یوں ایک اور دھاگا رنگا گیا۔

زیارت کی کوٹھڑیوں کے سامنے دریا کے پار ایک سیدھی اور ناممکن بلندی پر صدیوں پیشتر تعمیر کردہ پتھروں کی چار دیواری کے احاطے میں مرادوں کے جو جھنڈے لہراتے تھے' ان کا اثر بھی دھاگوں پر ہوا اور کیسے نہ ہوتا' وہاں کبھی شاہ شمس کا جو عصا تھا' چراغ تھا۔ اس کی برکت کے بغیر ان ویرانوں میں سے زندہ بچ نکلنا ممکن نہ تھا۔ ہر جھنڈے نے میرا ایک ایک دھاگا اپنے رنگ میں رنگا......

پھر میٹھے پانی کے تالاب کی جانب بڑھتے ہوئے ایک رام چکور نے پھڑ پھڑا کر مجھے چھوتے ہوئے اڈاری ماری اور شاید اسے ابھی ابھی سب سے بڑے مصور نے پینٹ کر کے اتارا تھا تو اس کے پروں کے رنگ ابھی گیلے تھے...... وہ بھی میرے دھاگوں پر نشان چھوڑ گئے۔

شکر جوئی کی ندیوں کے پانی نے میرے سُوت کو بھگو بھگو کر شانت کیا کہ ایک کھیس بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا سوت پانیوں میں ڈبو کر پہلے خوب نرم کیا جائے۔

چٹانوں کی عظیم تنہائی کے اندر پوشیدہ پل عبدل وہ طلسمی راستہ تھا جس پر سے صرف وہ شہزادہ گزر سکتا تھا جسے ایک بزرگ کی دعا کی برکت سے کوئی گزند نہ پہنچا سکتا تھا۔ اسے پار کرتے ہوئے بھی ایک دھاگے نے کوئی طلسمی رنگ حاصل کیا۔

پھر گرم چشمے کے پانیوں میں اور ملونگودی گلیشیر کی نیلی برفوں میں بھی یہ سفید دھاگے نیلو نیل ہوئے...... میں نیل کرائیاں نیلکاں تے میرا تن من نیلو نیل......

میں جو اس خوف کا اسیر تھا کہ اس بار میرا کھیس سادہ رہ جائے گا' رنگوں سے خالی رہ جائے گا۔ مجھے کچھ اطمینان سے ہوا کہ بات بن رہی ہے بلکہ بُن رہی ہے۔

اور پھر سرسوں کی زردی کا ایک ایسا جھماکا ہوا کہ میں اپنے دھاگوں کو بچاتا رہا کیونکہ ان سب پر زردی کا اثر ہو رہا تھا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میرے کھیس کے تمام رنگوں پر زردی غالب آ جائے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ جھیل کرومبر میں اتریں اور اپنے بدن کو اس کے نیلے پانیوں کی گیلاہٹ سے بچالیں۔ سنو لیک پر اپنے آپ کو سفیدی سے الگ رکھ سکیں۔

چنانچہ شمشال کے کھیس کے لیے جو دھاگے میں نے بچا رکھے تھے' ان پر...... اور جو رنگے جا چکے تھے' ان پر زردی نے اپنی اوڑھنی بچھا دی۔ کہیں درہ شمشال کی قربت میں چینی شہزادیوں کا بسیرا تھا اور وہ اپنے پیراہن پھیلاتی تھیں تو ان کی پیلاہٹ وادی کے کھیتوں پر اثر کرتی تھی اور پھر مجھ پر بھی اثر کرتی تھی اور میری پوروں کے راستے میرے بدن میں اترتی تھی تو یہ دھاگے کیسے اس کے اثر میں نہ آتے۔

پچھلے تین روز میں بھی بہت سے رنگ اترے اور ان دھاگوں میں جذب ہوئے۔

شمشال کی تنہائی اور مرگ کے رنگ...... کھیتوں میں جھکی عورتوں کی آنکھوں کی یاسیت اور دور افتادگی۔ لب پہ آتی ہے دعا...... قبرستان کی سِل کے نیچے ایک کھوپڑی' ٹوٹا ہوا رباب۔ یاکوں کی مورچھل دُمیں' رجب اور مجنون کی محبتیں...... درّہ شمشال جانے کی حسرت اور گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں شمشال کی شامیں......

میرے سب کے سب دھاگے رنگے گئے تھے۔

نہ میں نے ان کو کھڈّی پر چڑھایا اور نہ کوئی اور تردد کیا اور شمشال کا کھیس خود بخود وجود میں آتا چلا گیا۔

شمشال میں یہ میری آخری شام تھی۔

کھیس مکمل ہو چکا تھا' میرے قدموں میں بچھا ہوا تھا اور میں اس پر اپنے جوگرز رکھتے ہوئے جھجکتا تھا کہ کہیں اس کے رنگ خراب نہ ہو جائیں۔ اس لیے کہ میں نے اسے لپیٹ کر اپنی یادداشت کے نہاں خانوں میں سنبھالنا تھا اور واپس لے کر جانا تھا اور پھر ایک شب سفر شمشال کی تھکاوٹ اتارنے کے بعد اسے لاہور میں اپنی سٹڈی میں کھول کر بچھانا تھا اور اس کے رنگوں اور گل بوٹوں کو دیکھ کر اپنے سفر کا قصہ بیان کرنا تھا۔

اسی لیے میں اپنے قدموں میں بچھے اس کھیس پر دھیان سے جوگرز رکھتا تھا۔

سامان کی پیکنگ ہو چکی تھی۔

ہم نے سوچ رکھا تھا کہ ہمارے پاس جتنی خوراک بچ گئی ہے...... زائد سامان ہے' وہ ہم زیارت کی مسافر گاہ کی نذر کر دیں گے۔

"صاحب......" رجب ہولے سے بولا "صبح ساڑھے چھ بجے ٹریکٹر آ جائے گا اور آپ کو میرے گھر سے آگے اس مقام تک لے جائے گا جہاں سے چڑھائی کا آغاز ہوتا ہے۔"

قدرت کے پاس چینی گندم کے آخری گھونٹ تھے۔

سفر کی شام میں جو اداسی ہوتی ہے' وہی واپسی کی شام میں بھی اترتی ہے اور پھر ہر شے میں سرایت کر جاتی ہے۔ گیسٹ ہاؤس کے ٹمٹماتے بلب میں' میز میں' شکستہ پھاٹک میں اور تاریکی میں گم کھیتوں میں۔ رک سیکوں اور سلیپنگ بیگز میں' یہاں تک کہ جوگرز میں بھی رچ بس جاتی ہے اور تمہارا دل کوچ کے خیال سے بیٹھتا جاتا ہے۔

کہتے ہیں اس دنیا سے کوچ کرنے والا ہر شخص اپنے آخری سانس کے دوران یہی سوچتا ہے کہ میں تو ابھی آیا تھا اور ابھی چلنے کا حکم آ گیا...... ہمیں بھی یہی لگتا تھا کہ ہم تو شمشال میں ابھی آئے تھے اور ابھی روانگی کی تیاری ہے۔

برآمدے میں' کرسی سے ٹیک لگائے میں نے نیچے پھیلی وادیٔ شمشال کو دیکھنے کی کوشش کی...... کچھ نظر نہ آیا۔ کھیتوں میں چند ایک جو بلب تھے' بجھ چکے تھے اور گاؤں کے روشندان بھی تاریکی میں گم تھے۔ صرف سیاہ رات تھی۔

لیکن اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شمشال بے شک اپنے چہرے پر تاریک شب کا گھونگھٹ ڈال لے' پھر بھی میں اسے دیکھ سکتا تھا۔

کیونکہ میں نے شمشال کا کھیس مکمل کر لیا تھا اور وہ میرے پاؤں میں بچھا تھا۔

جیسے عمر خیام کی شاعری میں گئے زمانوں میں ایک مسافر نے کارواں سرائے کے پھاٹک پر رات گئے دستک دی تھی اور کہا تھا "دروازہ کھول دو...... آج کی شب بسر کر لینے دو...... ہم مسافر ہیں' کل کوچ کر جائیں گے۔"

ایسے ہم نے بھی شمشال کے دروازے پر دستک دی تھی۔

اس کے مکینوں نے اور منظروں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ ہم نے یہاں دو راتیں گزاری

تھیں اور آج تیسری شب تھی اور کل ہم نے بھی کوچ کر جانا تھا۔

ہم اس شب آخر میں تھے۔

اپنے جنوں کے قیدی تھے۔

کہ صرف جنوں تھا جو کسی کو وادیٔ شمشال تک لا سکتا تھا۔

ہاں' جنوں میں جتنی بھی گزری بہ کار گزری ہے۔

اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے۔

رات کے اس پہر ہمارے گیسٹ ہاؤس کے برآمدے میں شاید وادی کا آخری بلب روشن تھا۔

سرسوں کے رنگ اور گندم کی ہریاول اندھیرے میں کھو چکے تھے۔

ہم دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن گاؤں کے آخر میں دریائے شمشال کے کناروں پر ایک قدیم کھنڈر تھا جس میں ماضی کی یادگاریں تھیں اور ایک رباب تھا۔ جس کا صرف ایک تار باقی تھا۔ وہ ٹوٹا ہوا' صدیوں پرانا ساز' اگرچہ وہیں اس کالک زدہ قدیم گھر میں رہ جانا تھا لیکن آئندہ وقتوں میں کہیں بھی میں اس کے تار کو چھیڑ کر واپس شمشال پہنچ سکتا تھا۔

میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس وادی میں مہمان کے طور پر آیا ہوں۔

لیکن...... یہاں سے جانے کو میرا دل نہیں کرتا۔

ولیو سَر سے چاند نکلا ہوا ہے۔

اور وہ جیسے جنت میں سے اس وادی کے گلستاں کو دیکھ رہا ہے۔

میں جو اس گلستان میں پہنچا ہوا ہوں۔

اور پانی کی لہر کی طرح جھوم رہا ہوں۔

لیکن...... یہاں سے جانے کو میرا دل نہیں کرتا۔

میں نے اپنے جوگر زاٹھائے اور شمشال کے رانگلے کھیس کو لپیٹا اور پھر اسے بدن کے فرش پر بچھا دیا۔

اس کھیس نے اور رباب کے ایک تار نے میرے ساتھ جانا تھا۔

میں نے وادی میں روشن آخری بلب کو بجھایا اور کمرے میں چلا گیا۔

اگلی سویر کہیں نیچے دریائے شمشال کے کنارے ایک ٹریکٹر کی مہیب آواز نے منہ کھولا تو شفا کے دونوں خوابیدہ یاک چونکے اور ہراساں ہو کر کھڑے ہو گئے اور اپنی مورچھل دُمیں ہلاتے ہوئے خوفزدہ حالت میں اُدھر دیکھنے لگے' جدھر سے ایک خواب کے ٹوٹنے کی کرچیاں ان تک آتی تھیں اور ان کے گھنے بالوں کے اندر جا کر ان کے بدنوں کو چھیدتی تھیں۔

مسافروں نے کارواں سرائے شمشال میں سے اپنا سامان سمیٹا اور دریا کی طرف اترنے لگے......اور میرے سامان میں اور کچھ نہ تھا...... صرف شمشال کا ایک رانگلا کھیس تھا اور رباب کا ایک تار تھا۔